جہدِ مسلسل

(مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے
ان خطبات اور مضامین کا مجموعہ جو ملی تشخص وامتیاز کے موضوع پر لکھے گئے)

ناشر

مجلس استقبالیہ سترہواں اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

جامعہ رحمانی، خانقاہ مونگیر (بہار)

۱۴۲۳ھ ـــــــــ ۲۰۰۳ء

نام کتاب:............................ جہد مسلسل

مرتب:.............................. مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری

صفحات:............................ ۴۱۱

کمپوزنگ:.......................... حامد خوشنویس (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

تعداد اشاعت:........................ ایک ہزار

طباعت:............................ پاریکھ آفسیٹ پرنٹنگ پریس لکھنؤ۔ فون 789966

قیمت:..............................

فہرست عناوین

عرض ناشر

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سترہویں اجلاس کی مجلس استقبالیہ کو اس بات پر مسرت ہے کہ وہ اپنے شرکاء اجلاس اور مندوبین کی خدمت میں ایک مفید علمی تحفہ پیش کر رہی ہے، یہ علمی تحفہ مجموعۂ خطابات کی شکل میں ہے، یہ خطابات وہ ہیں جن میں مسلم پرسنل لاء یعنی اسلام کے عائلی قوانین کی اہمیت اور ضرورت کی وضاحت کی گئی ہے، اور اس ملک میں اس کے سلسلہ میں جو خطرات لاحق رہے ہیں اور ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے بورڈ کی طرف سے جو مفید علمی و تعارفی کام ہوا ہے اس کا ایک اہم اور مؤثر حصہ وہ ہے جو سابق صدر بورڈ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم و زبان کے ذریعہ سامنے آیا، یہ مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں اپنے اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے ہیں۔

حضرت والا کی ان تحریروں میں مسلم پرسنل لاء کی اہمیت، افادیت اور موجودہ دور میں اس کی ضرورت واضح ہوتی ہے اور تحفظ دین و شریعت کی تاریخ بھی سامنے آتی ہے۔ یہ اخبارات و رسائل پرانے ہو جانے کی بناء پر ہر جگہ اور آسانی سے دستیاب نہیں تھے چنانچہ پرسنل لاء کے سلسلہ میں دلچسپی رکھنے والوں کو ان سے استفادہ میں دشواری تھی۔

مجلس استقبالیہ کے سترہویں سالانہ اجلاس مسلم پرسنل لاء بورڈ کو روحانی مسرت ہے کہ وہ مرد دانا کے قیمتی مضامین کو اہتمام کے ساتھ یکجا شائع کر رہی ہے اور اس اجلاس کے موقعہ پر ارکان محترم (بورڈ) کی خدمت میں یادگار علمی تحفہ کے طور پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ اس یادگار علمی اور فکری تحفہ کے ساتھ مجلس استقبالیہ کے معزز ارکان کی خدمت میں درج ذیل علمی تحفے بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔

۱-اسلامی قانون (متعلق مسلم پرسنل لاء) — تازہ ایڈیشن
۲-حضرت امیر شریعت--نقوش وتاثرات — "
۳-مسلم پرسنل لاء--زندگی کی شاہراہ — "
۴-خطبات امیر شریعت — "
۵-نقوش تاباں — "

(حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کے مقالات اور تحریری خطبات کا مجموعہ)

ہمیں افسوس ہے کہ اس موقعہ پر بورڈ کے پہلے صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کا مجموعہ شائع نہیں کر سکے۔ کاوش کے باوجود وہ چیزیں دستیاب نہیں ہوسکیں۔

زیر نظر مجموعہ مضامین کی اشاعت کے لئے ہم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت و جنرل سکریٹری (بورڈ) اور حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب، سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر کے شکر گزار ہیں کہ جن کی توجہات سے اس مجموعہ کی جمع وترتیب ممکن ہوسکی۔ ندوۃ العلماء کے استاد مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے ترتیب کا کام انجام دیا اور مجموعہ کے لئے بورڈ کے موجودہ صدر نے ایک مفید مقدمہ بھی تحریر فرمایا۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں جناب شاہد حسین صاحب (معتمد خادم حضرت مولانا علی میاںؒ) کا شکریہ نہ ادا کیا جائے تو ناسپاسی ہوگی۔ انھوں نے چار دنوں میں طباعت وتجلید کے تمام مراحل پورے کرائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسے قبول فرمائے اور قارئین کے لئے اسے مفید اور نافع بنائے۔

احمد اشفاق کریم
صدر مجلس استقبالیہ
ستر ہواں اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

۲۴ر فروری ۲۰۰۳ء
مونگیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

پیش نظر کتاب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس عام کے موقع پر بحیثیت صدر کے دیئے، اس کے ساتھ ان مضامین کو شامل کر لیا گیا ہے جو اسی موضوع پر ان کے قلم سے نکلے، ایک مستقل مضمون بھی ہے جس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ صدارت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرگرمیوں اور خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، اصل خطبات سے قبل امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی، اور خود حضرت مولاناؒ کی تحریوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں، تاکہ ہندوستان میں ملی تشخص وامتیاز کے بقا کی اہمیت واضح ہو جائے کہ ع

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی

یہ کام دشوار تھا، لیکن عزیزی مولوی سلمان نسیم ندوی ریسرچ اسکالر شعبۂ تدریب علمی کی مدد اور تعاون سے انجام پاسکا، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

۲۱ر ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ
۲۳ر فروری ۲۰۰۳ء

نذر الحفیظ ندوی
مدیر المعہد العالی للدعوۃ والفکر الاسلامی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

از: ـــــــــــــ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

الحمدللہ الذی کفی، وسلام علی رسولہ محمد المصطفی، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین.

ہندوستان میں آزادی کے بعد مسلمانوں کی امت ملک کی ایک بہت بڑی اقلیت کی صورت میں ابھری ہے، اس کے افراد کی آبادی کا تناسب ملک کی آبادی کا ۲۰ رفیصد تک کا بتایا جاتا ہے، لیکن یہ ۲۰ رفیصد تعداد کے لحاظ سے ملک کی ایک ارب کی آبادی میں ۲۰ رکروڑ ہوتے ہیں، یہ تعداد ایسی تعداد ہے کہ سوائے انڈونیشیا کے تمام دیگر مسلم اکثریت کے ملکوں کی مسلم آبادی سے زیادہ ہے۔

مسئلہ صرف تعداد میں بڑائی کا نہیں ہے، بلکہ مسلمان اس ملک میں علمی ودینی وثقافتی لحاظ سے خود کفیل بھی ہیں، تعلیم دینی ہو یا عصری، اس کے لئے ان کے نونہالوں کو ملک سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی ملک میں اور خود اپنی ملت کے اختیار کردہ ذرائع سے وہ اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں، اور جہاں تک شریعت

اور شخصی زندگی کے قوانین کا معاملہ ہے تو ان میں بھی وہ دوسری ملتوں اور قوموں سے کچھ لینے کے محتاج نہیں، ان کو رب العالمین کی طرف سے واضح اور متعین ہدایات دی گئی ہیں، جن پر ان کے لئے عمل کرنا لازمی ہے، چنانچہ وہ اپنی شریعت کے احکام کے کسی حصہ سے دست بردار نہیں ہو سکتے اور نہ کسی دوسری ملت یا جماعت کی خاطر ان احکام کا کوئی متبادل اختیار کر سکتے ہیں، ان کی شریعت کے احکام انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں، یہ وحیِ الٰہی کے ذریعہ ان تک پہنچے ہیں، ان کو کسی انسان نے مقرر نہیں کیا ہے کہ کسی دوسرے انسان کو خواہ کتنا ہی عقل مند ہو ان کو بدلنے کا حق دیا جا سکتا ہو، صرف معقول دلائل کی مدد سے اُن قوانین کی وضاحت وتشریح میں کچھ فرق ہو سکتا ہے، اور وہ اسلام کے کئی فقہی مسلکوں کے دائرے میں ہوا بھی ہے، لیکن کوئی دوسری امت و مذہب ان کو اپنے مذہبی یا اپنی ثقافتی اقدار کے ماتحت کرنا چاہے تو اس کو ایک غیر منصفانہ اور غلط فعل سمجھ کر مسترد کر دیا جائے گا، کیوں کہ اس میں آسمان سے بھیجی گئی شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو زمین تک محدود رہنے والے فرد کے دائرۂ کار میں نہیں آتی۔

ہندوستان کی آبادی صرف ایک یا دو مذہبوں کی آبادی نہیں ہے، یہاں ہندو اکثریت میں ہیں لیکن اس کے ساتھ متعدد غیر ہندو اقلیتیں بھی ہیں جو اپنا مخصوص مذہب اور خصوصیات رکھتی ہیں، ان میں مسلمان اقلیت بڑی اقلیت اور اپنا مکمل نظامِ حیات رکھنے والی ملت ہے، ملک کی آزادی کے وقت ملک کے اندر مذہب وزبان وثقافت کے تنوع کو دیکھتے ہوئے ہی یہاں کا دستور بنانے والوں نے ملک کے لئے کسی ایک مخصوص مذہب کی رعایت میں قوانین طے نہیں کئے بلکہ مذہب کے معاملات کو خود انہیں کے ذمہ داروں پر چھوڑ دیا اور ان کو مذہب کے معاملہ میں خود اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرنے کا اختیار دے دیا، لیکن دستورِ ہند میں یہ

اشارہ بھی دیا گیا کہ ملک کے سماجی قوانین میں اگر وحدت پیدا کی جاسکے تو اچھا ہے۔

آزادی کے کچھ عرصہ بعد اس اشارہ سے اکثریتی مذہب والوں کے بعض حلقوں نے اپنے مذہب کی بالا دستی کے لئے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور مسلمان اقلیت چونکہ ملک کی بڑی اقلیت ہے اور اس کے سماجی اور عقائدی قوانین متعین اور مکمل ہیں اس لئے اس مذہبی بالا دستی کی زد سب سے زیادہ ان پر پڑتی تھی، لہذا ملتِ اسلامیہ کے غیرت منداور بہی خواہ علماء ودانشور حضرات نے اس رجحان کی مخالفت کی اور اکثریتی حلقوں کی طرف سے بات آنے کی وجہ سے خطرہ زیادہ محسوس کیا گیا، جس کے لئے منظم کوشش کی ضرورت سامنے آئی، لہذا ۱۹۷۲ء کے آخر میں ممبئی میں ایک زبردست کانفرنس اس موضوع پر ہوئی جس میں اس رجحان سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا باقاعدہ مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کے کل جماعتی بورڈ کی تشکیل کی گئی، جس کے صدر ہندوستان کی عظیم مذہبی درسگاہ دارالعلوم دیو بند کے سربراہ حضرت مولانا محمد قاری طیب صاحب قاسمیؒ، اور جنرل سکریٹری بہار واڑیسہ کے امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ منتخب ہوئے، اور بورڈ نے ملک گیر سطح پر جلسے کر کے اکثریتی حلقوں کی طرف سے آنے والے اس رجحان کی مضرت اور ناانصافی کی وضاحت کی جس سے مسلمانوں کی زبردست رائے عامہ بنی، جس کی اہمیت اور طاقت کو حکومت اور عوام دونوں کے حلقوں میں محسوس کیا گیا۔

بورڈ کی تشکیل کے دس سال بعد جولائی ۱۹۸۳ء میں اس کے صدر مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے وفات پائی، ان کی جگہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا انتخاب ہوا، جو ان کی بھی وفات تک برابر قائم رہا، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ایک بڑے عالمِ دین ہونے کے ساتھ اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے سامنے موثر علمی انداز میں اپنی بات رکھنے

کی ممتاز صلاحیت رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے علمی انداز میں شریعت اسلامی کی ناقابل ترمیم خصوصیت اور خداوندی حکم سے مقرر ہونے کی بنا پر اس کی ناقابلِ تنسیخ حیثیت کو بیان کیا اور ملک کے دستور کے حوالہ سے اس کے اپنی ملت کے ساتھ مخصوص ہونے کو طاقت ور اسلوب و زبان میں ظاہر کیا، مولانا کو اس ذمہ داری کی انجام دہی میں ۱۹۸۳ء کے وسط سے ۱۹۹۹ء کے آخر تک ۱۶ ر سال ملے۔ مولانا کے صدر ہونے کے صرف دو سال بعد مسئلہ نے ایک نیا رُخ یہ لیا کہ ہندو حلقوں کی طرف سے یکساں سول کوڈ کے مطالبہ کو ملک کی عدالت علیا سپریم کورٹ نے مسلمان مطلقہ کے سلسلہ میں اپنے ایک فیصلہ کے ذریعہ تقویت پہنچادی، جس سے مسلمانوں کا اپنی شریعت کے ناقابل ترمیم ہونے کا حق ساقط ہو رہا تھا، چنانچہ بورڈ کی اعلی قیادت کی سرکردگی میں مدبرانہ طریقہ سے شریعت اسلامی کے ناقابل ترمیم و تنسیخ ہونے کی مہم مسلم رائے عامہ کے تعاون سے دستورِ ہند کے حدود میں رہتے ہوئے طاقتور اور متحدہ طریقہ سے چلی اس مہم کی مخالفت اکثریتی حلقوں کی طرف سے اور پریس اور میڈیا کی طرف سے، بہت سخت طریقہ سے کی گئی، اور بہت کوشش کی گئی کہ اسلامی شریعت کے تحفظ کے حق کو ہرگز تسلیم نہ کیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوا، اور الحمد للہ ایک سال کی کوششوں سے یعنی ۱۹۸۶ء میں بورڈ کی قیادت حکومتِ وقت کو سمجھانے میں کامیاب ہوگئی اور اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جن کی پارٹی انڈین کانگریس کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل تھی جس کی بنا پر اس کو قوانین میں ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل تھا، بورڈ کے ذمہ داروں کے سمجھانے اور بتانے سے مسلمانوں کے مطالبہ کے برحق ہونے کے قائل ہوگئے اور انھوں نے پارلیمنٹ میں ترمیمی بل پیش کیا، اور اپنی پارٹی کو تائید کی سخت ہدایت کی، چنانچہ وہ بل پاس کرالیا، جس کی رو سے سپریم کورٹ کی وہ دلیل ختم ہوگئی جس کی بنا پر اس نے

مطلقہ کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔

بورڈ کی یہ زبردست کامیابی تھی کہ اقلیت اپنے حق کے تحفظ کے لئے اکثریتی فرقہ کی مخالفت کے باوجود قانون پاس کرالے، اس میں صدرِ بورڈ اور سکریٹری جنرل کی مدبرانہ اور مدلل گفتگوؤں نے بنیادی کام انجام دیا، بورڈ کی اس کامیابی سے بورڈ کا وزن بھی بہت بڑھا اور اس کی آواز کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، لیکن مسئلہ برابر توجہ کا طالب رہا کہ کوئی نئی بات ایسی پیش نہ آئے جس سے بورڈ کے اس اعلیٰ موقف کو نقصان پہنچے، نیز اس بات کی بھی ضرورت قائم رہی کہ مسلمان رائے عامہ نیز دانشوروں کا ذہن بھی بورڈ کے موقف کو زیادہ سے زیادہ تسلیم کرے، اس کے لئے بورڈ کے صدر و سکریٹری نے اپنی علمی کاوشیں جاری رکھیں، خاص طور پر صدرِ بورڈ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جو مؤثر اسلوب تحریر و اندازِ کلام رکھتے تھے ذہنوں پر اثر ڈالنے کا بہت قابلِ قدر کام کیا، ان کے صدارتی خطبے اور انٹرویوز و تحریریں برابر اخبارات میں آتی رہیں۔

آج حضرت مولاناؒ ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی تقریریں اور خطبات کاغذ کے صفحات پر موجود ہیں، ضرورت تھی کہ ان کو یکجا کر کے بورڈ کے کام و پیغام کو سمجھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے شائع کردیا جائے، اس سے انشاء اللہ بورڈ کے مقصد کو بھی فائدہ پہنچے گا اور بورڈ کے کام کی اہمیت کو سمجھنا بھی آسان ہوگا۔ محترم مولانا ولی رحمانی صاحب نے جو بورڈ کے سکریٹریوں میں ہیں اور بورڈ کے ۱۷ویں اجلاس کے استقبالیہ کے ذمہ دار بھی ہیں اس ضرورت کو ظاہر کیا کہ یہ مجموعہ تیار کیا جائے، بلکہ مزید یہ کہ ان کے زیر سرکردگی استقبالیہ کے طرف سے بورڈ کے اس اجلاس کے موقع پر بطور تحفہ پیش بھی کیا جائے۔

ہم مولانا نذرالحفیظ صاحب ندوی ازہری استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے

شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس تجویز کو جاننے پر محنت وتوجہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے خطبات وکلمات کو اخبارات وغیرہ میں تلاش کر کے جمع کیا، اور اس طرح مرتب کر دیا کہ ایک بہت موزوں اور مفید کتاب بن گئی جس سے تا دیر لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے، ہم مولانا ولی رحمانی صاحب کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے بہت اچھی تجویز پیش کی اور اس کام کے انجام دیئے جانے کا باعث بنے اور مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس کام کو خوبی کے ساتھ انجام دیا، اللہ تعالیٰ دونوں کو بہترین جزائے خیر دے۔

محمد رابع حسنی ندوی	۱۴۲۳/۱۲/۲۱ھ
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ	۲۰۰۳/۲/۲۳ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

کے عہدِ صدارت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرگرمیوں کا ایک جائزہ

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام اور اس کا پس منظر

مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر، فقہ اسلامی کے ممتاز عالم، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب مسلم پرسنل لا بورڈ کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور اپنے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو قانون ہمیں عطا فرمایا ہے، اس کے مختلف شعبے ہیں، ان میں سے ایک شعبہ اس قانون کا ہے جو انسانی سماج اور معاشرہ سے متعلق ہے، جس پر خاندانی نظام کی بنیاد و اساس ہے، جو سماجی تعلقات کے اصول بتاتا ہے،

جس میں خاندان کے مختلف افراد کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کو متعین کیا گیا ہے، ان ہی قوانین کو آج عرب علماء" قوانینِ احوال شخصیۃ" یا اردو میں "عائلی قانون" اور انگریزی میں "پرسنل لا" یا "فیملی لا" (FAMILY LAW) کہتے ہیں۔"

ہندوستان میں صدیوں مسلمانوں کی حکوت رہی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود، زندگی کے بہت سے شعبوں میں اسلامی قانون نافذ تھا اور مسلم پرسنل لا محفوظ تھا، جب انگریز اس ملک پر مسلط ہوئے تو آہستہ آہستہ قانونِ اسلامی کے مختلف شعبوں کو ختم کردینے کی پالیسی وضع کی، اور اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔

سب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں حکومتِ برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کیا، پھر قانون شہادت اور قانون معاہدات منسوخ کئے گئے، بالآخر نوبت "معاشرتی قوانین" (جس میں نکاح وطلاق، خلع، میراث وغیرہ داخل ہیں) کے بارے میں غور کرنے کی باری آئی، کہ کیا ان قوانین میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے؟ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ نے "رائل کمیشن" ROYAL COMMISSION مقرر کیا، اور غالبًا چار بار یہ کمیشن بیٹھا، لیکن ہر بار وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ان قوانین کا مذہب سے گہرا تعلق ہے، اس لئے ان قوانین میں کوئی تبدیلی براہِ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، چنانچہ انگریز ایسا کوئی قدم اٹھانے سے باز رہے اور انھوں نے طے کیا کہ ان مسائل میں مسلمان "قانونِ شریعت" پر اور ہندو "دھرم شاستر" پر عمل کریں گے، لیکن ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ عدالت میں ایک مسلمان لڑکی نے اپنے والد کے ترکہ میں میراث کے لئے مقدمہ دائر کیا، ظاہر ہے کہ شریعت اسلامی کے نقطۂ نظر سے بیٹی لازمی طور پر اپنے باپ کے متروکہ میں وارث ہوتی ہے، بھائی نے اس مقدمہ میں جواب دیا کہ چونکہ میں نسلی

طور پر فلاں ہندو قوم سے تعلق رکھتا ہوں اور ہندوؤں کے یہاں لڑکیوں کو باپ کے ترکے میں حصہ نہیں ملتا، یہی رواج ہمارے خاندان میں چلا آ رہا ہے، اس لئے مجھ پر قانونِ شریعت کا نفاذ نہیں ہونا چاہئے، برطانوی قانون میں رواج کی بڑی اہمیت ہے، کیوں کہ یورپ کے اکثر ملکوں کے قانون ''رومن لا'' (ROMAN LAW) سے ماخوذ ہے، اور (ROMAN LAW) میں رواج کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور اسے قانون کا اہم ترین سرچشمہ تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ عدالت نے رواج کو اصل مانتے ہوئے بھائی کے حق میں فیصلہ دیا اور لڑکی کو اپنے باپ کے ترکہ سے محروم رکھا، جو قطعاً قرآنی طریقہ کے خلاف تھا۔

ظاہر ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ عورتوں کے ساتھ نہایت ظلم کی بات ہے کہ محض عورت ہونے کی بنا پر اسے میراث سے محروم کر دیا جائے، یہ وہ وقت تھا کہ علماء چیخ پڑے اور پورے ہندوستان میں آواز اٹھائی گئی، ہمارے اکابر علماء نے بڑی زبردست جد جہد کے بعد شریعت اپلیکیشن ایکٹ پاس کرایا، اور ہمارے اکابر، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد رحمہ اللہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ العلماء ہند اور دیگر علماء و مشائخ کی مسلسل اور متحدہ کوششوں سے ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلیکیشن ایکٹ'' بنا۔

شریعت اپلیکیشن ایکٹ میں یہ صراحت کی گئی کہ نکاح وطلاق، فسخ و وراثت، وصیت، ہبہ اور وقف وغیرہ سے متعلق معاملات میں اگر فریقین مسلمان ہوں تو لازمی طور پر وہ مسلم پرسنل لا کے تابع ہوں گے اور ایسے تمام رسم و رواج باطل قرار دیئے جائیں گے جو شریعت محمدیہ سے ٹکراتے ہوں۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد بنیادی حقوق میں ''عقیدہ وضمیر کی

آزادی'' اور ہر مذہب والوں کے لئے اپنے مذہب پر عمل کی آزادی کی دفعات رکھی گئیں، ایک طرف یہ دفعات مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی ضمانت دیتی تھی، لیکن دوسری طرف خوف و ہراس کے مہیب سائے دراز ہونے لگے تھے اور گھنگھور گھٹائیں چھانے لگی تھیں، تقسیم کے بعد اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر تو دور کی بات ہے، مسلمانوں کو اسی وقت ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہ ملک ان کی اسلامی شناخت چھین لینے کے درپے ہے، ہم اس مایوسی اور خوف و ہراس کی ایک جھلک مولانا آزادؒ کی خطابت میں دیکھ سکتے ہیں جس نے ان کو اپنی اور اپنے تشخصات کے دفاع کے لئے اپنے گرد حصار قائم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔''

(ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی فرقہ وارانہ مخالفت کنونشن نمبر ص ۴۵)

مسلمانوں کا یہ خوف و ہراس بے جا نہ تھا، بلکہ اس کے آثار و علامات اور دواعی و محرکات موجود تھے، ایک طرف دستور ہند کے کے رہنما اصول دفعہ نمبر (۴۴) ''یکساں سول کوڈ'' سے متعلق رکھ دی گئی، جس میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ:

''ریاستیں کوشش کریں گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ ہو۔''

دستور ساز اسمبلی کے مسلم نمائندوں نے دستور بننے کے وقت بھی اس پر

اعتراض کیا تھا لیکن بہر حال دستور کی یہ شق باقی رہی اور اس طرح مسلم پرسنل لا کے خاتمہ کا بیج بو دیا گیا۔

دوسری طرف ہندوستان کے مستقبل کی سیاسی پالیسی کس طرح طے کی جارہی تھی اس کا اندازہ ہم پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس کے ان ارشادات سے لگا سکتے ہیں جو انھوں نے اجلاس لکھنؤ میں بحیثیت صدر کانگریس فرمایا تھا:

> ''ہم کو ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالنی ہوگی جو موجودہ سرمایہ دارانہ تمدن سے بالکل مختلف ہوگا، اس کے کچھ مناظر ہم کو روس کی حکومت کی روایات میں نظر آتے ہیں، ایک نئے تمدن اور ایک دلکش آغاز کو میں اس اندوہناک زمانہ میں مستقبل کے لئے ایک مبارک فال سمجھتا ہوں، مستقبل کے متعلق اگر امیدیں قائم کی جاسکتی ہیں تو یہ صرف روس ہی کی بدولت ہے، سوشلزم میرے لئے ایک اقتصادی نظریہ ہی نہیں جس کو میں پسند کرتا ہوں، بلکہ یہ میرا پختہ ایمان اور عقیدہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ کانگریس ایک سوشلسٹ آواز بن جاوے، اور دنیا کی ان قوتوں سے اتحاد عمل کرے جو نئے تمدن کو قائم کرنے میں کوشاں ہیں۔''

۱۹۵۶ء میں جب ہندو لا میں ترمیم کی گئی اور ہندو کوڈ بل پاس ہوا تو اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹسکر نے کہا تھا کہ:

> ''ہندو قوانین میں جو اصلاحات کی جارہی ہیں وہ مستقبل قریب میں ہندوستان کی تمام آبادی پر نافذ کی جائیں گی۔''

۱۹۷۲ء میں متبنیٰ بل پیش ہوا جس کا مقصد بلا تفریق مذہب ملک کی تمام قوموں کے لئے متبنیٰ کو اپنی اولاد کا درجہ دینا قرار پایا اور ان کو لے پالک لینے والے

مرد وعورت کے ترکہ میں وارث قرار دیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ قانون نہ صرف اسلام کے خلاف تھا بلکہ عقل وخرد کے بھی خلاف تھا، کیوں کہ والدین اور اولاد کا رشتہ ایسا نہیں کہ صرف زبان سے وجود میں آجاتا ہو، یہ ایک فطری رشتہ ہے، اور فطری محبت جو والدین اور اولاد میں ہوا کرتی ہے، اس مصنوعی رشتہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوسکتی۔

حکومت کا رجحان اور خود مسلمانوں کے تجدد پسند اور آزاد خیال طبقہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقہ کا ایک مشترک عائلی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) ہونا چاہئے اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی پیدا نہیں ہوسکتی، اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کو کن نازک حالات کا سامنا تھا اس کی تصویر ایک مبصر کے قلم سے ملاحظہ ہو:-

''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ اس چوطرفہ جد وجہد کا اثر مسلمانوں پر بالخصوص ان کی نئی نسل پر پڑ رہا ہے، شکوک وشبہات بلکہ ان مطالبات (یکساں سول کوڈ) سے ہم آہنگی کے جراثیم نے اپنا حلقہ وسیع کرلیا ہے، ایسے نوجوان اس لَے میں لَے ملانے کے لئے نکل آئے، جن کے گھرانوں کو دیکھتے ہوئے ہی نہیں خود...... ان کی ذات کو دیکھتے ہوئے بھی ان کی یہ روش ایک بڑی تشویش دل ودماغ پر مسلط کرتی ہے، مسلم پرسنل لا کے مجموعۂ قوانین کے خلاف ہی نہیں بلکہ اسلام کے عائلی تصورات کے بھی خلاف پروپگنڈہ کی جو شاطرانہ ڈھول اڑائی جارہی ہے، اور اپنے بنیادی موقف کی معقولیت کے لئے جو مغالطہ آمیز اور طنز آلود منطق کام میں لائی جارہی ہے اس کی مثالیں ان نوجوانوں میں سامنے آنے لگی ہیں، انتہائی بے باکی کے ساتھ وہ انھیں لوگوں کی

زبان میں بول رہے ہیں جو اس وقت مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں اور انھیں کی منطق کو لے کر بحث ومباحثہ کے میدان میں اتر رہے ہیں، ایک اخبار میں شائع ہونے والے مراسلہ کے چند ٹکڑے آپ بھی پڑھئے جس کے لکھنے والے سے ہم ذاتی طور پر واقف ہیں:

(۱) ''طلاق کے معاملہ میں مرد کو حقوق ملے ہوئے ہیں اور عورت بے بس، کیا کوئی حکومت اگر اس پر قدغن کرتی ہے تو وہ مداخلت فی الدین کر رہی ہے؟''

(۲) ''مختصر تنخواہ پانے والے کلرک صاحب اگر شادی کا مکمل کوٹا پورا کر لیتے ہیں تو بیویوں کے ساتھ فاقہ میں تو مساوات برت سکتے ہیں مگر اور کسی طرح کا انصاف نہیں .... پھر اگر کوئی گورنمنٹ اس پر پکڑ دھکڑ کر رہی ہے تو کیا زیادتی کر رہی ہے؟''۔

(۳) ''مسلمانوں کے فوجداری قوانین کے نفاذ کرانے پر زور کیوں نہیں؟ مولانا لوگ کیوں نہیں کہتے کہ مسلمان چور کا ہاتھ کاٹا جائے یا اس سے بڑے قصوروار کو سنگسار کیا جائے؟ خالی انھیں قوانین پر زور کیوں ہے کہ طلاق دینے کی آسانی رہے، چار شادی کی اجازت رہے۔''

پروپگنڈہ کی شدت اور مغالطوں کی کثرت معاملہ کو ایسا گمراہ کن رخ دینے میں کامیاب ہوگئی ہے کہ جن لوگوں کے متعلق یہ خیال کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ اپنے دین میں کسی بیرونی مداخلت

کو گوارہ کریں گے، وہ مداخلت کے حامی بن کر سامنے آر ہے ہیں، وہ اپنے علماء ہی کو نہیں دین تک کو طنز وتعریض کا نشانہ بنا رہے ہیں، وہ اس کے نکاح وطلاق کے مسائل کو اپنے زمانہ کے لئے نامناسب قرار دیتے ہوئے ہر اس طاقت کے لئے احسان مندی ظاہر کرنے کو تیار ہیں جو اس کی ''اصلاح'' کا بیڑا اٹھائے، یہ وہ مان بیٹھے ہیں کہ علماء اور دوسرے راسخ العقیدہ مسلمان جو اس ''تحریکِ اصلاح'' کی مخالفت کررہے ہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ انھیں عورتوں کے حقوق کی کوئی پرواہ نہیں اور اس کے برعکس چار شادیوں کی اجازت بلا کسی قید وبند کے برقرار رہنے سے بڑی دلچسپی ہے، حالانکہ کوئی ذمہ دار عالم اور کوئی سمجھ دار مومن یہ کہنے والا نہیں ملے گا کہ طلاق کی اجازت کا اگر غلط استعمال ہورہا ہے تو اس کے انسداد کی تدبیر نہ کی جائے، بیویوں کے جو حقوق اللہ اور اللہ کے رسول نے قائم فرمائے ہیں، ان کے تحفظ کی فکر نہ کی جائے، اور دین کی اجازتوں سے فائدہ اٹھانے والوں کو ان اجازتوں کی ذمہ داریوں کے معاملہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے، علماء اور دوسرے راسخ العقیدہ اور معاملہ فہم مسلمانوں کو جو اس وقت کی ''تحریک اصلاح'' سے اختلاف ہے یا وہ جو اس کی ہمنوائی نہیں کرسکتے، اس کی بنیاد بالکل دوسری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس تحریک کے سربراہ اور سرگرم کارکن یا تو دین وشریعت کے کھلے دشمن ہیں یا کم از کم اس نظریہ کے لوگ ہیں کہ نکاح وطلاق اور وراثت ووصیت کو دین ومذہب سے کوئی تعلق نہیں''

ان پُرخطر حالات میں ملت کے ارباب فضل وکمال اور عمائدین نے مستقبل میں آنے والے بڑے خطرے اور اس کی نزاکتوں کو محسوس کیا اور ملک کے علماء ودانشور حضرات سر جوڑ کر بیٹھے، اور ۲۷، ۲۸ ردسمبر ۱۹۷۲ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک عمل میں آئی اور ایک بار پھر یہ ثابت ہوگیا کہ اسلام پر بارہا حملے ہوئے لیکن اسلام نے ان پر فتح پائی۔

بورڈ کی دواہم ذمہ داریاں

مسلم پرسنل لا برڈ نے دواہم ذمہ داریاں قبول کیں، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے موثر تدابیر اختیار کرنا اور اس کوشش کا مقابلہ کرنا جو شریعت میں مداخلت کے لئے براہ راست، یا بالواسطہ یا متوازی قانون سازی کے ذریعہ کی جارہی ہو۔ دوسرے مسلمانوں کو شرعی احکام، قوانین اسلامی وآداب اور حقوق وفرائض سے واقف کرانا، اسلام کے عائلی قوانین کے نفاذ کی ہمہ گیر جدوجہد، فقہ اسلامی کے تحقیقی مطالعہ کا اہتمام اور شریعت اسلامیہ کے اصولپر قائم رہتے ہوئے کتاب وسنت کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا، مسلمانوں کے مختلف فقہی مسالک اور فرقوں کے مابین باہمیاشتراک وتعاون اور روابط واتحاد کو پروان چڑھانا۔

بورڈ کا یہ کارواں اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتے ہوئے اتحاد ویکجہتی، قربت والفت کی فضا میں سفر کرتا رہا، خطرات وامکانات، اندیشوں اور امیدوں کی وادی میں یہ بیدار مغز و بیدار ضمیر کارواں، سبک خرام اور رواں دواں تھا کہ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے رحلت فرمائی اور ان کی گیارہ سالہ فعال قیادت نے اپنی بساط لپیٹ لی۔

۲۷، ۲۸ ردسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں بورڈ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس کے موقع پر بالاتفاق حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بورڈ کے صدر منتخب

ہوئے، بہتر ہے کہ اس انتخاب کی روداد خود اس مرد مجاہد کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لئے پیش کیا گیا، جو لوگ میری طبیعت سے واقف ہیں، انھوں نے یہ کہا کہ وہ صرف اس صورت میں منظور کر سکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے، مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا، جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو ''سنگ آمد وسخت آمد'' کا مضمون تھا، یہ فیصلہ میری افتادِ طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں کھاتا تھا، اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعث افتخار واعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کر دیتا، لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت واہمیت کی وجہ سے (جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزء اور مسلمانوں کی ملی زندگی کے لئے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں) دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کے بنا پر (جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں) چار وناچار قبول کرنا پڑا، دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا، کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

ملی غیرت اور اسلامی حمیت کی چند جھلکیاں

اسلام کی خاطر دل سوزی اور آشفتہ سری کے چند نمونے

ایک طرف اگر بورڈ کے اغراض ومقاصد پر نگاہ ڈالئے اور دوسری طرف حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے انتخاب پر غور کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت ان کا انتخاب بورڈ کی خوش قسمتی اور مسلمانان ہند کے لئے ایک نعمت تھی، قبل اس کے کہ ہم حضرت مولاناؒ کے عہد صدارت میں بورڈ کی سرگرمیوں کا ایک جائزہ لیں ہم آپ کی توجہ ایک روشن حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت مولانا علیہ الرحمۃ "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے باقاعدہ صدر اگرچہ ۱۹۸۳ء میں بنے اور عہد صدارت میں بارہا ملی شعور اور اسلامی غیرت وحمیت کے مظاہرے کی ضرورت پیش آئی، لیکن ان کی پوری زندگی، ان کا پیغام، ان کی تمام کوششیں، انہی دونوں ذمہ داریوں اور دونوں عظیم مقصدوں کی تحقیق وتکمیل، اسلامی شریعت وقانون کے غلبہ واستیلاء، اسلامی تشخص کے بقاء وتحفظ کی عالمی پیمانہ پر کوشش اور اس کے لئے دعوت وترغیب اور قرن اول کی طرف بازگشت کی عملی کوششوں کی سچی تصویر ہے۔

اس مرد حر کا کارواں، زندگی کی جن پر پیچ اور سنگلاخ راہوں سے گذرا اگر انہیں راہوں پر پیچھے پلٹ کر نقوش پا تلاش کریں تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے جب شعور کا دامن تھاما تو ہندوستان ایک کوہ آتش فشاں بنا ہوا تھا، مسلمانوں کا نمائندہ وترجمان خلافت "خلافتِ عثمانیہ" کے تحفظ کی خاطر "تحریک خلافت" کی بازگشت پورے ملک میں سنائی پڑ رہی تھی۔ مولانا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، وہ لکھتے ہیں:۔

"ہمارا خاندان بھی تحریک خلافت کا بالکل ہمنوا تھا، اور یہ

بات خاندانی روایات، اسلامی حمیت، اور خاندان کی تاریخ جہاد و
غزوات کے عین مطابق تھی۔"

ایک قدم اور آگے بڑھایئے ابھی مولانا نے عمر کی صرف ۲۱ بہاریں دیکھی ہیں، ہندوستان میں امت اسلامیہ کو ایک عظیم مہم درپیش ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر جیسی پر شکوہ شخصیت کو صحیح مذہب کی تلاش ہے، ہندوستان کے مختلف مذاہب، عیسائیت، بدھ مت، اور اسلام کے پیرو اپنے اپنے حوصلہ اور نقطۂ نظر کے مطابق اس "ھما" کو شکار کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس عظیم اور نازک کام کے لئے نظر انتخاب مولانا پر پڑتی ہے، لوگوں کو اس انتخاب پر تعجب ہوتا ہے وہ خود لکھتے ہیں:۔

"میں جب کسی سے اس مہم کا ذکر کرتا تو اس کو ہنسی آجاتی اور
مجھ کو سر سے پاؤں تک دیکھتا کہ: ع
اس حوصلہ کو دیکھئے اور ان کو دیکھئے"

وہ نحیف ولاغر، بن وسال کے لحاظ سے نوعمر، مگر روح اسلام سے سرشار، اسلام کی آگہی اور عمل کی بجا آوری کے لحاظ سے کہنہ مشق چل پڑتا ہے اور امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دیتا ہے نتیجہ اگرچہ "انك لا تهدی من أحببت ولكن الله يهدی من يشاء" کی تفسیر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مگر جن الفاظ میں انھوں نے دعوت دی وہ اسلام کی حقانیت، اس کی عظیم صلاحیت اور زمانے کے تغیرات کے سامنے عدم مصالحت پر مولانا کے غیر متبدل یقین کی سچی تصویر ہے، اپنے برادر بزرگوار کو لکھتے ہیں:

"میں نے کتابیں دیں اور کہا کہ میں لکھنؤ سے خاص آپ
سے ملنے آیا ہوں، اور جو کچھ اس وقت سمجھ میں آیا، میں نے کہا کہ
یہ تاریخ میں پہلا موقع ہے، اور شاید آخری، اگر یہ موقعہ نکل گیا تو

پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا، پوری قوم کو آپ نجات دے سکتے ہیں،
صرف سیاسی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور نہ کیجئے، بلکہ مذہبی
حیثیت سے بھی، مسلمان اس گئی گذری حالت میں بھی بڑے
سے بڑا امتحان دے سکتے ہیں۔"

اقبال کے کلام سے مولانا کی گرویدگی وشیفتگی آشکارہ ہے، مولانا کے ذہن وقلب نے کلام اقبال سے جو اثر قبول کیا وہ اثر کسی اور سے قبول نہیں کیا، لیکن کیا اس تأثر کا راز کلام اقبال کی فنیت وحلاوت، ترنم ونغمگی میں پوشیدہ ہے؟ جی نہیں! اس کا راز ملی غیرت، احیائے اسلام کی دعوت، تسخیر کائنات اور تسخیر انفس وآفاق کی ترغیب میں باہم اشتراک اور ہم آہنگی ہے، بالفاظ دیگر اسلامی تشخص کے بقاء، استیلاء اور ابدیت وسرمدیت کا پیغام دونوں یگانۂ روزگار شخصیتوں کے درمیان نقطۂ اتصال ہے مولانا خود اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں:۔

"میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اسی لئے ہیں کہ وہ بلند نظری،
محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے
ہیں، اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور
باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گذشتہ
کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب
سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں"

سبھی جانتے ہیں کہ "سیرت سید احمد شہیدؒ" مولانا کی باقاعدہ پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہی ملی تشخص کی حفاظت کے لئے جدوجہد، وہی نفاذ شریعت وغلبۂ اسلام کا جذبہ، وہ لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت تھی کہ مسلمان اس وقت ایسی دعوت اور لٹریچر کے

آرزومند بھی تھے اور ضرورت مند بھی، جوان میں خودشناسی، خود نگری اور بلند نگاہی پیدا کرے، جو ان کو غلامی کے طریق سمجھانے اور ہندوستان میں بے زبان و بے عذر رعیت اور تابع فرمان شہری بننے کے بجائے باوزن و باوقار اور صاحب عزت واعتبار ملت بننے کی دعوت دے اور ان کے قریبی اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں کو سامنے لاکر ان میں ایثار وقربانی کی روح پیدا کردے .... یہ خالص تقدیری بات تھی کہ ٹھیک اس زمانہ میں میری کتاب ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' ۳۹ء کے آغاز میں مطبع نامی پریس لکھنو سے چھوٹے سائز میں ۴۶۴ صفحات میں چھپ کر نکلی''۔

حضرت تھانویؒ نے مولاناؒ کی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد لکھا:

''میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے، اس کا اخفا نہیں کرتا، چنانچہ اس ہدیہ سے خصوصاً سیرت سید احمد شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے، ایک مسرت کا، دوسرا خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب وخور کے کوئی شغل نہیں، لہذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دیجائیں جوان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو، اب دعاء کی درخواست پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالی اپنے بزرگوں کا اتباع نصیب فرمائے۔''

اللہ، اللہ جائے حیرت ہے، اس کتاب سے اٹھنے والے اسلامی غیرت

وحمیت کے شعلے حکیم الامت، مرشد روحانی، حضرت تھانویؒ کو بھی بے تاب کر دیتے ہیں، اِس کو اُس مردِ حق آگاہ کے لافانی جذبہ، اور اس اسلامی غیرت وحمیت سے سرشاری، کے علاوہ کس چیز کا نام دیجئے، جس کو مولانا نے اپنی کتاب کے سطر سطر میں بھر دیا تھا۔

۱۹۴۴ء کا زمانہ ہے، تصنیف و تالیف، فکر و نظر، بحث و تحقیق اور تاریخ کا بہاؤ جس رخ پر تھا وہ یہ کہ مسلمان ''عامل'' نہیں بلکہ ''معمول'' ہیں اور اثر انگیز واقعات اور انقلابات زمانہ کا تختۂ مشق ہیں، مولانا کی ملی غیرت وحمیت اس طرز فکر کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوئی۔ مولانا نے اس نظریہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے بجائے، دلائل و براہین کے لشکر کے ساتھ اس پر یورش و یلغار کردی۔ اور ثابت کیا کہ مسلمان تاریخ کے ایک ایکٹر (ACTOR) نہیں بلکہ ایک طاقتور تاریخی اور تاریخ ساز عامل (FACTOR) ہیں، ان کی یہ صدا ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کی شکل میں یورپ کے ایوانوں تک پہنچی اور اس کے در و بام لرز اٹھے۔

ایک غلط فہمی یہ عام ہو رہی تھی کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے گہرے اور لمبے شگاف ہیں، یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی تھی، لیکن اس کے نتائج کیا نکل سکتے تھے وہ مولانا ہی کی تحریر میں ملاحظہ فرمایئے:

> ''دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دوررس ہیں یہ اسلام کی اندرونی طاقت وصلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے .... یہ احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی کا نتیجہ ہے، جس کا ذمہ دار

درحقیقت اسلام کی حیات بخشی اور مردم آفرینی کا نقص نہیں تاریخ اسلام کے طرز تصنیف اور ترتیب کا نقص ہے، جو حکومتوں، سیاسی واقعات اور جنگوں کے گرد گھومتی رہی ہے، اور اس نے اسلام کی تاریخ تجدید واصلاح کو مرتب اور علمی انداز میں پیش کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی، مختصر الفاظ میں یہ تاریخ کا نقص نہیں، تاریخ نویسی کا نقص ہے۔"

مولاناؒ نے "تاریخ دعوت وعزیمت" کے سلسلہ کے ذریعہ اس تاریخی نقص کا پردہ چاک کیا۔

مولانا کا سب سے پہلا مدرسہ یا مکتب جس نے مولانا کی سیرت کی تشکیل کی وہ سیرت کا مکتب اور نبوت کا مدرسہ تھا، قادیانیت کا ظہور گویا اس لئے ہوا تھا کہ وہ اس مدرسہ ومکتب کے نصاب کو منسوخ کردے، مولانا کی غیرت اس کو کیسے برداشت کرسکتی تھی اور حبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم "فداہ ابی وامی" سے شیفتگی اور وارفتگی اس حملہ کو کیسے نظرانداز کرسکتی تھی، چنانچہ "قادیانیت ایک تحلیل وتجزیہ" کے ذریعہ مولانا نے اس کے تاروپود بکھیر کر رکھ دیئے۔

مولاناؒ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اسلامی تشخص کی حفاظت اور اسلامی اقدار وروایات کی ترویج کے قائل صرف میدان رزم میں نہیں بلکہ جہان بزم میں بھی تھے۔ ندوہ کی طرف سے جب ترتیب نصاب کی کوششوں کا آغاز ہوا، تو عربی زبان وادب کا نصاب مولانا نے جس طرز کا تیار کیا وہ اسلامی اقدار وروایات کے سلسلہ میں ان کے رجحان کا عکاس ہے، انھوں نے "القراءۃ الراشدۃ" اور "قصص النبیین" کے سلسلوں کے ذریعہ بچوں کا علم الکلام تیار کردیا اور بیرونی مسموم انتاج سے مستغنی کردیا اور "مختارات" کے ذریعہ ثابت کیا کہ خالص ادبی اور فنی میدان میں بھی اسلام خود

کفیل ہے اور کہاں تک لکھا جائے، کس کس تصنیف کا ذکر کیا جائے ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

❁❁❁

ابھی تک مولانا کی غیرت ملی اور حمیت اسلامی کے حوالہ سے جو کچھ تحریر کیا گیا یہ اس وقت کی بات ہے جب مولانا دار العلوم ندوۃ العلماء کی چہار دیواری تک محدود تھے، اور درس وتدریس میں منہمک تھے، لیکن ان کے سامنے ملک کا ایک ایسا منظر تھا جو انہیں بے چین کر رہا تھا، لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی فضا سیاسی تحریکوں، مسلم لیگ کی زبردست تحریک، خاکسار تحریک کی عسکری تنظیم، اس کے منفی لٹریچر سے (جس میں طبقۂ علماء اور نمائندگان دین پر سخت تنقید تھی) کانگریس کی قومیت متحدہ کے نعرہ، اور رابطۂ عوام کی جدوجہد سے پر شور ومتحرک ہو رہی تھی، ہندوستان میں ایک نئے ہمہ گیر انقلاب کے آثار کھلی آنکھوں نظر آنے لگے تھے، جو تہذیب، اخلاقیات، عقائد، مذہبی تصورات واقدار، اور تمدن ومعاشرت سب پر اثر انداز ہونے والا تھا، بلکہ ان سب کا ایک نیا سانچہ تیار کرنے والا تھا"۔

اس طرح ملت کی خدمت اور اسلامی غیرت کا جذبۂ مستور، بدر کامل بن کر افق ارضی پر چمکنے اور ضیاء پاشی کے لئے بے تاب ہو رہا تھا، نہفتہ صلاحیتیں ہویدا ہونا چاہتی تھیں، ان کے سامنے یہ پیغام تھا۔

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

وہ "خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات" پر "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" کی فضیلت کے قائل تھے، چنانچہ وہ دارالعلوم کی چہار دیواری سے نکل کھڑے ہوئے، نئی قیادت کی تلاش میں اپنے رفیق، دین اسلام کے بے لوث خادم مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی رفاقت میں پنجاب اور بلوچستان کا سفر کیا، پھر مدارس ومراکز کا دورہ کیا، ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی، لیکن پھر چند اسباب کی بناء پر علیحدگی اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد یہ علیحدگی تبلیغی جماعت سے وابستگی میں تبدیلی ہوگئی، اس لئے کہ انہیں مولانا الیاس صاحبؒ کی شکل میں وہ دولت مل گئی جس کی ان کو تلاش تھی۔

آخر انھوں نے ۱۹۴۲ء میں دعوت وتبلیغ کے لئے یکسوئی کی خاطر دارالعلوم سے ضابطہ کے تعلق اور ملازمت کو خیر باد کہا اور سوئے ہوئے آہو کو جگانے اور سوئے حرم لے چلنے کے لئے کمر بستہ ہو گئے، ان کے پیغام کا سوز وساز مشرق ومغرب دونوں کو پہنچا ان کی صدا کی بازگشت عراق کے دجلہ وفرات، ہندوستان کے گنگ وجمن، یورپ کے ڈینوب و بحر روم اور مصر کے دریائے نیل تک پہنچی۔ مسلمانوں کو اسلام کی طرف بازگشت کی دعوت اور عالم اسلام ہی میں نہیں انسانی دنیا میں داعیانہ وقائدانہ کردار ادا کرنے اور اپنا قدیم منصب سنبھالنے کی دعوت اُن کے دل ودماغ میں کس طرح چھا گئی تھی اور اعصاب پر کس قدر مستولی وحاوی ہوگئی تھی کہ اس کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد وموضوع بنالیا، ان کے اس جوش وجذبہ کا کچھ اندازہ ان کے ایک خط کے اس اقتباس سے ہوسکتا ہے:

> "دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشت ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کردیجئے دن رات ایک کردیجئے، دل کو جلائیے اور بدن کو گھلائیے، خون دیدہ اور خون جگر بہائیے اور اس طرح بہائیے کہ دجلہ وفرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم

کریں، ایک ایک کا گریباں تھام کر کہیے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو، اے عالم کی آبرو، اے ابراہیمؑ ومحمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحرگاہی مثنیٰ بن حارثہؓ کے خون شہادت، ابوعبیدہ الثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعد بن ابی وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالبؓ کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت وتاثیر کی طوفان خیزی آبروئے شہیداں جگر گوشہ رسولؐ کی تشنگی اور خاندان رسالت کے خون کی ارزانی، ابوحنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبل کی تعزیر جرم عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبدالقادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ حاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے، اور شور قیامت برپا کیجئے کہ ع

گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ در بطحا

خلاصہ کلام یہ ہے کہ الحاد ودھریت اور کفر وباطل نے جب جب اسلام کے شجر پُر بہار پر تیشہ زنی کا ارادہ کیا تو وہ خود سینہ سپر ہوگئے اور پوری قوم کی ملی غیرت اور اسلامی حمیت کو یہ کہکر آواز دی۔

"ردة ولا أبابكر لها"

"قضية ولا أبا حسن لها"

اسلامی شریعت میں کتر و بیونت اور اضافہ وترمیم کی ہر دعوت کو یہ کہہ کر ٹھکرادیا "أينقص الدين وأنا حي"

اور مصیبت کی ہر گھڑی میں اپنی قوم وملت کو قرآنی پیغام کے ذریعہ ڈھارس

بندھائی۔

ولا تھنوا و تدعوا الی السلم وانتم الاعلون ، واللہ معکم ولن یترکم اعمالکم"

❁❁❁

مذکورہ بالا سطور بظاہر عنوان سے غیر متعلق محسوس ہوتے ہیں، لیکن اگر آپ بورڈ کی ذمہ داریوں پر دوبارہ نگاہ ڈالیں تو محسوس کریں گے کہ بورڈ کا قیام جس مقصد کے لئے ہوا تھا اور بورڈ جس ملی غیرت وحمیت کا ترجمان ہے، حضرت مولاناؒ کی پوری زندگی اسی مقصد کی تکمیل اور اسی غیرت وحمیت کی آئینہ دار ہے، اور مولاناؒ کے اسی جوش وجذبہ نے بورڈ کو ایک نیا رُخ اور ایک وسیع اُفق عطا کیا، مذکورہ بالا سطور سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت کو جس حزم وضبط، غیرت وحمیت ، جرأت وشجاعت ،شرعی مسائل کی تشریح وتفہیم کے لئے جس علمی گہرائی اور پختگی، مطالعہ کی وسعت وتنوع، مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کو محسوس کرنے کے لئے جس فراست وبصیرت اور دور بینی ، معاشرہ کی اصلاح کی خاطر ان سے قرآنی وایمانی زبان میں خطاب کے لئے جس سوز وساز، درد وکرب اور زور خطابت کی ضرورت تھی اور برادران وطن، ذمہ داران حکومت کے سامنے اسلامی شریعت کی حاکمیت ،انفرادیت ، ابدیت اور افادیت ثابت کرنے کے لئے جس یقین واعتماد اور مسائل کو حل کرنے کے لئے جس دل جمعی، مستقل مزاجی اور آشفتہ سری کی ضرورت تھی وہ اس مرد مجاہد میں بجا طور پر موجود تھیں، بلکہ ان کی پوری زندگی ہی (تدریسی، تصنیفی، دعوتی، تحریکی) اسلامی شریعت کی تنفیذ وترویج اور مسلمانوں کے غلبہ واستیلاء کے لئے عملی کوششوں سے عبارت تھی۔ اب ہم ذیل میں مولاناؒ کے عہد صدارت میں بورڈ کی سرگرمیوں کا ایک جائزہ لیتے ہیں جس میں قدم قدم پر آپ

یہ محسوس کریں گے کہ مولانا کے عہدِ صدارت میں اٹھنے والا ہر قدم، ہر فیصلہ، ہر اجلاس، اسی خود اعتمادی، جوش و جذبہ، حزم و ضبط، ہوشمندی، ملی غیرت و حمیت کا نمونہ تھا جس کی چند جھلکیاں آپ گذشتہ سطروں میں دیکھ چکے ہیں۔

حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے صدر منتخب ہوتے ہی بورڈ کو بہت سے دشوار اور کٹھن مراحل کا سامنا ہوا، مولانا لکھتے ہیں:

> ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے جو شاید اس سے پہلے عرصہ سے پیش نہیں آئے، اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم و عزم، ملت کے نظم و ضبط، علمائے دین و ماہرین قانون کے علم و مطالعہ، ذہانت و تدبر اور عوام کے انقیاد و اطاعت، صبر و تحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض و تسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔''

۶/۷/۸/اپریل ۱۹۸۵ء کو کلکتہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس میں مسلمانان ہند کی تمام دینی و سیاسی جماعتوں، مسلم تنظیموں اور مختلف مکاتب خیال کے ذمہ داروں، مسلم دانشوروں اور سر برآوردہ علماء اور قانون دانوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شام میں شہید مینار میدان میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام ہوا، عام اندازہ تھا کہ ۴۔۵ لاکھ کا مجمع ہوگا۔

۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ کے اجلاس کے دو ہفتہ بعد ہی سپریم کورٹ نے ''نفقہ مطلقہ'' کے سلسلہ میں اپنا فیصلہ دیا جس میں دین میں کھلی مداخلت، قرآن

مجید کے الفاظ کی من مانی تشریح وتفسیر، شریعت اسلامی کی توہین اوراس پر کھلا حملہ تھا۔
اس فیصلہ کے خلاف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے وزیر اعظم کے نام بڑی تعداد میں احتجاجی تار بھیجنے، مساجد میں مسلمانوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے، اور ملک کے چپہ چپہ پر عمومی جلسے کرنے کی ہدایت واپیل کی، ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اس کا ایسا اثر لیا اوراس کی تعمیل اس طرح کی جس کی نظیر تحریک خلافت کے بعد کسی دوسرے ملی مسئلہ کے سلسلہ میں نظر نہیں آتی۔ ۹ رفروری ۱۹۸۶ء کو کل ہند تحفظ شریعت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں (قومی آواز کی رپورٹ کے مطابق) ریاست کے مختلف اضلاع کے ایک لاکھ سے زائد فرزندان اسلام نے شرکت کی۔ مسلمانان رائے بریلی کے لئے جنھوں نے ۹ رفروری کو اپنا کاروبار بند کر دیا تھا، وہ دن ایک یادگار دن ہے، اسی طرح یوپی اور بہار کے مرکزی مقامات اور بڑے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات تک میں عظیم الشان جلسے ہوئے بعض کارکنوں نے دستخطی مہم بھی چلائی جس پر ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے دستخط کئے۔

نومبر ۱۹۸۶ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک وفد نے جس میں صدر بورڈ اور مولانا مجاھد الاسلام صاحبؒ تھے جنوبی ہند کا دورہ کیا جو مدراس سے شروع ہوکر کوچین، کالی کٹ تک جاری رہا، اور بنگلور (کرناٹک) کے ایک عظیم الشان اجلاس پر ختم ہوا۔ ۱۰ راپریل ۱۹۸۶ء کو خواتین کا ایک جلسہ منعقد ہوا، ان کوششوں کے ساتھ بورڈ کے صدر اور سکریٹری نے وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی سے براہ راست ملنے اوران کو مطمئن کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس سلسلہ کی ایک کڑی وہ تھی کہ ۳۰ رجولائی ۱۹۸۵ء کو ایک نمائندہ وفد کے ساتھ وزیر اعظم صاحب سے ملنے کی کوشش کی گئی، اوران کو یادداشت پیش کی گئی، دوسری شکل ذاتی ملاقاتوں کی تھی جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آتی ہے، ۲ رفروری ۱۹۸۶ء کو دہلی میں مجلس عاملہ اور

ایکشن کمیٹی کا اجلاس تھا کہ اچانک ۳؍فروری کو وزیر اعظم کی طرف سے ملاقات کی دعوت آئی، صدر عالی مرتبت نے مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کی ہمرکابی میں وزیر اعظم سے ملاقات اور موقف کی وضاحت کی، ۱۷؍فروری کو وزیر اعظم سے دوبارہ ملاقات کی گئی۔ اور قانون کے مسودہ پر غور وخوض کیا گیا۔ ۱۸؍فروری کو وزیر اعظم سے ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی، اور بہت سے مسائل زیر بحث آئے۔

۲۸؍فروری ۱۹۸۶ء کو وزیر اعظم راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کی ایک میٹنگ میں مطلقہ مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ سے متعلق پارلیمنٹ میں پیش ہونے والے بل کو بحث کے لئے طلب کیا۔ ۵؍مئی ۱۹۸۶ء کو یہ بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ ۵؍اور ۶؍مئی کی درمیانی شب مسلمانوں کے لئے عجیب رات تھی، کتنے مسلمانوں نے رات جاگتے اور دعا کرتے ہوئے گذاری، گھروں میں دعائیں ہو رہی تھیں اور ختم پڑھے جا رہے تھے اس لئے کہ یہ ملت کے وقار کا مسئلہ تھا۔ طویل بحث وتمحیص کے بعد "بل" کو منظوری حاصل ہوئی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق:

> "رات پونے تین بجے بل پر ووٹنگ عمل میں آئی اور بل کی مخالفت میں آنے والے ۵۴ ووٹوں کے مقابلہ میں بل کی حمایت میں ۳۷۲ ووٹ آئے، بل کی کامیابی پر تھکے ہوئے کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے اپنی خوشی کا اظہار کیا، دوسری طرف اپوزیشن کے بل مخالف ممبران تھکے تھکائے ہال سے باہر جا رہے تھے"۔

صدر محترم نے جولائی ۱۹۸۶ء میں وزیر اعظم کو شکریہ اور اعتراف کا ایک تاریخی خط لکھا۔ وہ خط ایک اہم اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''مائی ڈیر راجیو جی!...............

آداب وتسلیم

''مسلم مطلقہ بل کی منظوری پر اپنے جذبہ شکریہ، اعتراف کا اظہار کرنے کے ساتھ اور کچھ اس سے زائد میں (اس رابطہ و اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو اس سلسلہ کے ملاقاتوں کے ذریعہ پیدا ہوا) آپ سے اپنے اس یقینی مطالعہ اور عقیدہ کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ملک کی قیادت بلکہ اس کی حفاظت کا راستہ، حقیقت پسندی، واقعات وحقائق کو تسلیم کرنے، اصول پسندی اور اخلاقی جرأت، وسیع النظری اور فراخ دلی میں منحصر ہے، اور یہ وہی راستہ ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کے قائدین اور ملک کے صف اول کے رہنماؤں نے دکھایا تھا، اور اس پر چل کر ملک کو آزاد کرایا تھا، اس ملک کے لئے جس کے لئے شروع سے مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور ثقافتوں کا مرکز ہونا مقدر ہو چکا ہے، صحیح، جمہوریت، سیکولرزم، ہر ایک کا احترام اور اس کو ترقی کرنے اور ملک کی تعمیر وترقی میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لینے کا موقع دینا ہی صحیح طریق عمل ہے، تعصب، تشدد (VIOLENCE) تنگ نظری، جذباتیت، اور سوئی ہوئی تاریخ کو جگانا، سوئے ہوئے شیر کو جگانے کے مرادف ہے جو کسی پر رحم نہیں کھائے گا۔''

اس ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ تشدد کا وہ رجحان ہے جو ادھر چند برسوں (اور چند مہینوں سے خاص طور پر) ابھر کر

سامنے آگیا ہے، اور جس کے گاندھی جی سخت مخالف تھے اور اس سے شدید خطرہ محسوس کرتے تھے، اس لئے کہ آگ کو جب باہر کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی تو وہ اپنے کو کھانے لگتی ہے، فرقہ وارانہ منافرت اور تشدد، فرقوں سے آگے بڑھ کر ذاتوں، طبقوں اور پھر خاندانوں اور افراد تک منتقل ہو جائے گا اور پھر ملک کو تباہی سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا کہ وہ ملک وقوم کی ملکیت ہے، مگر آپ سے بے تکلفی اور خلوص سے کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت آپ کو ملک کے لئے ضروری سمجھتا ہوں، اس لئے خلوص کے ساتھ آپ کی عمر وصحت کے لئے دعا بھی کرتا ہوں، اور بے لاگ مشورہ بھی دیتا ہوں کہ لیڈر شپ کی اس ریس اور سیاسی جوڑ توڑ کے اس اکھاڑہ میں آپ کی خصوصیت جس سے آپ اس سب پر فتح پا سکتے ہیں، اور اہل ملک کا دل جیت سکتے ہیں وہ آپ کا خلوص، سچائی، اخلاقی جرأت، اور سادگی اور عملیت ہے جس کی ان سیاسی بازیگروں کے ہاں صرف کمی نہیں بلکہ فقدان ہے، مذہبی کتابیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ آخر میں سچائی ہی کی جیت ہوتی ہے، اور سازشیں، ذہانتیں، خطابتیں اور شورش اس کے سامنے ناکام رہی ہیں، میرا مخلصانہ مشورہ اور استدعا ہے آپ اسی راستہ پر چلتے رہیں، ملک اس وقت ایک ایسے بحران (CRISIS) اور ایسے خطرے سے دوچار ہے جس کی مثال پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس وقت ملک کے لئے سب سے بڑا خطرہ

ظلم وتشدد، فرقہ وارانہ اور ذات برادری کا اونچ نیچ، اخلاقی وانتظامی انتشار (CORUPTION) فرقہ وارانہ احیائیت (REVIVALISM) اس کے مقابلہ صف آرا بلکہ سر بکف ہوکر کھڑے ہونے کی ضرورت ہے، اور میری واقفیت اور قدرت کے اشارے بتاتے ہیں کہ اس کے لئے موزوں ترین آدمی آپ ہی پورے ملک میں ہیں، کسی تنظیم اور کسی مکتب خیال میں کوئی آدمی اس کلیبر کا نظر نہیں آتا، آپ کو خدا نے ملک کا وسیع پیمانہ پر اعتماد اور عوام کی محبت کی دولت بھی عطا کی ہے، اور وزارت عظمی اور کانگریس کی صدارت پر فائز کر کے اس کا قریبی موقعہ بھی دیا ہے، میری دردمندانہ استدعا ہے کہ آپ اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھائیں، اور تاریخ میں اپنے لئے جگہ اور دلوں میں اپنے لئے غیر محدود محبت وعظمت کے مالک بن جائیں۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

ابوالحسن علی ندوی

وزیراعظم اور ان کے مشیر کاران سے ملاقاتوں کے درمیان بابری مسجد کے مسئلہ کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی رہی، صدر بورڈ نے دومرتبہ بابری مسجد سے متعلق اپنی تجاویز اور مسئلہ کا حل راجیو جی کو معتبر ذریعہ اور ڈاک سے بھیجا، فروری ۱۹۸۶ء میں اس سلسلہ میں صدر محترم نے پریس کو ایک بیان دیا، اس بیان کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''اجودھیا کی بابری مسجد کے سلسلہ میں یک طرفہ فیصلہ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو غیر معمولی صدمہ ہوا ہے، ایسے

حالات میں جب کہ مسلمانوں کے جذبات پرسنل لا کے مسئلہ پر مجروح ہیں، اوران کی تمام تر جدو جہد اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور دینی شعائر کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ہورہی ہے، بابری مسجد پر پڑے ہوئے تالے کوکھول کراسے دوسرے فرقہ کو پوجااور درشن کی کھلی اجازت دینا،اوراس مسجد پرکسی قسم کی پابندی عائد نہ کرنے کا حکم دینا کسی طرح دانشمندانہ اقدام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس اقدام سے خطرہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں،اوروہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس ملک پرصرف ایک فرقہ کی حکومت ہے،اور طاقت کے بل بوتے پر یکطرفہ فیصلہ کرکے دوسروں کے حقوق کونظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

بابری مسجد کے بارہ میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت اوران کی مسجد ہے،جس میں وہ ساڑھے چارسو سال سے زائد سے نمازیں ادا کرتے رہے ہیں،مسلمانوں میں اس اقدام سے اشتعال کا ہونا فطری بات ہے، اور یہ ان کی دینی غیرت وحمیت کی دلیل ہے، البتہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ فرقہ پرست عناصر کے اشتعال انگیز نعروں سے متاثر نہ ہوں، اس سے حالات مزید بگڑ جائیں گے، انھیں چاہئے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور جس طرح انھوں نے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں اپنے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے،اسی طرح انھیں ان جیسے نازک مسائل کے بارے میں اپنے اتحاد کے مظاہرہ کے ساتھ

دانشمندانہ اور ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے اور حکومت وانتظامیہ کو وہ یہ باور کرادیں کہ اقلیتوں پر ظلم وزیادتی اور خاص طور سے ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کیا اور بابری مسجد کے سلسلہ میں کیے گئے حالیہ اقدامات واپس نہ لئے تو اس کے نتائج بڑے سنگین اور خطرناک ہوسکتے ہیں۔

اس مسئلہ پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی اپنے حالیہ اجلاس دہلی میں ایک تجویز منظور کرکے اخبارات کو اشاعت کے لئے ارسال کیا ہے۔"

۴/مئی ۱۹۸۶ء کی تاریخ میں "نفقۂ مطلقہ" کے مسئلہ کے افہام وتفہیم کے سلسلہ میں ایک ڈائلاگ کا نظم کیا گیا۔

۱۵/دسمبر ۱۹۸۶ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا آٹھواں اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، اس میں پورے ہندوستان کے ارکان بورڈ، قائدین وعمائدین اور ملی و دینی کارکن شریک تھے۔

۸۷ء اور ۸۸ء میں ملک کے غیر معتدل حالات، فسادات اور دوسری مصروفیتوں کی بنا پر اجلاس عام نہ ہوسکا۔ ۴/۵/مارچ ۱۹۸۹ء میں بورڈ کا اجلاس نہم کانپور میں منعقد ہوا۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے بارے میں حکومت کی طرف سے یقین دہانی اور وعدہ کے باوجود حکومت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی شرکت، کابینہ کے بعض ارکان کے مشکوک رویہ اور یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے لئے دستور میں مشروط لیکن واضح

دفعہ کی موجودگی کی بنا پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹریٹ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بورڈ کا ایک ذمہ دار ونمائندہ وفد وزیر اعظم صاحب سے ملاقات کرے، یکم مئی ۱۹۸۹ء کو وزیر اعظم سے ملاقات اور مسائل پر گفتگو ہوئی۔ ۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو بچوں کے گھر دریا گنج میں بابری مسجد کے مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی عاملہ کا جلسہ ہوا۔

> ''جلسہ نے ایک مبسوط ومفصل تجویز بھی پاس کی جس میں ان مختلف حلقوں، افراد اور بالخصوص رابطہ کمیٹی اور ایکشن کمیٹی کی کوششوں کو سراہا گیا، اور ان کو باہم مربوط رکھنے اور اتحاد مقصد کے ساتھ اتحاد عمل کی دعوت دی گئی، فرقہ پرست تنظیموں اور فرقہ پرست جارحیت کے نتیجہ میں جو حالات پیش آئے، اور متعدد مقامات پر پولیس بالخصوص (P.A.C.) نے جو کردار ادا کیا، اس کی مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ جو مسلمان ان ہنگاموں میں ہلاک ہوئے وہ شہید ہیں، اور شہادت کی موت اتنی عظیم ہے کہ مومن اس کی تمنا کرتا ہے، نیز مشورہ دیا گیا کہ مسلمان جان ومال، عزت وآبرو اور شعائر دینی کے حملہ کے موقعہ پر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں اور اپنے دفاع کے لئے دینی، اخلاقی اور قانونی حق کا بھرپور استعمال کریں، اس ملک میں مسلمان کا وجود حکومت یا اکثریت یا کسی گروہ کے رحم وکرم پر نہیں ہے، اس کا سہارا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی ہی کے ذریعہ زندہ اور باقی رہ سکتا ہے۔''

اس کے ساتھ تجویز نے مسجد کے شرعی موقف کی وضاحت کی کہ نہ اسے

تبدیل کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کو کسی مصلحت کی بنا پر کسی فرد، جماعت یا حکومت کے حوالہ کیا جا سکتا ہے، پھر اس کا اظہار کیا گیا کہ "بابری مسجد" مسجد ہی ہے، وہ کسی غصب کی ہوئی زمین پر، یا کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی ہے، بنا بریں یہ مسجد مسلمانوں کو اسی حالت میں جس میں کہ ۲۲؍دسمبر ۱۹۴۹ء تک تھی واپس کی جانی چاہئے، تجویز میں یہ بھی کہا گیا کہ مسجد سے ملحقہ قبرستان کی آراضی پر جو شیلانیاس ۹؍نومبر ۱۹۸۹ء کو ہوا تھا، وہ غلط اور ناجائز تھا، اس مقام پر کارسیوا یا ایسے کسی پروگرام کی اجازت نہیں دی جا سکتی، پھر حکومت سے شکایت واحتجاج کیا گیا ہے کہ اس نے اب تک اشتعال انگیزی کو روکنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی، حکومت کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔"

۲۳؍۲۴؍نومبر ۱۹۹۱ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا دسواں سالانہ اجلاس جامعہ نگر اوکھلا میں منعقد ہوا، ۱۹۹۲ء میں رام جنم بھومی کا مسئلہ مجلسوں کا موضوع سخن، اخبارات کا سب سے نمایاں عنوان اور ذرائع نشر واشاعت کا سب سے طویل وعریض موضوع تھا، اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے موقف کی وضاحت صدر بورڈ نے ان الفاظ میں کی:

> "راقم سطور اور اس کے رفقاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممتاز ارکان نے اپنے اخباری بیانات میں خبر رساں ایجنسیوں اور اخباری نمائندوں کے انٹرویوں میں بالکل واضح طریقہ پر اعلان کر دیا تھا کہ "مسجد منہدم کی جا سکتی ہے نہ منتقل کی جا سکتی ہے وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی اور اپنی جگہ پر رہے گی" دہلی کے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اس اجلاس سے لے کر جو گزشتہ سال اس موضوع پر بحث کرنے اور مسلمانوں کا موقف ظاہر کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا، کسی ایک دن اور کسی ایک ساعت میں

بھی اس کے خلاف پرسنل لا بورڈ کے کسی ذمہ دار آدمی نے ایک لفظ نہیں کہا۔

لیکن مسئلہ کے اس وقت تک حل نہ ہو سکنے اور اس کے بارہ میں قیاس آرائیوں اور مبالغہ آمیزیوں، بلکہ بعض اردو اخبارات کی طرف سے افواہ بازیوں اور افترا پردازیوں کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ پھر اس کے بارہ میں پرسنل لا بورڈ کی طرف سے واضح اعلان کیا جائے، یوں بھی پرسنل لا بورڈ کے مجلس عاملہ کا جلسہ، کاموں کا جائزہ لینے اور اصلاحی، معاشرتی اور قانونی مسائل پر مشورہ کرنے کے لئے بلانے کی ضرورت تھی، راقم کی دعوت پر اس کا لکھنو میں ہونا طے پایا، اور اس کے لئے ۱۱راگست ۱۹۹۲ء کی تاریخ مقرر ہوئی، لکھنو میں گلمرگ ہوٹل میں مہمانوں کے ٹھہرنے اور اجلاس کو منعقد کرنے کا انتظام کیا گیا، اس اجلاس میں چوبیس ارکان عاملہ اور سات مدعوئین خصوصی جمع ہوئے، علاوہ دوسری تجاویز کے جو اس مجلس عاملہ کی رپورٹ میں درج ہیں، بابری مسجد کے بارہ میں ایک واضح اور طاقتور تجویز منظور ہوئی، ۲ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو مسجد کی شرعی حیثیت کے بارہ میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی، اس کا حوالہ دیا گیا اور کہا گیا کہ اس وقت ملک کی جس ذمہ دار شخصیت (وزیر اعظم) واسطہ ہے، اس کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت اور فراست وعزیمت کی بھی۔''

۱۱راگست ۱۹۹۲ء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہو رہا تھا

کہ وزیراعظم کا فرستادہ ان کا ذاتی مکتوب بنام صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ لے کر پہنچا، وہ خط بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔

محترم!.............................آداب

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

خواہش تو یہ تھی کہ آپ سے ملاقات ہوتی لیکن پچھلے دنوں جو صاحبان آپ سے مل کر آئے ان سے معلوم ہوا کہ فی الوقت آپ کے لئے دہلی کا سفر کرنا مشکل ہوگا لہذا یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔

بابری مسجد اور رام جنم بھومی تنازعے کو باہمی مفاہمت اور گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی قومی رائے عامہ بنتی جارہی ہے، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ یہ انتہائی پیچیدہ نازک اور حساس مسئلہ بن گیا ہے اور اس مسئلہ کا منصفانہ، معقول اور سب کے لئے قابل قبول حل نکالنے کی کوشش ملک کے ممتاز مذہبی رہنماؤں کے مشورے اور عملی تعاون کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔

ملکوں اور قوموں کی زندگی میں بعض مراحل ایسے آتے ہیں کہ جب وقتی مصلحتوں، سیاسی مفادات پر جوش وجذباتیت اور اشتعال انگیزی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے نیک نیتی، دور اندیشی، دیانتداری، دردمندی اور دانش مندی کے ساتھ ہی قومی نوعیت کی اور مذہبی جذبات سے جڑے ہوئے پیچیدہ، مسائل کو حل کیا جانا چاہئے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق فرمائیں گے،

آپ نے اس مسئلہ کے حل کے لئے ماضی میں جو مثبت اور مخلصانہ کوشش کی ہے اسی کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ آپ نئے سرے سے اس سلسلہ میں رہنمائی اور تعاون فرمائیں گے۔

بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعے میں مذہب، تاریخ، قانون اور سیاست سب کو اس طرح الجھا دیا گیا ہے کہ اسے حل کرنا کسی ایک فرد کے لئے انتہائی دشوار ہے، اس خیال کے پیش نظر میں کھلے دل و دماغ سے ہر مناسب، معقول اور مثبت تجویز اور مشورہ پر خواہ وہ کسی بھی فرد، حلقے، جماعت یا فرقے کی طرف سے سامنے آئے غور کرنے کے لئے تیار ہوں اور سب کا تعاون ضروری سمجھتا ہوں۔

ملک میں امن واعتماد اور مذہبی رواداری کا ماحول قائم رہے یہ میری ذاتی خواہش ہی نہیں بلکہ یہ ملک کی اندرونی سلامتی اور بیرونی وقار کے لئے تمام ہندوستانیوں کی قومی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔

تمام تر مشکلات کے باوجود اگر نیک نیت، دیانت دار اور اعتدال پسند اصحاب اجتماعی شعور اور باہمی مشورے سے اس مسئلہ کا حل تلاش کریں تو مناسب اور قابل قبول عمل حل سامنے آسکتا ہے۔

مناسب تو یہی تھا کہ آپ سے ملاقات ہوتی تا کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو ہو سکتی، لیکن اگر کسی وجہ سے اس وقت آپ کے لئے دہلی کا سفر ممکن نہیں تو براہ کرم اس سلسلہ میں

مجھے اپنے خط یا اپنے کسی نمائندہ کے ذریعہ اپنی رائے، مشورے یا اس سلسلہ میں طریقہ کار یا عملی حل کے لئے اپنی تجاویز سے مطلع فرمادیں، سب کی رائے ہے کہ اس سلسلہ میں بلا تاخیر مناسب اقدام کئے جانے چاہئیں، اسی لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

شکریہ

مخلص

(پی۔وی۔ نرسمہاراؤ)

صدر محترم نے جو جوابی خط ارسال کیا وہ خط بجنسہ یہاں درج کیا جارہا ہے:

گرامی مرتبت جناب نرسمہاراؤ صاحب وزیر اعظم ہند

جناب کا گرامی نامہ کل ۱۱راگست کو دستی طریقہ پر پہنچ کر باعث عزت افزائی ہوا پھر اس کو اردو میں آپ کے قلم سے دیکھ کر مزید مسرت ہوئی اور آپ کی اس خصوصیت و امتیاز کا مشاہدہ اور تجربہ ہوا جس کی شہرت میں نے پہلے سے سن رکھی تھی۔

جواباً گزارش ہے کہ مجھے خود عرصہ سے آپ سے براہ راست نیاز حاصل کرنے کی خواہش اور ضرورت کا احساس تھا، میں آپ سے تخلیہ کی ایک ایسی ملاقات چاہتا تھا جس میں میں آپ سے ملک کے وسیع مفاد میں گفتگو کرسکوں کہ ملک اس وقت ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہے جو عرصہ دراز کے بعد بدقسمتی سے ملکوں اور قوموں کو پیش آتی ہے اور جس کی تلافی بعض اوقات ناممکن اور بعض اوقات سخت دشوار ہوجاتی ہے، میں نے آپ کی اس ذمہ داری (وزارت عظمیٰ) کے سنبھالنے کے معاً بعد ایک

مفصل عریضہ کسی معتبر ذریعہ سے ارسال خدمت کیا تھا، جس کے متعلق معلوم ہوا کہ آپ نے توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمایا اور جواب دینے کا بھی وعدہ یا ارادہ فرمایا، اس نازک مرحلہ پر آپ کا ملک کی رہنمائی اور سربراہی کے منصب پر فائز ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔

حسن اتفاق ہے کہ جس وقت آپ کے فرستادہ حضرات گرامی نامہ لے کر لکھنؤ پہنچنے والے تھے، یہاں اس ناچیز ہی کی صدارت میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کا جلسہ ہو رہا تھا، اور میں کھانے کے وقفہ میں وہاں سے اٹھ کر اپنی قیام گاہ پر آیا جہاں ان دونوں حضرات سے ملاقات ہوئی، پرسنل لا بورڈ کے اس جلسہ میں (غالباً آپ ہی کے ایما اور اشارہ پر) اس وفد کی تشکیل کی جانے والی تھی جو آپ کی ملاقات سے شرف یاب ہوگا، وفد کے ارکان کا انتخاب میری رائے پر چھوڑ دیا گیا، آج ۱۲راگست کو میں نے اور پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا نظام الدین صاحب نے ان ارکان کا انتخاب کیا جو بورڈ کی نمائندگی کریں گے، میں نے قصداً وارادۃً اپنے کو اس وفد میں شامل نہیں رکھا جو تنہا بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ پر گفتگو کرے گا، اس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ یہ منتخب ارکان وفد مختلف ریاستوں کے رہنے والے اور مختلف اداروں کے ذمہ دار ہیں، کسی کو کسی تاریخ میں عذر ہوسکتا ہے اور کسی کو کسی تاریخ میں، معلوم نہیں یہ کس دن اور کس تاریخ پر آپ

کی ملاقات اور بورڈ کی نمائندگی کر سکیں گے، اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں ستمبر کے پہلے ہفتہ کے آخر میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے (جس کا میں چیئرمین ہوں) انشاء اللہ لندن کے لئے روانہ ہو جاؤں گا، دوسرے یہ کہ اس وفد کی گفتگو خاص اس تنازعہ کے موضوع پر ہوگی جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے اور میں ملک کی موجودہ صورت حال اور اس کی اصلاح کے موضوع پر بھی گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی تنہائی میں جس کا مجھے اس محدود وقت میں اور کثیر التعداد ارکان وفد کی موجودگی میں موقع نہیں ملے گا اور مناسب بھی نہیں ہوگا، اس لئے میری درخواست ہے کہ ۶ رستمبر یا ۷ رستمبر کی تاریخ میں مجھے اجازت دی جائے کہ میں آپ سے تنہائی میں مل سکوں، شاید اس طرح ملک کی کوئی خدمت ہو سکے اور بعض حقائق پر بے تکلفانہ غور کرنے اور ان کے حل کی تلاش میں مدد ملے، آپ کو اگر اس سے اتفاق ہو اور آپ ۶ ریا ۷ رستمبر کو اس کے لئے وقت نکال سکیں تو مطلع فرمائیں میں انشاء اللہ حاضر ہو جاؤں گا، اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا، خدا آپ کو اس ملک کی خدمت کے لئے تا دیر سلامت رکھے اور مدد و رہنمائی فرمائے۔

مخلص و دعا گو

ابوالحسن علی ندوی

۱۲ راگست ۱۹۹۲ء

صدر محترم نے اگرچہ خط میں عدم حاضری کی اطلاع دے دی تھی لیکن ارکان بورڈ کے اصرار اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آخر ان کو بھی سفر کا فیصلہ کرنا پڑا، چنانچہ ۱۵/اگست ۱۹۹۲ء کو بورڈ کے مجلس عاملہ کے منتخب کردہ ارکان نے وزیر اعظم سے ملاقات کی دوسرے دن ۱۶/اگست کو وزیر اعظم کی خواہش پر صدر بورڈ نے وزیر اعظم صاحب سے دوبارہ ملاقات کی۔

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کا دن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک سیاہ ترین دن ہے جس وقت کہ یہاں کی فرقہ پرست جماعتوں اور انتہا پسند تنظیموں نے مذہبی تعصب اور جوش جنوں میں ہندوستان کی قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا اور بڑے پیمانے پر ملک میں خونی فسادات کرائے۔ فرقہ وارانہ جنون کی آگ میں ملک جل رہا تھا۔ مسلمان مایوسی اضطراب اور بے چینی کی کفیت میں مبتلا تھے۔ ان کی نگاہ تجسس بورڈ کی طرف اٹھنے لگی، ایسے مایوس کن حالات میں حضرت صدر محترم نے مسلمانوں کے قدموں کو جمایا، اور انہیں زندہ ملت کی حیثیت سے رہنے اور حوصلہ و ہمت کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کی۔

۵/اپریل ۱۹۹۳ء مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد نے وزیر اعظم سے دوبارہ ملاقات کی اور میمورنڈم پیش کیا۔

۱۵/مئی ۱۹۹۳ء کو نئے حالات و مسائل کا جائزہ لینے کے لئے بورڈ نے مجلس عاملہ کی ایک میٹنگ بلانے کا فیصلہ کیا اس کے لئے لکھنؤ کا مقام طے ہوا اور بعض مصالح کے پیش نظر یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس میں صرف عاملہ کے ارکان شریک ہوں، اس سے پہلے بورڈ نے بابری مسجد قضیہ کی نگرانی اور تصفیہ کے لئے عجلت میں ۷ رکنی کمیٹی کی تشکیل دی تھی، عاملہ کے اس اجلاس میں، سات رکنی کمیٹی کا نام بدل کر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (برائے بازیابی بابری مسجد) کمیٹی تشکیل دی اور

اس کے ارکان میں آٹھ ارکان کا اضافہ کیا اور طے کیا کہ:

"کمیٹی کا دائرہ کار صرف بابری مسجد ہوگا، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے معروف موقف کے دائرہ میں کمیٹی کام کرے گی یہ بھی طے کیا گیا کہ بورڈ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے اپنی جد وجہد جاری رکھے گا، کمیٹی کے کنوینر بدستور جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب رہیں گے اور اس کا صدر دفتر دہلی ہوگا، راقم نے اس کی صاف طریقہ پر وضاحت کی کہ بورڈ واضح دینی وشرعی مقاصد کی تکمیل کے لئے بنایا گیا ہے، اس کا طریقۂ کار اور لب ولہجہ بھی دینی ودعوتی ہونا چاہیے، ساتھ ہی اس کمیٹی اور بورڈ کو اس انداز سے کام کرنا چاہیے کہ وہ خودمختار معلوم ہو، کسی دوسرے ادارہ یا تحریک کا تابع نہ معلوم ہو۔

اصلاح معاشرہ کے موضوع پر بحث کے دوران طے کیا گیا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل کردہ اصلاح معاشرہ کمیٹی جلسوں اور کانفرنسوں کا انعقاد کرے اور بورڈ کے فیصلہ کو روبعمل لائے، بورڈ کے خلاف دائر مقدمات کا بھی جائزہ لیا گیا اور قانونی جائزہ کمیٹی کو مشورہ دیا گیا کہ کمیٹی بلا کر بورڈ کی طرف سے قانونی تیاری جلد مکمل کی جائے، تدوین قوانین اسلامی کا جو اہم کام بانی مسلم پرسنل لا بورڈ امیر شریعت جناب مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب نے شروع کرایا تھا، اور جس پر حال میں نظر ثانی کا کام ہوا ہے، اس کی کتابت کا کام شروع کرادیا جائے، اور بقیہ حصہ پر نظر ثانی کا کام جلد مکمل کرلیا جائے، اس علمی دستاویز کا انگریزی

اور ہندی ترجمہ بھی ہوگا تاکہ عدالتیں اور قانون داں حضرات اس سے استفادہ کرسکیں اور اسلامی اور عائلی قانون کے سلسلہ میں اس کو سند کا درجہ دیں۔"

بورڈ کی اس میٹنگ اور اس کے ان فیصلوں سے جن میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا اور بورڈ کے تشخص وانفرادیت کے اظہار کی مخلصانہ کوشش اور اس کے اس طریقۂ کار کی وضاحت کی گئی جو شروع سے اس کا شعار اور امتیاز رہا ہے اور جس کی وجہ سے وہ کامیابی حاصل ہوئی جو اس دور اخیر کی کم عوامی اور مذہبی تحریکوں کو حاصل ہوئی ہے، بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا، اور بورڈ بہت سے ان اعتراضات، شبہات اور بدگمانیوں سے بچ گیا جو دہلی کی مجلس عاملہ کی میٹنگ کے بعد سے عام رواج ومزاج کے مطابق اس کے بارہ میں کی جارہی تھیں۔

۹/۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو بورڈ کی مجلس عاملہ نے سالانہ اجلاس جے پور (راجستھان) میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، جے پور اجلاس کے اختتام پر اجلاس کی جو کارروائی اور اس کی جو منظور شدہ تجاویز اخبارت میں شائع ہوئی ان میں کی ایک اہم اور بنیادی تجویز ہندوستان میں "دارالقضاء" کے نظام سے متعلق تھی، اس پر بعض حلقوں میں غلط فہمی پیدا ہوگئی جس کا ازالہ کیا گیا، ۳۱/ مارچ ۱۹۹۵ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان اصلاح معاشرہ کانفرنس منعقد ہوا اس کانفرنس میں یوپی میں تین علاقائی اصلاح معاشرہ کانفرنسیں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ان میں سے تیسری علاقائی کانفرنس دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں ۳۱/ مارچ ۱۹۹۵ء کو ہوئی، ۱۸/ جون ۱۹۹۵ء کو دہلی میں بورڈ کا مشاورتی اجتماع منعقد کیا گیا جس میں "یکسا سول کوڈ" سے متعلق حکومتی فیصلہ پر غور وخوض کیا گیا، اس اجتماع میں باتفاق آراء جو تجویز پاس ہوئی وہ یہاں بلفظہ نقل کی جاتی ہے:

''سپریم کورٹ کا ۱۰ رمئی ۱۹۹۵ء کو دیا گیا فیصلہ جس میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کے تعلق سے مرکزی حکومت کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے لئے اقدامات کرے اور اگست ۱۹۹۵ء میں سپریم کورٹ کو ان اقدامات سے واقف کرائے، یہ فیصلہ انتہائی نامناسب اور افسوسناک ہے، اس فیصلہ سے شریعت اسلامی میں مداخلت کا راستہ کھلتا ہے جس کو مسلمان قبول نہیں کریں گے، یہ فیصلہ مذہبی عمل کی آزادی کے بارہ میں سپریم کورٹ کے سابقہ کئی فیصلوں کے خلاف ہے۔

اس نقطۂ نظر کا اظہار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے کیا جس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۸ رجون کو دہلی میں صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں ارکان کے علاوہ دیگر علماء اور ماہرین قانون کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اور مسٹر سرلا مدگل کیس میں جسٹس کلونت سنگھ اور جسٹس سہائے کے فیصلہ کا تفصیل سے جائزہ لیا، جس کے بعد ایک قرارداد کے ذریعہ بورڈ نے اپنے اس موقف کو دہرایا کہ ''یکساں سول کوڈ'' کا نفاذ مسلمانوں کی شریعت اور دین میں مداخلت ہے، اس کو مسلمان قبول نہیں کریں گے، کیونکہ وہ نکاح، طلاق، وراثت، وصیت وغیرہ کے معاملات میں قرآن وحدیث کے احکامات پر چلنے کے پابند ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس فیصلہ سے پیدا شدہ بے چینی کو دور کرنے کے لئے حکومت

اعلان کرے کہ وہ یکساں سول کوڈ کی تدوین اور اس کے نفاذ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، سابقہ مرکزی حکومتیں جب بھی موقع اور ضرورت ہوئی یہ اعلان کرتی رہی ہیں، اور یہی مرکزی حکومتوں کی پالیسی رہی ہے، بورڈ نے سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے تعلق سے قانونی اقدامات کے جائزہ کے لئے ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی ہے، اور طے کیا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کے ملک وعوام پر مضر اثرات کی وضاحت کے ساتھ ارکان پارلیمنٹ اور سیاسی جماعتوں کے قائدین کے سامنے بورڈ کے موقف کو واضح انداز میں رکھا جائے اس کے لئے بورڈ نے ایک نو رکنی کمیٹی تشکیل دی۔

بورڈ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ لٹریچر، سمپوزیم، سیمینارس، اور اجتماعات کے ذریعہ ملک کے اصحاب فہم کے آگے اسلام کا عادلانہ اور فطری نظام قانون کو پیش کیا جائے، بورڈ نے ملک کے بڑے شہروں میں اجتماعات کے انعقاد کا فیصلہ کرنے کے ساتھ مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی مختلف انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کے ذریعہ اور مختلف اجتماعات کے موقع پر حکومت ہند سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے سابقہ موقف کا اعلان کرے اور صاف کہدے کہ حکومت یکساں سول کوڈ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، بورڈ نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا کہ مسلم پرسنل لا کی برقراری کے لئے بورڈ کی جانب سے جو بھی اقدام آئندہ کئے جائیں گے مسلمان اس کی پرزور تائید وحمایت کے لئے تیار رہیں۔''

۷،۸،۹/اکتوبر ۱۹۹۵ء کو احمد آباد کے تاریخی شہر میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا بارہواں اجلاس منعقد کیا گیا۔ ۷/اکتوبر کو بورڈ کا مشاورتی وانتظامی جلسہ ہوا، ۸/اکتوبر کی شام ملک شعبان اسٹیڈیم کے میدان میں اجلاس عام ہوا جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ڈھائی لاکھ کے اجتماع کا اندازہ ہے بورڈ کے اجلاس احمد آباد نے سب سے اہم فیصلہ یہ کیا کہ ماہ نومبر کے آخر (۲۴ تا ۳۰ نومبر) پورے ملک میں تحفظ شریعت ہفتہ منایا جائے جس میں ایک دن اصلاح معاشرہ کا پروگرام ہو۔ ۱۶/جنوری ۱۹۹۶ء کو بورڈ کی عاملہ کا جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جلسہ نے اصلاح معاشرہ کا جائزہ لیا اور اصلاح معاشرہ پر ہفتہ منانے کی تقریب میں جو جلسے ہوئے تھے ان کی رپورٹیں سنیں۔ اسی سال صدر محترم نے وزیر اعظم مسٹر دیوگوڑا کے نام ایک خط بھیجا جس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”دوسری بات یہ ہے کہ جنگ آزادی کے رہنماؤں اور ہمارے ملک کے بعید النظر اور عمیق قائدین نے (جن میں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو خاص طور سے قابل ذکر ہیں) اس ملک کے لئے جن تین اصولوں اور شرطوں کی پابندی ضروری قرار دی تھی وہ آج بھی ضروری اور اس ملک کی سالمیت، حفاظت اور ترقی کے لئے شرط ہیں۔ یعنی (۱) جمہوریت (۲) لامذہبیت (۲) عدم تشدد۔

۷/جولائی ۱۹۹۶ء بورڈ کی عاملہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا اجلاس میں جو فیصلہ اور تجاویز منظور ہوئے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

”نئی دہلی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس مورخہ ۷/جولائی ۹۶ء کو دہلی میں صدر بورڈ مولانا سید

ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ارکان عاملہ کے علاوہ مدعوئین حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی، اجلاس میں بابری مسجد کے مسئلہ پر تفصیلی مباحث ہوئے اور سپریم کورٹ کے ذریعہ تصفیہ کی تجویز کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا، تمام آراء کو سننے کے بعد اجلاس نے پیش کردہ نکات پر دستوری قانونی اور سیاسی نقطہ نگاہ سے جائزہ لینے کے بعد اس تعلق سے پالیسی کی سفارش مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے کنویز جناب یوسف حاتم مچھالا ایڈوکیٹ بنائے گئے، جس میں بنات والا صاحب ایم ، پی ، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب ، جناب م۔ افضل صاحب سابق ایم، پ، جناب ظفریاب جیلانی صاحب ایڈوکیٹ، اور بورڈ کے سکریٹری جناب عبدالرحیم قریشی اور مولانا محمد ولی رحمانی شامل ہیں، اس کمیٹی کا اجلاس شام میں منعقد ہوا اور کافی غور وخوض کے بعد اس نے ایک متفقہ رپورٹ پیش کی، کمیٹی کی سفارش کے مطابق اجلاس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ :

"ہم حکومت ہند کی اس فکرمندی کی قدر اور ستائش کرتے ہیں کہ بابری مسجد کے تنازعہ کا جلد از جلد تصفیہ کیا جائے ، تاہم بورڈ نے یہ ضروری سمجھا اور مطالبہ کیا کہ سپریم کورٹ میں دستور کی کسی موزوں دفعہ کے تحت بابری مسجد کے مقدمات کی سماعت کے آغاز تک ہائی کورٹ میں ان کی سماعت میں رکاوٹ نہ پیدا کی جائے اور اس کو جاری رکھا جائے بلکہ اس میں روزانہ سماعت

کی درخواست کی جائے چونکہ دفعہ (۳۸) کے تحت کی تکمیل ضروری ہے، پہلے سپرد کئے جانے والے معاملات کے تعلق سے ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان اور معاہدہ اور دوسرے اس معاہدہ کے مطابق سپریم کورٹ کو اختیار سماعت دے اور دائرہ اختیار کا تعین کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں قانون کی منظوری ۔اس لئے قرار داد میں مزید کہا گیا ہے کہ متحدہ محاذ حکومت کی مشترکہ اقل ترین پروگرام میں دفعہ ۱۳۸ کے تحت بابری مسجد کے نزاع کو سپریم کورٹ کے حوالہ کرنے کی تجویزیں، ریاستی حکومت سے مجوزہ معاہدہ اور پارلیمنٹ میں منظوری کے لئے مجوزہ قانون کی تفصیلات نہیں ہیں اس لئے بورڈ محسوس کرتا ہے کہ اس تعلق سے بورڈ اور حکومت کے درمیان تفصیلی جائزہ اور گفتگو کی ضرورت ہے، اجلاس نے گفتگو کے لئے مذکورہ کمیٹی کو مجاز گردانا، اجلاس میں وقف ایکٹ بابت ۱۹۹۵ء و یمنس ایکٹ کے مسائل بھی زیر بحث آئے کہ ان کے بعض پہلو شریعت کے مطابق نہیں ہیں، بورڈ نے وقف ایکٹ کے جائزہ کا کام اس کمیٹی کے سپرد کیا اور ویمنس ایکٹ کے جائزہ کے لئے کمیٹی کی تشکیل کا اختیار صدر بورڈ کو دیا۔ اجلاس کے آغاز میں سپریم کورٹ میں زیر کارروائی مقدمات کی نوعیت اور مرحلۂ سماعت کا جائزہ لیا گیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے لٹریچر کی تیاری کے سلسلہ میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو مولانا مختار احمد ندوی، مولانا محمد رابع ندوی، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا

خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا جلال الدین عمری اور مولانا محمد ولی رحمانی سکریٹری بورڈ پر مشتمل ہے۔“

۲۵/اپریل ۱۹۹۸ء کو دہلی میں بورڈ کا جلسہ منعقد ہوا ”قومی آواز“ لکھنو مورخہ ۲۹/اپریل ۱۹۹۸ء میں جو اس جلسہ کی مختصر رپورٹ شائع ہوئی وہ یہاں درج کی جاتی ہے۔

”نئی دہلی ۲۸/اپریل ۱۹۹۸ء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس گزشتہ ۲۵/اپریل ۹۸ء کو نئی دہلی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں اراکین عاملہ، ملک کے ممتاز دانشور، وکلاء، قائدین اور ارباب فکر ونظر نے موجودہ حالات کے تناظر میں مسلم پرسنل لا کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے طریقۂ عمل پر غور کیا، اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کو ملک گیر سطح پر چلانے اور مختلف مقامات پر دینی اجتماعات منعقد کرنے پر زور دیا اور یہ طے کیا کہ شریعت کے خلاف کوئی قانون قابل قبول یا قابل عمل نہیں ہے، اجلاس نے بابری مسجد کی حقیقت کے مقدمہ کی جلد از جلد سماعت کرانے کا بھی مطالبہ کیا اور اپنے اس موقف کا اظہار کیا کہ بابری مسجد، مسجد ہے، مورتیوں کے رکھ دینے سے مسجد کی مرکزیت ختم نہیں ہوتی، اجلاس نے اس نقطۂ نظر کا اظہار کیا کہ گفت وشنید کے ذریعہ بابری مسجد کے مسئلہ کا حل نہیں نکالا جا سکتا۔

اس کا حل عدالتی فیصلہ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اپنے اس قدیم موقف پر قائم ہے، اور بات

چیت کی تجاویز کو وہ مندر بنانے کا جزء سمجھتا ہے۔"

اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ مجموعہ قوانین اسلام کے مسودہ کو قطعیت دے کر زیر طباعت لانے کے اقدام کئے جائیں۔

صدر محترم نے اجلاس کے آخر میں فرمایا کہ اسلام اس ملک میں یوں ہی نہیں آیا بلکہ تقدیر الٰہی کے ساتھ آیا ہے، اللہ نے اپنی رحمت، تائید اور نصرت کے ساتھ اسلام کو بھیجا، اس دین کے ساتھ ہی اس ملک کی بہتری وابستہ ہے، اس ملک کی بقاء کے لئے یہاں کے رہنماؤں نے اس کو ضروری سمجھا کہ یہ ملک جمہوری، نامذہبی اور غیر متشدد ہو، یہ طے کرنا ایک الہامی بات تھی

انشاء اللہ اس ملک میں اسلام اپنی تمام خصوصیات اور اپنی تہذیب و تمدن کے ساتھ باقی رہے گا اور اس کے خلاف کی جانے والی تمام کوششیں ناکام ہوں گی۔

اجلاس میں ملت کے قائدین اس یقین کو مضبوط کریں اور پوری ملت میں یقین پیدا کرنے کی کوشش کریں۔"

ہم اس جائزہ کو ماہنامہ "نقیب" کے ایڈیٹر مولانا رضوان علی ندوی کے ایک اقتباس پر ختم کرتے ہیں:

"حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عہد صدارت میں بورڈ کے طریقۂ کار اور دائرۂ عمل میں بڑی وسعت ہوئی، اصلاح معاشرہ کی تحریک ہند گیر پیمانے پر چلائی گئی، خاص کر ۲۴ر نومبر ۹۵ء سے ۳۰ر نومبر ۹۵ء تک ملک کے بڑے بڑے شہروں میں "تحفظ شریعت ہفتہ" منایا گیا، جس سے مسلمانوں میں اسلامی

بیداری آئی، اسی طرح مسلمانوں کو اپنے عائلی مسائل کے حل کے لئے نظام قضاء کے قیام پر زور دیا، اور اس کے لئے رائے عامہ ہموار کیا۔ اس جد و جہد کے نتیجہ میں ملک کے بڑے اور اہم شہروں میں جیسے جنوبی دہلی، تھانہ (ممبئی) آکولہ، اندور وغیرہ میں دارالقضاء کا قیام عمل میں آیا ایک عرصہ سے ایک ایسے قانون فقہ اسلامی کی تدوین و ترتیب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس کے ذریعہ ملک کی عدالتیں اور قانوں داں حضرات اس سے استفادہ کرسکیں، چنانچہ حضرت صدر محترم کی سرپرستی اور حضرت امیر شریعت بہار واڑیسہ مولانا سید منت اللہ رحمانی کی رہنمائی میں بورڈ کے ممتاز فقہاء کرام کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اور تدوین کا کام کیا گیا، بحمد للہ اس وقت وہ مرتب شدہ حالت میں موجود ہے۔ اس کی طباعت و اشاعت کا نظم کیا جارہا ہے،
حضرت صدر محترم نے اپنا عالمانہ اور فاضلانہ مقدمہ بھی سپرد قلم کرکے اس کمیٹی کے کنوینر کے حوالہ کردیا ہے۔ مگر افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس کی طباعت سے پہلے وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، دہلی میں مرکزی دفتر کے لئے ایک کشادہ فلیٹ بھی حضرتؒ کی ایماء پر خریدا گیا۔"

حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے سترہ سال تک بورڈ کی قیادت وصدارت کا فریضہ سرانجام دیا۔ اور اس عرصہ میں برصغیر ہند و پاک میں اٹھنے والے تمام فتنوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ انھوں نے ۸ رسال مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی جنرل سکریٹری شپ میں اور نو سال تک موجودہ جنرل سکریٹری مولانا سید نظام

الدین صاحب کے عہد میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کی، ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ذہنی وفکری ہم آہنگی اور تعاون سے انہیں بڑی تقویت ملی، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کی قیادت سے بورڈ میں جتنا اعتماد ووقار پیدا ہوا، ملک کی تاریخ میں اتنا اعتماد کسی اور جماعت کو حاصل نہیں ہوا، جب بورڈ کا تیرہواں اجلاس ممبئی میں منعقد ہوا، اور صدر محترم اپنی شدید علالت اور ضعف وپیرانہ سالی کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اس کے باوجود اجلاس میں اتفاق رائے سے آپ ہی کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا، بعض ارکان نے تو یہاں تک کہا کہ آپ کی ذات اور شخصیت سے بورڈ کا وقار قائم ہے، بورڈ کے اس افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی قاضی شریعت نے فرمایا تھا کہ:۔

> ''بورڈ کے موجودہ صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات والاصفات عالم اسلام کے لئے عموماً اور مسلمانان ہند کے لئے خصوصا بہت بڑی نعمت ہے، جو اول دن سے اس کارواں کے سالاروں میں رہے ہیں، اور حضرت قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ ہی کی قیادت میں کامیابی کے ساتھ ہم یہ سفر طے کر رہے ہیں، شاہ بانو کیس اور بابری مسجد جیسے اہم مسائل میں ان کی مدبرانہ سرپرستی نے ہمیں صحیح سمت عطا کی، اور اس وقت نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ عالم اسلام کے لئے وہ ایک بڑی ضرورت تھی۔''

(ماخوذ از خطبہ افتتاحیہ ۱۲، تیرہویں اجلاس بورڈ ۲۸، ۲۹، ۳۰/ اکتوبر ۹۹ء ممبئی)

حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی فکری اور حکیمانہ قیادت سے مسلم پرسنل لا بورڈ کو نئے افق اور نئی وسعتیں عطا ہوئیں، یہ بورڈ کی ہی خوش قسمتی

تھی کہ اس کو ایک ایسا قائد ملا، جس نے تمام مسلک ومشرب اور فکر وخیال کے علماء و دانشوروں کو نظم واتحاد کے ساتھ ایک دھاگے میں پروئے رکھا اور ملت اسلامیہ کے دلوں میں اپنا وقار واعتماد قائم رکھا۔ مگر افسوس صد افسوس! ملت اسلامیہ کی عظمت و حرمت پر مر مٹنے کا جذبۂ صادق رکھنے والا یہ مرد مومن ۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء ۲۲/رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو اس وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملا جب کہ اس صدی کا آخری سورج نصف النہار کو پہنچ چکا تھا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

ترجمہ: یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

(سورہ آل عمران: ۱۹)

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

ترجمہ:۔ جوکوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

(سورہ آل عمران، پارہ ۳۔ رکوع ۱۷، آیت ۸۵)

حفظ ونشر توحید

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

بے خبر تو جو ہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

''خدا کا آخری پیغام ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا ایک نصب العین ہے جسے علامہ اقبال ''حفظ ونشر توحید'' کا نام دیتے ہیں۔ ہماری جد وجہد اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ نور توحید کا اتمام نہ ہو جائے۔''

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

آزاد ہندوستان میں
سرمایہ ملت کی نگہبانی سے متعلق
چند بیش قیمت اقتباسات جو شب تاریک میں
قندیل ایمانی کی حیثیت رکھتے ہیں

میں مسلمان ہوں

''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایات میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں''

(ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، فرقہ واریت مخالف کنونش نمبر، ص ۴۵)

اسلام کے احکام کوئی راز نہیں

''اسلام کے احکام کوئی راز نہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو، چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب وروز لوگ ان کا درس دیتے ہیں، پس گورنمنٹ کو چاہئے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کے لئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہوگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے بھی نہایت آسان ہو جائے گا کہ اپنا وقت بے سود شور وفغاں میں ضائع نہ کریں اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لئے پسند کریں۔''

(مسئلہ خلافت وجزیرۂ عرب ص ۲۰۴، ۲۰۵ طبع ثانی)

امارت شرعیہ کی ضرورت واہمیت

مسلمانوں کے مذہبی مقدمات کے فیصلہ کے لئے کسی شرعی عدالت یا دارالقضا کے نہ ہونے کی وجہ سے جو بدنظمیاں اور بے اعتدالیاں ہورہی تھیں اس کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۲ء میں تحریر فرمایا تھا:

''طلاق ونکاح وفسخ وتفریق کے ہزاروں معاملات جودن رات پیش آتے ہیں تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ان کا کوئی انتظام نہیں، اس کے لئے گورنمنٹ کی سول عدالتوں کو تکلیف کرنی پڑتی ہے جس میں ایک طرف تو عدالتوں کی اصول اسلامی سے ناواقفیت کی بنیاد پر نہایت شدید غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو ان کے مذہبی کام میں غیر مسلم عدالتوں کی مداخلت سے آزردگی اور ناگواری پیدا ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر علماء کے نزدیک ان معاملات میں غیر مسلم عدالتوں کا فیصلہ قبول کرنا ناجائز ہے''

''مسجدوں کے مقدمات پڑھیے، مقلد، حنفی، شافعی، قادیانی وغیرہ کے مقدمات کس کے سامنے پیش ہوتے ہیں، مسٹر جیمس کے سامنے آمین بالجہر اور بالسر کا کون فیصلہ کرتا ہے، مسٹر گھوش، نکاح وطلاق کے صحت وعدم صحت کا کون فرمان جاری کرتا ہے، ہرنام سنگھ، قرآن، کتب احادیث اور فتاویٰ فقہ کا کہاں ڈھیر لگتا ہے۔

''اوقاف کی حالت پر غور کرو۔ تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے کروڑوں روپئے کے اوقاف ہیں وہ انتظاماً جس طرح میرے ہاتھوں میں ہیں ان کا رونا ہر روز اسلامی اخبارات میں ہوتا ہے، جس کار خیر کے لئے وہ وقف ہیں اس میں ان کا کس قدر صرف ہوتاہے، وہ ذاتی جائداد کی طرح متولیوں کے موروثی قبضے میں ہیں اور روز بروز برباد ہوتے جارہے ہیں۔''

مذہب زندگی کا نگراں

''جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، مذہب کے ایک حقیر و ناچیز طالب علم کی حیثیت سے میں مذہب کے لئے یہ پوزیشن قبول نہیں کرسکتا اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات بھی مذہب کے لئے یہ پوزیشن نہیں پسند کریں گے کہ مذہب ہر تغیر کا ساتھ دے یہ کسی تھرمامیٹر کی تعریف تو ہوسکتی ہے کہ وہ درجہء حرات و برودت بتلائے یہ مرغ بادنما (WEATHER COC) کی بھی تعریف تو ہوسکتی ہے جو کسی ہوائی اڈے یا اونچی عمارت پر لگایا گیا ہے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ہوا کس طرف کی چل رہی ہے، لیکن مذہب کی تعریف نہیں ہوسکتی، میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مذہب کو اس کے بلند مقام سے اتار کر تھرمامیٹر یا مرغ بادنما کا مقام دینا چاہتا ہو کہ مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ صرف زمانے کی تبدیلیوں کی رسید دیتا رہے، اکنالج (ACKNOWLEDGE) کرتا رہے یا اس کی عکاسی کرتا رہے، صحیح آسمانی مذہب کے تو کیا کسی نام نہاد مذہب کے پیرو یا اس کے نمائندے بھی اس پوزیشن کو قبول کرلینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

مذہب تغیر کو ایک حقیقت مانتا ہے، اور اس کے لیے وہ ساری گنجائش رکھتا ہے، جو ایک صالح، صحیح، فطری اور جائز تغیر کے لیے ضروری ہوں، مذہب زندگی کا ساتھ دیتا ہے، لیکن یہ محض ساتھ دینا یا محض رفاقت اور پیروی نہیں ہے، بلکہ اسکے ساتھ ساتھ مذہب کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس کا فرق کرے کہ یہ صالح تغیر ہے، اور یہ غیر صالح تغیر ہے، یہ تخریبی رجحان ہے، اور یہ تعمیری رجحان ہے، اس کا نتیجہ انسانیت کے حق میں یا کم سے کم اس مذہب کے پیرووں کے حق میں کیا ہوگا؟ مذہب جہاں رواں دواں زندگی کا ساتھ دینے والا ہے، وہاں وہ زندگی کا محتسب، نگراں، گارجین (GUARDIAN) اور زندگی کا اتالیق بھی ہے۔

گارجین کا کام یہ نہیں ہے جو ہستی اس کی اتالیقی میں ہے، اس کے ہر صحیح غلط رجحان کا ساتھ دے اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرے، مذہب ایسا سسٹم نہیں ہے کہ جہاں ایک ہی قسم کی مہر رکھی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی روشنائی ہے، اور ایک ہی طرح کا ہاتھ ہے، جو دستاویز اور تحریر آئے مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کردے۔

مذہب پہلے اس کا جائزہ لے گا، پھر اس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گا، اور ترغیب کے اور بعض اوقات مجبوراً ترہیب کے ذریعہ اس سے اسے باز رکھنے کی کوشش کرے گا اور اگر کوئی ایسی غلط دستاویز اس کے سامنے آئی ہے، جس سے اس کو اتفاق نہیں یا جس کو وہ انسانیت کے حق میں مہلک اور تباہ کن سمجھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کرے گا، بلکہ اس کی بھی کوشش کرے گا وہ اس کی راہ میں مزاحم ہو۔

یہاں اخلاقیات اور مذہب میں ایک فرق پیدا ہوجاتا ہے، مذہب اپنی ذمہ داری اور فرض سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کو روکے، ماہر اخلاقیات ونفسیات کی ڈیوٹی صرف یہ ہے کہ وہ غلط رجحانات کی نشاندہی کردے، یا اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرے۔ لیکن مذہب اس کی کوشش کریگا کہ وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوجائے۔

شریعت سراسر رحمت ہے

''میرے دینی بھائیو اور دوستو!

اپنے اپنے زمانہ میں اللہ کے سب پیغمبروں نے اور سب سے آخر میں اس کے آخری رسول سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آخری کتاب قرآن مجید نے اس طریقہ کی دعوت دی ہے جس پر چل کر اللہ کے بندے اس کے قہر وجلال سے بالکل محفوظ ہو جائیں اور دنیا میں بھی اُس کے فضل کے اور آخرت میں اس کی اس کا مل رحمت کے مستحق ہو جائیں جس کا ظہور آخرت اور جنت ہی میں ہوگا۔ اسی طریقہ کا نام شریعت ہے، اللہ تعالیٰ نے شریعت اس لیے نازل نہیں کی ہے کہ اُس کو ہمارے پابند کرنے سے کوئی دلچسپی ہے یا ہمارے شریعت پر چلنے سے اُس کا ذرہ برابر نفع ہے وہ غنی عن العلمین ہے۔ ایک حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ اگر سارے بندے شیطان کی طرح اللہ کے سخت نافرمان ہو جائیں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی شان عظمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آئے گا۔ شریعت تو اللہ تعالیٰ نے صرف اس لیے نازل کی ہے اور ہمیں اس پر چلنے کا صرف اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس کی رحمت کاملہ کے مستحق ہو جائیں۔ تو شریعت تو ہمارے لیے سرار رحمت ہے اور اس سے ہماری تکمیل ہی مقصود ہے۔

شریعت کا مقصد

''شریعت کا مقصد ایک عالی مرتبہ کے الفاظ میں ''سعادۃ الدارین'' ہے (ردالمحطار ص ۲۷ ج ۱)۔ یعنی صرف دنیا میں ہی نہیں بلکہ دونوں جہان میں انسان کو کامرانیوں سے ہمکنا کرنا ہے، یہی وہ فرق ہے جو آج کے قانون ساز اداروں، پارلیمنٹوں اور اسمبلیوں سے شریعت کو ممتاز کرتا ہے، اوپر کی تفصیل سے چونکہ یہ بات سامنے آگئی

کہ شریعت کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اس لئے شریعت کے قوانین میں وہ تقسیم نہیں ہے جو آج کی بیشتر حکومتوں کے دستوروں میں پائی جاتی ہے کہ ایک قسم کو ''پرسنل لا'' (Personal Law) یا ''احوال شخصیہ'' کا نام دیا جاتا ہے، جس کا تعلق کسی انسان کی شخصی اور عائلی زندگی سے ہوتا ہے، پھر غلط طور پر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا اس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار شخص کو حاصل ہے، اور ایک قسم ''مشترک قانون'' (Common Law) کے نام سے معروف ہے، اور کہیں کسی اور نام سے حالانکہ انسانی مسائل خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، تمدنی ہوں یا مالی، ثقافتی ہوں یا تعزیراتی سب کا حل اسلامی شریعت نے یکساں طور پر پیش کی ہے، اور ہر ماننے والے پر تمام احکام کی پیروی کو ضروری قرار دیا ہے، یہاں اس میں کوئی شخص اختیار والا قانون ہے ہی نہیں۔ ❁ ❁

شریعت پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کرتی ہے

''شریعت کے اصولوں میں ایسی گہرائی و گیرائی اور لچک ہے کہ ان کی روشنی میں ہر زمانہ حتی کہ آج کے ترقی پذیر دور میں بھی پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کیا جاسکتا ہے، اور یہ صرف خوش کن دعوے نہیں بلکہ ہر زمانہ میں ماہرین شریعت (فقہاء) نے اس کا عملی مظاہرہ کیا ہے، جس پر تاریخ شاہد ہے۔ دور اول (خلافت راشدہ، خلافت امویہ، خلافت عباسیہ کی ابتداء) میں جب اسلامی حکومتوں کا سایہ جزیرۃ العرب سے نکل کر افریقہ، ایشیا، بلکہ یورپ تک پھیل گیا تھا، اور طرح طرح کے تمدنی، معاشرتی، معاملاتی اور نئے نئے مسائل کا سامنا ہوا تو اس محترم گروہ (فقہاء) نے ان کا حل ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر پیش کیا جس سے حکومتوں اور عوام کو کسی اور کا دست نگر ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اس دور میں ائمہ اربعہ اور ان کے ممتاز ترین تلامذہ کے کارہائے نمایاں پر اجمالی نظر ڈالنے سے ہی مذکورہ دعوے کی

تصدیق تاریخ کے سلسلہ (جو "فجر الاسلام"، "ضحیٰ الاسلام"، کے نام سے معروف اور ہر جگہ دستیاب ہے) کا مطالعہ کرنا چاہیے، نیز راقم الحروف کی "تاریخ دعوت وعزیمت" کے پہلے دو حصے اور "کشف الظنون"، "مفتاح السعادۃ" وغیرہ دیکھنی چاہیے۔ ۞۞۞

منقسم ہندوستان میں "اسلامی شریعت"

...... تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے اندر رہ جانے والے مسلمانوں کو جن مصائب اور صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑا ان میں جان ومال وآبرو کے زیاں کے علاوہ سب سے زیادہ روح فرسا اور پریشان کن ان کے دین و مذہب پر عمل کی آزادی سے محرومی کا خطرہ رہا ہے، کیونکہ ہندو احیاء پرستی (ہندتو) کی جارحانہ تحریکوں نے پورے ملک کو "بھگوا رنگ" میں رنگ دینے بلکہ غرق کردینے اور مسلمانوں کا تشخص ختم کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے، جس کی لے کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی دھیمی، (غالباً یہ زیر وبم بھی ان کی اپنی مصلحت کے تقاضوں پر مبنی ہوتا ہے)، رواں صدی کے آٹھویں دہے میں نہایت زور وشور کے ساتھ جب یہ تحریک چلائی گئی تو اس وقت ملت اسلامیہ کے بیدار مغز صاحب بصیرت افراد۔ جن میں علماء سرفہرست تھے۔ نے "مسلم پرسنل لا بورڈ" کی تشکیل کی، جس کے قیام ومساعی سے کسی نہ کسی درجہ میں اس زور میں کمی آگئی تھی، مگر پھر بھی بعض ہندو احیاء پرست جماعتوں کے سیاسی طور پر طاقتور بن جانے کی وجہ سے بے شمار خطرات، امکانات اور اندیشوں کے دائرہ سے باہر نکل کر واقعات کی شکل میں رونما ہونے شروع ہو گئے، مثلاً شریعت اسلامی پر مشتمل عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) پر کھلم کھلا نہ صرف زبانی وتحریری حملے شروع کردیئے گئے بلکہ "مسلم پرسنل لا" میں ترمیم کر کے اسے ختم کردینے کے عملی اقدامات ہونے لگے، چنانچہ مہاراشٹر اسمبلی کے اندر ۱۹۹۵ء میں پاس کئے گئے چند بل اس کا نمونہ ہیں، علاوہ ازیں "مسلم پرسنل لا" (جو شریعت کے قوانین کا بہت تھوڑا

حصہ ہے، تفصیل آگے آرہی ہے) کو ختم کرنے یا نادانستہ۔اقدامات ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے ججوں کے بعض فیصلوں میں بھی صاف نظر آتے ہیں۔

یہ صورت حال اور بھی زیادہ پریشان کن ہے، مزید برآں یہ کہ مختلف پلیٹ فارموں سے آئے دن ''یکساں سول کوڈ'' (Uniform Civil Code) نافذ کرنے کی آوازیں اٹھتی رہتی یا اٹھائی جاتی رہتی ہیں، اس کا حاصل بھی ''مسلم پرسنل لا'' ختم کرنے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

''مسلم پرسنل لا'' اور ''یکساں سول کوڈ'' کا تعارف

ملکی دستور سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی یہ جانتے ہیں کہ ملک میں رائج قوانین کی دو اہم قسمیں ''سول کوڈ'' (Civil Code) اور ''کریمنل کوڈ'' (Criminal Code) کہلاتی ہیں، دوسری قسم کے اندر جرائم کی سزائیں اور بعض انتظامی امور آتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کے قوانین تمام اہل ملک کے لئے یکساں ہیں، اس میں کسی نوعیت کی تفریق نسل و مذہب کی بنیاد پر از روئے دستور نہیں کی گئی ہے۔

پہلی قسم (Civil Code) کے دائرہ میں وہ تمام قوانین آتے ہیں جن کا تعلق معاشرتی، تمدنی، معاملات سے ہے، اس قسم کے بیشتر قوانین بھی تمام اہل ملک کے لئے یکساں ہیں۔

''مسلم پرسنل لا''

البتہ اس قسم سول کوڈ۔ کے ایک حصہ (جسے پرسنل لا Personal Law کہتے ہیں) میں ملک کی بعض اقلیتوں کو جن میں مسلمان بھی ہیں، ان کے مذاہب کے لحاظ سے کچھ خصوصی شعبوں میں الگ مذہبی قوانین پر عمل کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہے، اسی کو ''پرسنل لا کی آزادی'' کا نام دیا جاتا ہے، اسی کے تحت مسلمانوں کو بھی دستور ہند

میں یہ حق دیا گیا ہے کہ نکاح، طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مباراۃ (خلع ہی کی ایک قسم ہے) فسخ نکاح، عدت، نفقہ، وراثت، وصیت، ہبہ، ولایت، رضاعت، حفاظت، وقف (خیراتی و غیر خیراتی) سے متعلق مقدمات اگر سرکاری عدالتوں میں دائر کیے جائیں اور دونوں فریق مسلمان ہوں تو سرکاری عدالتیں اسلامی شریعت کے مطابق ہی مذکورہ معاملات میں فیصلے کریں گی۔ ان ہی قوانین کا مجموعہ "مسلم پرسنل لا" کہلاتا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سامنے رکھنے کے بعد یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں رہ جاتی کہ "مسلم پرسنل لا" جن احکام یا "موضوعات" سے عبارت ہے وہ بھی دیگر شرعی قوانین کی طرح کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، بلکہ اسے ایک امتیاز یہ حاصل ہے کہ اس سلسلہ میں بیشتر احکام براہ راست قرآن مجید میں مذکور ہیں (حالانکہ قرآن مجید میں عموماً اصولی ہدایات دی گئی ہیں مگر اس بارے میں تفصیلات ملتی ہیں جن سے اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے)۔

مثلاً نکاح وطلاق سے متعلق احکام قرآن مجید کی پانچ سورتوں۔ بقرہ، نساء، نور، احزاب، طلاق۔ کی تقریباً تیس آیتوں میں، وراثت کے احکام سورۂ نساء کے تقریباً پورے ایک رکوع میں یکجا بیان ہوگئے ہیں، اور بعض اسی سورہ کے آخر میں۔

زوجین کے حقوق و فرائض کی تفصیلات بھی متعدد سورتوں (بقرہ، نساء، احزاب، طلاق وغیرہ) میں بیان ہوئی ہیں، اور ایسی احادیث صحیحہ کا تو شمار ہی مشکل ہے جن میں مذکورہ احکام بتائے گئے ہیں۔

مقام غور ہے کہ اگر خدانخواستہ "مسلم پرسنل لا" ختم کر کے "یکساں سول کوڈ" نافذ کیا جاتا ہے تو قرآن مجید کی تقریباً چالیس آیتوں اور سینکڑوں احادیث پر عمل سے مسلمانوں کو جبراً محروم ہونا پڑے گا، کیا کوئی حساس مسلمان یہ خسارہ برداشت کر سکتا ہے؟

''یکساں سول کوڈ''

مذکورہ تفصیلات سے یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہ رہا ہوگا کہ ملک کے اندر جاری ہزاروں ہزار قوانین میں سے صرف چند میں ہی (جن کا ذکر اوپر آیا) مسلمانوں کو اپنی شریعت پر عمل کرنے کا دستوری حق دیا گیا ہے، اسے بھی چھین لینے کی کوشش کی جارہی ہے، اغیار کی پوری کوشش کہ مسلمانوں کو ان چند امور میں بھی۔ ان قوانین کی پابندی پر قانوناً مجبور کیا جائے جو تمام اہل ملک لئے بنائے جائیں، اسی کو'' یکساں سول کوڈ'' (Uniform Civil Code) کا نام دیا جاتا ہے۔

مسلم پرسنل بورڈ کا پہلا اجتماع اور تمہیدی بیان

جب مسلمانان ہند کی مخصوص ملّی شخصیت اور انفرادیت کھلے ہوئے خطروں اور حملوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی۔ طرح طرح کے ہتھکنڈے اور یہ سطح کے منصوبہ بند طریقے اس کے تشخصات کو فنا کر دینے اور اول سے آخر تک اکثریت کا ہم رنگ ضمیمہ بنا دینے کے لئے استعمال ہو رہے تھے۔ تو مسلمانوں کے بیدار مغز لوگوں نے جمہوری ملک میں جمہوری طرز پر اس کے سد باب کی کوششیں تیز روکیں، اور اس مقصد کے پہلے قدم کے طور پر ایک مختصر سا اجتماع ۱۴ ؍ ۱۵ ؍ مارچ کو دارالعلوم دیوبند میں ہوا اس نے اسی مسئلہ پر ایک تمہیدی بیان جاری کیا، اس بیان سے مسئلہ کی ماھیت وحقیقت اور علماء کے موقف کو سمجھنے میں بخوبی مدد مل سکتی ہے۔ ذیل میں بیان کا پورا متن پیش کیا جاتا ہے۔

اس صورت حال پر نظر کرتے ہوئے یہ بات بہت ہی اطمینان آفریں ہے کہ ہندوستان میں علم دین کے سب سے بڑے مرکز۔ دارالعلوم دیوبند۔ کے سربراہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے ملت کے علماء اور راسخ العقیدہ ارباب

فکر و دانش کا ایک نمائندہ اور ہمہ گیر اجتماع کرنے کی طرف قدم اٹھایا اور اس مقصد کے پہلے قدم کے طور پر جو ایک محدود اور مختصر سا اجتماع ۱۴،۱۵؍مارچ کو دارالعلوم دیوبند میں ہوا اس نے مسئلہ پر اپنا ایک تمہیدی بیان جاری کر کے کم از کم اس طرح کی غلط فہمیوں کے ازالہ کا مکمل سامان اس پہلے ہی قدم پر کر دیا۔ ضرورت ہے کہ اس بیان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے اور جو لوگ مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ علماء کے موقف کو سمجھنے میں اس بیان سے مدد لیں۔ بیان کا پورا متن حسب ذیل ہے:۔

''مسلم پرسنل لا'' کا مسئلہ کچھ عرصہ سے ملک میں معرض بحث بنا ہوا ہے۔ اس بارے میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر اور موصوف ہی کی صدارت میں دارالعلوم دیوبند کے لائبریری ہال میں مورخہ ۱۴،۱۵؍مارچ ۷۲ء کو ہندوستان کے معزز علماء ماہرین قانون، اور فضلاء کا اجتماع منعقد ہوا جس نے دو دنوں تک مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اور زیر بحث مسئلہ کا پوری فکری سنجیدگی کے ساتھ آئینی، سیاسی اور فقہی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا۔ پوی بحث و گفتگو کے بعد یہ اجتماع اپنے مندرجہ ذیل یقین و احساسات کا اظہار کرتا ہے:۔

۱

اسلام ایک مکمل دین ہے جس کا نظام انسانی زندگی کے تمام ہی شعبوں پر حاوی نیز ہر دور اور ہر ملک کے لیے یکساں طور پر فلاح کا ضامن ہے..... اسلام کی بنیادی کتاب قرآن کریم ہو۔ اور نظامِ اسلامی کی واضح اور کامل تعبیر و تشریح سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جن جزئی مسائل و حوادث کا ذکر قرآن و سنت میں نہیں ائمہ مجتہدین اور صاحب فقہائے اسلام نے قرآن و سنت کے دیے ہوئے اصول و نزامد کلمہ کی روشنی میں ان کا حل تجویز کیا جس نے ''اجماع'' او ''قیاس'' کی بنیادیں

فراہم کیں۔ اس طرح فقہ اسلامی مرتب ہوئی جس کے مصادر ''کتاب وسنت'' کی بنیادی فراہم کیں۔ اس طرح فقہ اسلامی مرتب ہوئی جس کے مصادر ''کتاب و سنت'' اور کتاب وسنت کی ہی روشنی میں مستنبط اصول ''اجماع'' اور ''قیاس'' قرار پائے۔

۲

یہ اجتماع یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ فقہ اسلامی ایک زندہ قانون ہے جس میں حالات وزمانہ کی رعایت، عرف وعادت کا اعتبار، ضرر وحرج کا دفعیہ اور شرعی نقطۂ نظر سے قابل اعتبار مصالح کے لحاظ کے قیمتی اصول موجود ہیں جن کی وجہ سے فقہ اسلامی کسی زمانہ میں بھی جمود کا شکار نہیں ہوسکتی۔

۳

اس اجتماع کے نزدیک یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی عہد اقتدار میں ملک کی بسنے والی مذہبی اکائیوں کو کچھ محدود معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل پیرا رہنے کی آزادی حسب سابق حاصل رہی اور یہ بات بطور اصول تسلیم کرلی گئی کہ ان مخصوص معاملات میں مسلمانوں پر شرع اسلامی کے قوانین جاری رہیں گے۔ اور ہندوؤں پر دھرم شاستر۔ اور یہ بھی واضح کردیا گیا کہ شرح اسلامی کے خلاف علاقائی یا قبائلی رسوم باطل تصور کیے جائیں گے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ دستور ہند نے مذہبی آزادی کو شہریوں کا بنیادی حق تسلیم کیا اور مسلمانوں پر مسلم پرسنل لا نافذ تسلیم کیا گیا۔

۴

مسلم پرسنل لا کے تحت جو معاملات آتے ہیں اور جن کے بارے میں اصولی طور پر قانون شریعت نافذ ہے، اس اجتماع کے خیال میں یہ وہ خالصۃً مذہبی معاملات ہیں، جن پر اُمت کی امتیازی حیثیت اور ملّی و تہذیبی انفرادیت کی بقا موقوف ہے.....لہذا قانون شریعت (مسلم پرسنل لا) کے بجائے مشترک سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش یا بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو ختم کرنا ہوگا بلکہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت ہوگی اور آئین ہند میں دی ہوئی مذہب وتہذیب کی آزادی پر حملہ ہوگا۔ یہ اجتماع اس روش کی مذمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور کسی قیمت پر اسے گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

۵

بدقسمتی سے ملک کا ایک خاص طبقہ العیاذ باللہ شرع اسلامی کو ہی ناکارہ اور ظالمانہ قرار دینے کی کوشش کر رہا ہے اور اس طرح مسلم پرسنل لا اور قانون شریعت کے خلاف آواز اُٹھا کر مشترک سول کوڈ کی صورت میں غیر اسلامی عائلی قوانین کے نفاذ کے لیے میدان ہموار کر رہا ہے یا پھر مبہم اصطلاحات کا سہارا لے کر منصوص احکام شرعیہ ہی کو بدل دینا چاہتا ہے۔ اس اجتماع کے خیال میں یہ روش نہ صرف علماء اور امت اسلامیہ بلکہ ہر انصاف پسند شہری کی طرف سے قابل مذمت ہے۔

۶

اس اجتماع کو اس امر پر یقین کہ فقہ اسلامی ایک زندہ قانون، اور علمائے

اسلام کے ہاتھوں میں قرآن وسنت سے مستنبط اصول وکلیات اور مسائل مستنبطہ کی نظائر موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ شرع اسلامی میں مصالح معتبرہ کا معیار کیا ہے؟ کس درجہ کی ضرور حرج کا دور کرنا شرعاً مطلوب ہے؟ عرف و عادت کی قوانین میں کیا اہمیت ہے؟ اور تعبیر احوال کا کیا اثر احکام پر پڑتا ہے؟

انہیں اصولوں پر علماء وفقہاء اسلام نے ہر دور میں مسائل کا حل کیا ہے اور آج بھی انہیں اصولوں کے پیش نظر ہر نئے مسئلہ کا حل اور معاشرہ میں پیدا ہونے والی واقعی مشکلات دور کی جاسکتی ہیں۔

۷

پس موجودہ حالات میں جبکہ شرع اسلام کو ہی مجروح کرنے کی مذموم کوششیں کی جارہی ہیں اس اجتماع کے نزدیک علماء وفقہاء اسلام کا یہ فریضہ ہے کہ وہ مجتمع ہوکر جملہ احکام ومسائل پر غور فرمائیں اور بدلی ہوئی معاشرت کا جائزہ لیں اور جہاں واقعۃً ایسی دشواریاں معاشرہ میں پیدا ہوگئی ہیں جنکو دور کرنا شرعاً ضروری ہوتو انہیں قواعد وکلیات شرع کی روشنی میں دور کرنے کی صورت تجویز کریں اور جو سوالات محض غیر اسلامی تصورات کے نتیجہ میں سامنے آرہے ہوں انہیں وضاحت کے ساتھ رد فرمادیں، اس طرح اس فتنہ کا سد باب فرمادیں جوان کی خصوصی ذمہ داری ہے۔

یہ اجتماع اس سلسلہ میں ایک بڑے اجتماع کے انعقاد کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے جو بلا لحاظ اختلافِ مسلک تمام ہی مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہو۔ اور صدر اجتماع سے درخواست کرتا ہو کہ وہ اس اجتماع کے انعقاد کے لیے تیاری کمیٹی کی تشکیل فرمادیں۔"

”مسلم پرسنل لابورڈ“ کا طریقۂ کار

”مسلم پرسنل لابورڈ ہندوستان میں ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے شریعت اسلامی کے احکامات کے دائرے میں دستوری اور جمہوری طریقہ کار ہی کو اختیار کرنا مناسب اور بہتر سمجھتا رہا ہے۔اور یہی اس کے پیش نظر اب بھی ہے ملت کے مسائل کو دیگر مختلف طریقوں سے حل کرنے کے لئے مسلمانوں کی سیاسی جماعتیں ہوسکتی ہیں ان کی ایک مشترک جماعت ”مسلم مجلس مشاورت“ اور کچھ مدت سے ”آل انڈیا ملی کونسل“ بھی ہے جو اپنے اپنے انداز سے ذمہ داریاں انجام دیتی ہیں، مسلم پرسنل لابورڈ ان جماعتوں سے مخاصمت نہیں رکھتا کیوں کہ ہر ایک کا اپنا طریقۂ کار ہے پرسنل لابورڈ کے متعدد ذمہ دارارکان بھی ان جماعتوں میں ہیں جو ان کے پلیٹ فارموں سے طریقۂ کار کی ترجمانی کرتے ہیں، بورڈ کے اور ان تنظیموں کے بعض اوقات ایک جگہ جلسے ہونے سے یہ اشتباہ اور قوی ہوجاتا ہے، میں نے پرسنل لابورڈ سے اپنے کو اس وجہ سے وابستہ رکھا ہے کہ وہ ملت کا ایک فعال اور نمائندہ پلیٹ فارم ہے اور زیادہ تر علماء پر مشتمل ہے اور اس کا مرکزی موضوع حفاظت قانون شریعت ، اصلاح معاشرہ اور مسلمانوں میں دینی، ملی اور معتدل اور تعمیری سیاسی شعور پیدا کرنا ہے۔“

حفاظت دین وملت کا مورچہ

مورچے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک فوجی اور زمینی مورچہ، دوسرے معنوی مورچہ، فوجی وزمینی مورچہ بھی بہت اہم ہے، اور زندہ وغیور قومیں اس پر گھٹنے ٹیک دیتی ہیں اور اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دیتی ہیں، مگر یہ مورچہ قومی زندگی میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا، قوموں کی زندگی میں میدان جنگ کی شکست یا کسی مورچے سے پسپائی ان کی قسمت پر مہر نہیں لگا دیتی، دنیا میں قومیں شکست بھی کھاتی رہی ہیں، اور فتح بھی حاصل کرتی رہی ہیں، اپنے مورچوں سے ہٹی بھی رہی ہیں، اور ان کو واپس بھی لیتی رہی ہیں، عہد نبویؐ، دورِ صحابہؓ اور تاریخ اسلام کے ہر عہد میں یہ نشیب وفراز اور یہ سرد وگرم پیش آتے رہے ہیں اور جو قوم اس نشیب وفراز سے نہیں گزرتی اور شکست کی تلخی سے اس کے کام ودہن کبھی آشنا نہیں ہوتے وہ صرف فتح کی لذت وحلاوت سے آشنا ہوتی ہے اس قوم کی صلاحیت پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس لیے قوموں کی تربیت کے لیے یہ دونوں تجربے ضروری ہیں اور خدا نے اپنے محبوب پیغمبروں اور اس کے برگزیدہ اصحاب کو ان دونوں راستوں سے گزارا ہے۔

لیکن معنوی مورچوں کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے، کسی معنوی مورچہ پر شکست وپسپائی بعض اوقات صدیوں وہزاروں برس کا فیصلہ کر دیتی ہے اور بعض اوقات اس سے کسی قوم وملت کی قسمت پر مہر لگ جاتی ہے، آج ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ کو یہی معنوی مورچہ درپیش ہے، ملت کی جداگانہ شخصیت کا مورچہ، اسلام کی مستقل تہذیب کا مورچہ، اسلام کے عائلی قانون (پرسنل لا) کا مسئلہ، زبان وکلچر کا مسئلہ، آئندہ نسلوں کی تعلیم کا مورچہ، ان مورچوں کی حفاظت ''خواص'' ہی

کر سکتے ہیں، اس کے لیے جس علم، جس فہم، جس احساس، جس دروں بینی، اور حقیقت شناسی اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے جن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ اسی طبقہ کے پاس ہیں، ان کی بروقت فرض شناسی اور مستعدی، ان کی بے چینی اور دردمندی مدتوں کے لیے اس خطرہ کو ٹال سکتی ہے، اور ملت کو اس خطرے سے محفوظ بنا سکتی ہے اور ان کی ذرا سی غفلت و سستی ملت کے قافلہ کو سالوں اور صدیوں کے حساب سے منزل سے دور کر سکتی ہے، انہوں نے اگر اپنے ذاتی مقاصد و مفادات کو ملت کے مفاد پر، اپنی ذات کو پیش آنے والے دور از کار خطرات کو ملت کے حقیقی خطرات پر ترجیح دی تو ان مورچوں پر شکست یقینی ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے

''انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی، بیشک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے، لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں پھر دہکتی ہیں اور شعلے بن کر مختلف طاقتوں کو نذر آتش کر دیتی ہیں، اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالف انقلابات طاقتوں کا ضمیمہ بنکر وہ بھی نذر آتش ہو جائیں یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں، اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی طاقت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انہی پسماندہ قوموں ہی میں ہو جن کے لئے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لئے طے ہو چکی ہے۔ (خطاب اجلاس جمعیۃ العلماء)

''مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی کا ایک ہی سبب

''مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی کا ایک ہی سبب ہے، اور وہ ہے ان کا وقت اور فوری جوش، وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں، لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر، جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے، وہ بجلی کے مثل ایک آن میں خیر من کو خاک سیاہ کر سکتے ہیں لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانے نہیں ڈھو سکتے، وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں، لیکن منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لئے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے ہیں، یہ ان سے ممکن تھا کہ محمد علی اور ابوالکلام کے دائیں بائیں گر کر جان دیتے، لیکن ان کے کہ مسلسل آئینی جدوجہد سے ایران اسلام کو چھڑائیں۔ (شذرات معارف اکتوبر ۱۹۱۷ء ص ۲۴۲)

ایک ہی لائحہ عمل.........ایک ہی راستہ

شریعت کا نفاذ.........شریعت کی پیروی

''اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے .....اور وہ وہی ہے جس کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددین امت نے عمل کیا، یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادّی، سیاسی غلبہ کی کوشش کرنا۔

اسی طرح مسلمانوں کی منزل مقصود کا بھی صرف ایک راستہ ہے اور وہی راستہ ہے جس سے امت کا پہلا قافلہ منزل تک پہنچا ہے ''لن یصلح اخر هذه الأمة الا ما اصلح اولها'' اس امت کے پچھلوں کی اصلاح صرف وہی چیز آسکتی ہے جس نے اس کے اگلوں کی اصلاح کی تھی، یعنی دین خالص اور اس کی پیروی۔''

اجلاس ہفتم

خطبۂ صدارت

منعقدہ ۶/۷/اپریل ۱۹۸۳ء کلکتہ

''اس وقت ہندوستان میں دعوت اسلامی کو نقصان پہنچانے اور گمراہی کی طرف لے جانے والی طاقتیں بہت سرگرم عمل ہیں اور ہندوستان کو دوسرا اسپین بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، لہذا ہمارے ارکان حالات کے اتار و چڑھاؤ پر نگاہ رکھیں اور مایوس نہ ہوں۔''

(ماخوذ از رجسٹر کارروائی مجلس عاملہ بورڈ ۲۳ر نومبر ۹۷ء)''

اجلاس مسلم پرسنل لا بورڈ-کلکتہ

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد و الہ و صحبہ اجمعین و من تبعھم باحسان و دعابدعوتھم الیٰ یوم الدین

حضرات!

سب سے پہلے میں اس بات پر معذرت کرتا ہوں کہ میں اس اہم موقع پر کوئی لکھا ہوا خطبہ پیش نہیں کر رہا ہوں، میں تھوڑے وقفہ سے اندرونی اور بیرونی سفروں میں مشغول رہا اور مسلسل انہماک اور مصروفیت رہی، لیکن اس غیر ارادی اور اضطراری کوتاہی میں خیر کا بھی ایک پہلو ہے، تیار کئے ہوئے بلند پایہ خطبہ ہائے صدارت کی افادیت اور اہمیت کو کم کئے بغیر جواب ہماری علمی، ادبی و سیاسی تاریخ کا جز بن گئے ہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ بعض مرتبہ خطبۂ صدارت کل کا کل یا اس کا کوئی جز بے محل یا بعد از وقت ثابت ہوتا ہے اور حالات میں تغیر کی وجہ سے اپنی تازگی اور برجستگی کھو چکا ہوتا ہے، اس لئے شاید اس میں بھی حکمت الٰہی کو دخل ہو کہ اس

فضا میں تازہ حالات کے مطالعہ کے بعد آپ سے براہ راست خطاب کر رہا ہوں۔

مسلم پرسنل لا کی مخالفت میں غلط فہمی اور زیادہ تر ناقص واقفیت کو دخل ہے

حضرات! کسی بھی مسئلہ سے اختلاف یا کسی حقیقت سے گریز اور مخالفت کا باعث صرف مخالفت کا جذبہ، عناد یا سیاسی مصالح اور مفادات ہی نہیں ہوتے، اکثر غلط فہمی یا ناواقفیت یا ناقص واقفیت (جسے میں ناواقفیت سے زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں) اس کی ذمہ داری ہوتی ہے، افراد اور خاندانوں کی سطح پر بھی، ملتوں اور قوموں کی سطح پر بھی اور ملکوں اور سلطنتوں کی سطح پر بھی ایسی غلط فہمیاں، ناواقفیت اور ناقص واقفیت بڑے اہم اور سنگین نتائج کا سبب بنی ہے اور قوموں، تہذیب وتمدن، سلطنتوں اور مذاہب کی تاریخ اس کی شہادتیں پیش کرتی ہے کہ بعض مرتبہ کسی غلط فہمی، ناواقفیت یا ناقص واقفیت کی بنا پر بے ضرورت جنگیں برپا ہوگئی ہیں، سلطنتیں سلطنتوں سے ٹکرائی ہیں اور بعض اوقات وحشتیں وحشتوں سے نہیں وحدتیں وحدتوں سے ٹکرائی ہیں۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں بھی نہ ہم کو اس کی ضرورت ہے نہ اس کا شوق ہے کہ ہم ان سب لوگوں کے بارے میں جو ملت اسلامیہ کے دائرے سے باہر ہیں، یا ان گروہوں، عناصر یا مکاتب خیال پر جو مسلم پرسنل لا کے مخالف ہیں اور جو ہندوستان پر یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کے داعی اور اس کے حامی ہیں، یہ الزام لگائیں کہ اُن میں مخالفت ہی کا جذبہ یا عناد کام کر رہا ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں غلط فہمی اور زیادہ تر ناقص واقفیت کو دخل ہے۔

دو حقیقتیں

مسلمانوں کے عائلی قانون کی اہمیت اور صحیح حیثیت کیا ہے؟ اس کے

متعلق میں دو حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اُن سب حضرات کو جو مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے عادی ہیں اور ان میں حبُّ الوطنی کا جذبہ ہے اور ان کا ذہن تخریبی (DESTRUCTIVE) نہیں بلکہ تعمیری (CONSTRUCTIVE) اور حقیقت پسند (REALISTIC) واقع ہوا ہے اور وہ صداقت کو قبول کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں، دو بنیادی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اس موقر مجلس کے توسط سے صحافت اور ابلاغ عامہ (PUBLIC MEDIA) کے سنجیدہ اور ذمہ دار ذرائع سے میں اپنی آواز دور دور تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

اصلی غلطی دین اور غیر دین میں فاضل امتیازی نشان کا ختم ہونا ہے

ا۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDIES) کی روشنی میں جس کا میں ایک طالب علم ہوں، ان تمام آسمانی مذاہب کے بارہ میں کہہ سکتا ہوں جو صحیفے رکھتے ہیں اور جن کے یہاں نبوت کی تاریخ ہے لیکن میرے لئے زیادہ محتاط صورت یہ ہے کہ میں اس دین کی طرف سے عرض کروں جس سے میرا اور آپ کا انتساب ہے کہ اس کی ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں کے ذریعہ سماجی خدمتگاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (REFORMERS) یا بانیانِ سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظام فکر، دبستان (SCHOOL OF THOUGHT) اور خالص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل سرحدی لکیر (LINE OF DEMARCATION) ہے جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس

خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) اُن برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (CONFUSION) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب و تمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقے پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حد فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام کا بنیادی چشمہ انسانی دماغ نہیں بلکہ خالق کون و مکاں ہے

فلسفہ، سماجیات کا علم (SOCIAL SCIENCES) تہذیب و تمدن CIVILIZATION) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب و تمدن اور فکر و دانش کا ایک مستقل مدرسہ (SCHOOL OF THOUGHT) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک دین ہے، اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام

ہیں، اور یہ اُن کی زبان اور اُن کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لئے اسی درجہ قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لئے اور سارے امتیوں کے لئے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۔

(سورہ النجم : ۳،۴)

''وہ خواہش نفس سے منھ سے بات نہیں نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔''

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ (سورہ الشوریٰ : ۵۲)

''آپ نہیں جانتے تھے کہ لکھنا پڑھنا کیا ہوتا ہے، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اُتارا، اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بیشک اے (محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔''

اچھے اچھے سنجیدہ اہل علم اور اہلِ فکر اس مغالطہ میں ہیں، اس پر انھوں نے اپنی عمریں گذار دیں، ایک کتب خانہ تیار ہو گیا، اور اس نے غیر ضروری طور پر ایک مہم اور ایک معرکہ آرائی (CONFLICT) کی شکل اختیار کر لی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بنیاد نہیں، سیدھی سی بات یہ ہے کہ آپ جس دین کے ماننے والوں کو مخاطب کرتے ہیں، اُن سے توقع اور مطالبہ کرتے ہیں، ان کو مشورہ دیتے ہیں، پہلے آپ ان کا مزاج اور اُن کا امتیاز سمجھ لیں، وہ پیغمبروں کی ایک ایسی جماعت اور اس جماعت کے خاتم اور اس جماعت کے فردِ اکمل کے تابع ہیں جس کا رشتہ وحی الٰہی سے تھا، اور وہ خود وحی کا

انتظار کرتا تھا، بیسیوں حدیثیں ہیں، جو میں اس وقت آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا کہ لوگ پوچھنے آئے آپ نے کہا انتظار کرو، اور آپ خود انتظار کرتے رہے، اور بعض مرتبہ تو ایسا ہوا کہ سائل موجود ہے، اور آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور کسی صحابی نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو، تم دیکھنا چاہتے تھے کہ وحی کس طرح آتی ہے تو دیکھ لو، بعض دفعہ ایسا ہوا کہ ساق مبارک کسی کی ساق پر تھی، اور وحی کا نزول شروع ہوا، وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ میری ٹانگ ٹوٹ جائے، اتنا بوجھ تھا، اس لئے کہ وحی کے ساتھ ایک بوجھ ہوتا تھا، اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس مادی دنیا سے آپ کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے، اور آپ کسی اور عالم میں ہیں، اور اس کے بعد آپ نے وحی کے الفاظ سنانے شروع کئے، ایک مرتبہ کفار نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا، آپ نے وحی کا انتظار کیا، یہاں تک کہ کئی روز (پندرہ دن) گزر گئے اور کفار کو اعتراض کا موقع مل گیا، جب سورۂ کہف نازل ہوئی تب اس کا جواب آیا، اور اللہ تعالیٰ نے وہ قصہ سنایا(۱)۔ آپ نے اس طرح سنایا جیسے کوئی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وحی و نبوت کا اساسی فرق سمجھنا ضروری ہے، دین کو سمجھے بغیر اس میں مداخلت انتشار اور انارکی کو جنم دیتا ہے

وحی و نبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی و نبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں، کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی کی ذہانت کا انکار ہے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی

---

(۱) ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۶۶

یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اُس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں، عدالت میں پہلی بات یہ طے کی جاتی ہے کہ تمہیں بحث کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہاں بڑے بڑے تجربہ کار قانون داں موجود ہیں، ان کو پہلے اپنی سند وکالت پیش کرنی ہوتی ہے، اگر معلوم ہے فاضل جج کو کہ یہ باقاعدہ قانون کے فاضل ہیں اور سند رکھتے ہیں وکالت کی، اور مقدموں میں آتے رہتے ہیں تو ضرورت نہیں لیکن پہلی مرتبہ کوئی وکیل یا بیرسٹر جائے گا تو یہ اطمینان کیا جائے گا کہ یہ قانون کا طالب علم رہا ہے، اور قانون کی سند اس کے پاس ہے یا نہیں، پھر یہ دیکھا جائے گا کہ موکل نے بھی اس کو اپنا ترجمان بنایا ہے یا نہیں، لیکن دین کا معاملہ عجیب وغریب ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کیے بغیر اس کی تاریخ معلوم کیے بغیر، اس کی روح معلوم کیے بغیر ہر شخص اپنا حق سمجھتا ہے کہ اس کے بارے میں مشورہ دے، اور یہاں تک کہ ترمیم اور اصلاح کا مطالبہ کرے، اور اگر اس کو قبول نہیں کیا جاتا تو اس دین کے ماننے والوں پر جمود و جہالت کا الزام لگایا جاتا ہے اور ان کو کم عقل ثابت کیا جاتا ہے۔

میں اصلاً مذہب کا طالب علم ہوں، زیادہ سے زیادہ تاریخ وادب کا طالب علم ہوں، میں کسی وقت یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ کسی ایسے فن یا مسئلہ میں دخل دوں جس کے مبادی Fundamentals سے بھی میں ناواقف ہوں، اگر کوئی شخص سائنس کے مبادی، فزکس کے مبادی یہاں تک کہ ریاضی Mathematics کے مبادی سے (جو روز مرہ کی ضرورت ہے) ناواقف ہے تو دنیا کا کوئی پڑھا لکھا انسان اس کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ یہ کہے کہ فلاں ماہر ریاضی نے یہ نتیجہ جو نکالا ہے غلط

ہے! لیکن کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز رہ گئی کہ اس کے متعلق جس کا جی چاہے، جس وقت جی چاہے اور جس انداز میں جی چاہے مشورہ دیا جائے، اس کی ترجمانی کی جائے، اور اس میں خامیاں نکالی جائیں اور اس میں ترمیمات پیش کی جائیں، اس سے پورے نظام علم پر اثر پڑے گا، عصر حاضر کا سارا نظام اعتماد و اختصاص Specialisation پر چل رہا ہے کیا مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ماہرین خصوصی کی کوئی قیمت نہیں؟ پھر مذہب کی ایک زبان ہوتی ہے، مذہب کے اصطلاحات ہوتے ہیں، اس کے الفاظ کے اعماق (گہرائیاں) و آفاق (وسعتیں) ہوتے ہیں، اس کی نفسیات ہوتی ہیں، یہ ساری چیزیں جانے بغیر کوئی شخص بھی (خواہ وہ مسلمان ہو غیر مسلم ہو اور کسی گروہ کا آدمی ہو) اگر کہتا ہے کہ صاحب، مسلمانوں کے عائلی قانون کا فلاں مسئلہ غلط ہے تو وہ اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے، وہ پورے سیاق و سباق سے ناواقف ہے اس توازن و تناسب سے ناواقف ہے جس کا لحاظ رکھا گیا ہے، آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ایک مکمل ڈھانچہ اور جامع ماحول کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو اس کو مجموعی طور پر دیکھنا ہوتا ہے، حالت یہ ہے کہ چوراہے پر کھڑے ہو کر (اور یہ اخبارات بھی ایک طرح کے گھومتے پھرتے چوراہے ہیں) جس کا جی چاہتا ہے قلم اٹھا کر لکھ دیتا ہے، اس سے ایک انارکی پیدا ہوتی ہے، ذہنی انارکی سیاسی انارکی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملکوں کی تاریخ میں پولٹیکل انارکی سے پہلے منٹل انارکی اور اخلاقی انتشار پیدا ہوتا ہے، اسلام کے بارے میں ذمہ دارانہ طور پر عرض کر سکتا ہوں کہ اس کا ایک طالب علم ہوں، فاضل نہیں کہتا لیکن مانا ہوا طالب علم ہوں، اور یہ بال اسی طالب علمی میں سفید ہوئے ہیں کہ دین کے متعلق پہلے اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق وحی الٰہی سے ہے، شریعت آسمانی سے ہے، اس کے لانے والے پیغمبر ہیں، یہودی تک اپنے

دین وملت کے بارے میں غیور واقع ہوئے ہیں، آپ کسی یہودی سے یہ کہہ کر دیکھئے کہ تمہارا یہ مسئلہ غلط ہے، تمہارا یہ قانون غلط ہے تو وہ کہے گا کہ ہمارے قانون کا تعلق شریعت موسوی سے ہے بائیبل سے ہے، ہم تو اس کے پابند ہیں، ساری دنیا بھی اگر کہے کہ یہ غلط ہے تو ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں، چنانچہ آج بھی اسرائیل کا پورا نظام معاشرت، اوران کا عائلی قانون اسی پر چل رہا ہے۔

یہودیوں کے ذکر پر مجھے ایک بات یاد آگئی، اسرائیل سے ایک پرچہ نکلتا تھا، اس میں ایک مقدمہ کی کارروائی تھی، اس میں ایک مضمون تھا کہ اسرائیل کے عرب مسلمان باشندوں نے اسرائیل کی عدالت عالیہ میں یہ رٹ دائر کی کہ ہمیں تعداد ازواج کی اجازت دی جائے، اس لئے کہ ہمارے یہاں تعدد ازدواج کی اجازت ہے، فاضل جج نے وقت مانگا، اس نے کہا کہ اسلام کے جو اولین ماخذ ہیں ،اور جو کتابیں سند کا درجہ رکھتی ہیں، میں ان کا مطالعہ کروں گا، اسرائیل میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد عربی سے واقف ہے، وہ پہلے سے فلسطین میں رہتے تھے، وہ بے تکلف عربی بولتے ہیں، جج نے قرآن اور احادیث کا مطالعہ کیا، فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اس نے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ میں بداہتاً اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تعداد ازواج کی قرآن وحدیث اور اسلامی شریعت میں کھلی اجازت ہے، اور ہم اس کا علمی وتاریخی طور پر انکار نہیں کر سکتے، لیکن چونکہ فلاں اسلامی ملک میں اس پر پابندی عائد کردی گئی ہے، اس لئے اسرائیل کو جو ایک غیر اسلامی ملک ہے اور شریعت اسلامی کا پابند نہیں، ضرور اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ یہاں کی مسلم آبادی پر پابندی عائد کرے۔

ملک کی تعمیر وترقی کے لئے ضروری ہے کہ

بدگمانی وخوف کی فضا ختم کی جائے

پھر اس مسئلہ پر ملک اور اہل ملک کی توانائی کیوں ضائع کی جارہی ہے ملک اور اہل ملک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ملک کی تعمیر وترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے، کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کرسکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر میں اپنے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لئے بدخواہی نہیں ہوسکتی کہ وہ توانائی جو ملک کی سلامتی، اس کی حفاظت اور تعمیر وترقی میں صرف ہونی چاہئے تھی، وہ شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک وشبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اور ان پر یقین کرنے والی نہیں ہوگی جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں، اور جو ہمارے لئے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لئے مضر نہیں ملک کے لئے بھی مضر ہے، یہ ہرگز دانشمندی کی بات نہیں ہے کہ جب ملک میں کوئی مصیبت نہیں آئی، کوئی سائیکلون نہیں ہے، کوئی ایمرجنسی کی کیفیت نہیں ہے، کوئی آسمان سے اولے یا گولے نہیں برس رہے ہیں کسی نے اس لئے حملہ نہیں کیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کرائیے ورنہ ہم اس ملک پر قبضہ کرتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی جائے؟

دین اسلام کا دائرہ

۲۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے، اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی ونبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو

ایک خاص دائرہ میں محدود کرلیا ہے مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے، اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے جامع بھی۔ قرآن شریف میں ہے:

یَآ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ o

(سورہ البقرہ : ۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔''

یہاں تحفظ نہیں ریزرویشن نہیں کہ اتنا آپ کا اتنا ہمار، اتنا ملک کا، اتنا اسٹیٹ کا، اتنا خدا کا، اور اتنا خاندان اور قبیلہ کا اتنا دین وملت کا اور اتنا سیاسی مفادات کا نہیں، جو کچھ ہے سب خدا کا ہے، یہاں سب عبادت ہی عبادت ہے، مسلمان کی پوری زندگی عبادت ہے، مسلمان کی پوری زندگی خدا کے سامنے عاجزانہ غلامانہ ہے، اسلام خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور اپنے کو (Surrender) بلا شرط حوالہ کرنے کا نام ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت وراثت میں ہمارے اقتصادی حالات کا تقاضہ کچھ اور ہے، یہاں کی مجبوریاں، یہاں کے تمدنی تقاضے، معیار زندگی اور ہمارے خاندان کی پچھلی تاریخ، یہ سب اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم وراثت تقسیم نہ کریں، ہم اس زمین کو اسی طرح باقی رکھیں، کم سے کم لڑکیوں کو حصہ نہ ملے اس لئے شادی کے بعد یہ حصہ ان کے گھروں کو چلا جاتا ہے، اس کا بالکل اختیار نہیں، اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دین کا دائرہ پوری زندگی پر حاوی ہے، اور اس میں کسی کو بھی ترمیم

کرنے کا حق نہیں، بڑی سے بڑی عدالت، بڑی سے بڑی قوت حاکمہ، اور بڑی سے بڑی ہیئت منتظمہ اور بڑی سے بڑی دانش گاہ اور یہاں تک کہ بڑے سے بڑے مجتہد اور امام وقت کو بھی ان چیزوں میں جو قرآن مجید میں منصوص و قطعی ہیں ایک لفظ ایک نقطہ کی ترمیم کرنے کی اجازت نہیں ہے، یہ سارے علماء بیٹھے ہوئے ہیں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں، اور اگر یہ بات غلط ہے تو ان کا دینی تبحر اور احساس فرض انہیں مجبور کرے گا کہ یہ میری تردید کریں۔

ان دو حقیقتوں کو اگر سمجھ لیا جائے کہ ایک تو یہ کہ یہ دین ہمیں وحی سے ملا ہے پیغمبر کو بھی اس پر عمل کرنے کا حکم ہے، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ جاثیہ:۱۸)

(اے پیغمبرؐ) ہم نے آپ کو دین کے خاص طریقہ (شریعت) پر کردیا ہے تو آپ اسی پر چلتے جائیے، اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے)(۱)۔

نبی معصوم اور نبی محبوب سے یہ کہا جارہا ہے تو ہم سے کیسے مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم شریعت کو بدل دیں۔

یہ دو حقیقتیں ہیں جن کو سمجھنے کے بعد اس غلط فہمی کا پردہ ہی چاک ہو جاتا ہے اور ایک غیر ضروری صورت حال کا مقابلہ کرنے اور اس پر اپنی ذہانت صرف

---

(۱) دینی احکام کا دوسرا ماخذ سنت ہے (جو وحی غیر متلو) اور وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کا کسی فعل پر سکوت اور اس کا برقرار رکھنا ہے، اس پورے مجموعے کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے، وما آتکم الرسول فخذوہ و ما نھکم عنه فانتھوا (سورۃ الحشر: ۷) (اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو، اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو) سنت بھی حقیقۃ قرآن مجید کے کسی حکم کی تشریح، اجمال کی تفصیل یا اس سے استنباط کا نام ہے۔

کرنے سے ہمیں چھٹی مل جاتی ہے، اور ملک وحکومت کو دوسرے ضروری کاموں کے لئے وقت بچ جاتا ہے۔

کیا ''یونیفارم سول کوڈ'' جنگ وجدل کو روک سکتا ہے

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لئے، سالمیت کے لئے اور مشترک وطنی شعور کے لئے ضروری ہے کہ ایک مشترک واحد عائلی قانون (Uniform Civil Code) نافذ ہو، تو میں ایک سیدھی سی بات پوچھتا ہوں، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم جو ہوئی تھی، وہ اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کرسکتا ہے کہ جہاں تک عیسائی قانون کا تعلق ہے ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسٹنٹ جن کی تہذیب بھی عائلی قانون بھی بلکہ معاشرت بھی ایک ہے، وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف مدعی ہے، مسلمان مسلمان کا مدعیٰ علیہ ہے، اور مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا

ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، یہ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے، تاکہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو۔

عائلی قانون کے سلسلہ میں انگریزوں کی حقیقت پسندی کا اعتراف عین انصاف ہے

حضرات!

جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا اس گروہ اور خاندان سے تعلق ہے جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور بیش از بیش حصہ لیا، کلکتہ کی یہ سرزمین خاص طور سے اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ ایمانی قافلہ حجاز جاتے ہوئے یہیں سے گذرا تھا، اسی خلیج بنگال سے روانہ ہوا تھا اور اپنے مستقر سے یہاں تک ایمان، توحید و سنت اور دینی حمیت کی روشنی پھیلاتا ہوا آیا تھا(۱)، اسی نے سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی روح پھونک دی، (۲) قرآن کہتا ہے کہ تمہیں عصبیت اور بغض اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے دو، اور تعصب وحق پوشی سے کام لو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ

(۱) اس سے مراد حضرت سید احمد شہیدؒ کا وہ قافلہ ہے جو حج کی نیت سے شوال ۱۲۳۶ھ (جولائی ۱۸۲۱ء) میں اپنے مستقر رائے بریلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوا تھا آغاز میں اس میں چار سو آدمی شریک تھے، راستہ میں اضافہ ہوتا گیا، کلکتہ سے روانگی کے وقت تک ۶۹۳ آدمی ہو گئے یہ سفر رائے بریلی سے کلکتہ تک دریائے گنگا کے راستہ سے ہوا تھا، اور ہر جگہ اصلاح و تبلیغ کا عظیم الشان کام انجام پایا۔

(۲) ملاحظہ ہو سر ولیم ہنٹر کی کتاب OUR INDIAN MUSALMANS

اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (سورہ المائدہ : ۸)

''اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔''

انگریز اس بارہ میں زیادہ حقیقت پسند تھے، انھوں نے جب ہندوستان میں حاکمانہ طریقہ پر قدم رکھا تو انھوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عائلی قانون میں دخل نہیں دینا چاہئے، ان کو اس میں آزاد رکھنا چاہئے، اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں محمڈن لا کا اتنا بڑا کام ہوا، اسی کلکتہ کی سرزمین پر اور خاص طور پر یادش بخیر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی کے ہاتھوں اور سر عبدالرحیم وغیرہ کے ذریعہ ہوا، انگریزوں نے دو کام بڑی عقلمندی کے کئے، انھوں نے اس بات کو پالیا کہ بے ضرورت جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہئے اور مشکلات نہیں پیدا کرنے چاہئیں، یہ ایک ایسی قوم کا طرز عمل ہوتا ہے جو حکمرانی کا تجربہ رکھتی ہے، انھوں نے دو باتیں طے کیں، ایک تو یہ کہ عائلی قانون اور مذہب میں مداخلت نہیں ہونی چاہئے، دوسری بات یہ کہ نظام تعلیم سیکولر ہونا چاہئے کہ بلی کتے کے قصے پڑھاؤ مگر کسی دوسرے مذہب کی تلقین نہ کرو ہم نے انگلش پرائمر اور ریڈریں پڑھی تھیں، ان میں شروع سے اخیر تک یہ دیکھا کہ جنوں اور بھوتوں پریتوں تک کے قصے اور افسانے آئے، جانوروں کے قصے آئے لیکن کہیں یونانی رومن دیومالا (Mythology) کی بات کرسچین میتھالوجی کی بات نہیں آئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اطمینان کی کیفیت رہی، وہ بنیادیں دوسری تھیں جن بنیادوں پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اور دوسرے عناصر نے مل کر یہاں غلامی کے جوے اپنے سر سے اتار کر پھینک دیا، اور جنگ آزادی لڑی، ان دونوں دانشمندانہ فیصلوں نے ان کی حکومت کی بقاء میں مدد کی اور اس کی مدت کو دراز کیا، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اپنے تاریخ کے

مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ جو واقعہ ۱۸۵۷ء میں پیش آیا وہ ۱۷۵۷ء میں پیش آسکتا تھا، اور پیش آنا چاہئے تھا، اور انیسویں صدی کے بالکل اوائل میں پیش آجانا چاہئے تھا، یہ سو برس سے زائد جو انھوں نے یہاں اطمینان سے حکومت کی، اس میں ان کی دانشمندی کو دخل ہے کہ باشندگان ملک کی مذہبیات میں، ان کے عائلی قانون میں دخل نہ دو، ان کے نظام تعلیم میں دخل نہ دو، ان کو سیکولر طریقہ پر پڑھاؤ، اپنے اپنے مذہب کے مطابق یہ عقیدہ رکھیں، عمل کریں۔ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اور اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفہ اخلاق، فلسفہ نفسیات اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسجد میں آپ مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن، اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد واعزاز کا نیز آپ کی توجہ والتفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بےلوث وآزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

خطبۂ صدارت

اجلاس ہشتم

آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

بمبئی

منعقدہ : ۱۵/۱۶/دسمبر ۱۹۸۶ء

"مجھے معاف کیا جائے مسلمانوں کا معیار اس بارے میں اور زیادہ بلند، اور ان کی حس اس سلسلہ میں اور زیادہ تیز ہے، اس کا تعلق ان کے مذہبی معتقدات، ان کے اصول زندگی، اور ان کے اس فہم وفکر اور نقطہ نظر سے ہے، جو دین و دنیا، فوز وفلاح، فرد و جماعت کی کامیابی و سعادت کے بارے میں وہ رکھتے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ ایک طرف اس ملک کے مسلمان آئینی جدو جہد کے تمام طریقوں سے کام لے کر، اور اجتماعی عزم و فیصلہ کی پوری طاقت سے اس ملک میں اپنے لئے حقیقی کام اور تحفظ کی فضا پیدا کریں جس کے بغیر (مجھے کہنے کی اجازت دی جائے) وطن وطن نہیں غربت ومسافرت ہے، آزادی آزادی نہیں غلامی ہے، اور گھر چمن نہیں، قید خانہ اور قفس ہے، اس سلسلہ میں ایثار وقربانی اور خطر پسندی کی بھی ضرورت ہے، کہ حکومت کی امداد سے جو ان مطالبات اور تغیرات کے ساتھ مشروط ہے پورے استغناء اور توکل اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ معذرت کر دی جائے اور اس کو قبول نہ کیا جائے"

تاریخ کے دامن سے

دو بیش قیمت اور رہنما اقتباس

حضرات!

مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا خطبہ دو بیش قیمت تاریخی، فکر انگیز اقتباسات سے شروع کروں، جو ہمارے ملک کے سیاسی وانقلابی، اصولی واخلاقی اور جمہوری وسیاسی تاریخ میں سنگ میل اور روشنی کے میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جن سے اس ملک کی سیاسی، انتظامی وفکری قیادت اور عوام کو ہمیشہ روشنی ورہنمائی حاصل کرنی چاہئے اور کبھی ان کو فراموش اور نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

پہلا اقتباس جنگ آزادی کے نہ صرف معتبر ومستند بلکہ قابل فخر و مایہ ناز قائد ومحسن مولانا ابوالکلام آزاد کے اس خطبۂ صدارت کا ہے جو انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء میں دیا تھا۔

مولانا نے فرمایا:۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ

مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں، بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرہ میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔

لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں، میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا(۱)"

دوسرا اقتباس ملک کے مشہور دانشور، محب وطن، بین الاقوامی شہرت کے حامل، ماہر تعلیم، اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے اس خطبہ کا ہے، جو موصوف نے کاشی ودیاپیٹھ (بنارس) کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۴/اگست ۱۹۳۵ء کو پڑھا تھا۔

---

(۱) خطبات آزاد مطبوعہ ساہتیہ اکادمی صفحہ ۲۹۷-۲۹۸

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

''آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لئے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہو گا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما

گلستاں میرد گر میریما(۱)

یہ دونوں اقتباس حب الوطنی اور حقیقت پسندی کے آئینہ دار ہیں

حضرات!

ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی وعائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں اس حقیقت کے نہ صرف اعتراف بلکہ احترام، اس خصوصیت کے نہ

---

(۱) (ترجمہ) اگر چہ ہم غنچہ کی طرح دل گرفتہ اور غمزدہ ہیں لیکن اگر نہ رہے تو گلستاں بھی نہ رہے گا (تعلیمی خطاب (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم) مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، فروری ۱۹۵۲ء (۲۳۔۲۴)۔

صرف باقی رہنے کی اجازت بلکہ اس کے تحفظ وترقی اوراس کے ساتھ بقائے باہم اور مشترک ملکی اور قومی مفادات میں سرگرم اشتراک وتعاون کا ثبوت دیا ہے، اور جس کے لئے نامذہبی (Secular) اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانب داری اور ذہن وضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام ہوسکتا ہے، یہی طرز فکر مناسب ہے، اور یہ نہ صرف کہنے والوں کی، اپنے اپنے ایمان وعقیدہ اور قلب وضمیر کی صحیح ترجمانی ہے، بلکہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام وملل، تمدنوں وتہذیبوں، اور علوم وفلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ اور کہنے والوں کی بلند نگاہی، روشن ضمیری، اصول پسندی اور اسی کے ساتھ اس اخلاقی جرأت کا نمونہ ومظاہرہ بھی ہے، جو ان دونوں قائدین فکر وسیاست کے ہر طرح شایان شان ہے۔

دستور ہند کی دفعہ ۲۵: حقیقت پسندی کا ثبوت

اسی حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں، آبادی کے مختلف النوع عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب وعقائد، اپنے تمدنوں و تہذیبوں اور اپنے معاشرتی و عائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت ودفاع میں صرف کرنے کے بجائے ملک کی تعمیر وترقی، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت ومقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لئے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے، اور جس میں ہندوستانی شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> ''امن عامہ، اخلاق اور صحت اور نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور

آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ واشاعت
کا یکساں حق ہوگا۔"

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدنی، تہذیبی، مذہبی ونفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی، اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزم وفیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

دفعہ ۴۴ - دفعہ ۲۵ کی ضد، اور دستور ہند کے تار و پود میں ایک آتش گیر مادہ (EXPLOSIVE MATTER)

لیکن اس قابل احترام دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی، قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں، جس نے بہت وقت لیا اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئیں، یہ عجیب وغریب تضاد بلکہ دنیا کی دستور سازی کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اس کے بعد ہی دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانون (Uniform Civil Code) کی دفعہ شامل کی گئی، اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول (Directive Principle) کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسب ذیل ہے:

"مملکت، ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لئے
یکساں مدنی ضابطہ (Uniform Civil Code) کے حصول کی سعی
کرے گی"۔

جس وقت دستور کی ترتیب عمل میں آئی تھی، اس وقت مسلم زعماء کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ دستور ہند کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کی دفعات کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کو محفوظ کر دیا گیا ہے، اور بنیادی حقوق کی دفعات رہنما اصول

سے زیادہ اہم ہیں، لیکن دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جہاں تک مسلمانوں کے عائلی قوانین اور نظام معاشرت کا تعلق ہے (جو ان کے مذہب کا جزء لاینفک (Inseparbbl Part) ہے، دستور ہند کے اس تار و پود میں ایک آتش گیر (Explosive Matter) مادہ رکھ دیا گیا ہے، جو کسی وقت بھی کسی ادنیٰ تحریک، یا باہر کی گرم ہواؤں کے اثر سے آگ پکڑ سکتا ہے، اور ان مذہبی و قانونی تحفظات کو جلا کر فنا کر سکتا ہے، جن کی دستور نے ضمانت دی تھی، چنانچہ واقعات کی قدرتی رفتار، اور ان مختلف عوامل و محرکات (Factors) کے ماتحت جن کا تعلق مسلمانوں کے عائلی قانون (Personal Law) کی صحیح نوعیت اور اس کے ان کے مذہب سے تعلق اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے عقائد و جذبات اور نفسیات سے ناواقفیت، فکر و نظر کی سطحیت سے بھی ہے، اور ہندو احیائیت (Hindu revivalism) کے جذبہ اور سیاسی و انتخابی مصالح اور اکثریت کو خوش کرنے کے جذبہ سے بھی ہو سکتا ہے، یہ خطرہ سامنے آ گیا، اور ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد ۱۹۷۲ء میں مختلف اسباب و محرکات کی بناء پر ہندوستان میں مختلف فرقوں کے عائلی قانون (Personal Law) کی وحدت اور مسلم پرسنل لا کی اصلاح و ترمیم کی پھر ایک بار بلند آہنگی کے ساتھ آواز بلند ہوئی، یہ آواز تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ مختلف وقتوں میں مجلس قانون ساز کے اندر اور مجلس قانون ساز کے باہر بلند ہوتی رہی، لیکن مختلف سیاسی مصلحتوں سے اور مسلم رائے عامہ کی برہمی کے خوف سے (جس کا الکشن پر بھی اثر پڑنے کا خطرہ تھا) دبائی جاتی رہی، اور حکومت ہند نے کئی بار اپنے اعلیٰ ذمہ داروں کی زبان سے اس کا اعلان کیا کہ ایسا کرنے کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے، اور جب تک متعلق فرقے خود اس خواہش کا اظہار اور اس کا مطالبہ نہ کریں اس کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن اسی کے ساتھ خود ان فرقوں کے متعدد افراد پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر یہ آواز اٹھاتے رہے،

اور بعض دور بین نگاہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ محض ان کے ضمیر کی آواز نہیں ہے، بلکہ ان کی زبان حال کہتی ہے کہ ؎

از پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
انچہ استاد ازل گفت ہمہ می گویم

حقیقت جو کچھ بھی ہو اتنا اندازہ ہو گیا کہ ملک کے قانون سازوں اور ارباب اختیار کے ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہیں، اور کسی وقت بھی خاکستر کے نیچے کی یہ چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک:

(۱) غیر آسمانی عائلی قانون میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت کا احساس

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک ہیں، ایک یہ کہ "سلطانی جمہور" کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے اور عائلی قوانین، زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے، جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں "آسمانی قانون" کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے، اور وہ عائلی قوانین کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ اور خواہشات و ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں، (اور بدقسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں، اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں، بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیل پایا جاتا ہے) ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل قدرتی امر و بدیہی حقیقت ہے، اس لئے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیل

ہو جانے سے انسانوں ہی کے ہاتھوں ان میں اصلاح وترمیم اور تبدیلی نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات فرض وواجب ہو جاتی ہے۔

(۲) مختلف عناصر واجزاء میں ہم آہنگی ووحدت

(UNIFORMITY) کا عالمگیر رجحان

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزاء میں زیادہ سے زیادہ ہم رنگی ووحدت (Uniformity) کا وہ عالمگیر رجحان ہے، جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت وشدت کے ساتھ پروپگنڈہ کیا گیا، اور اس میں ادب وشاعری، علم وسیاست، اور صحافت وخطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے، یورپ سے (جہاں کے اکثر ملکوں میں ایک ہی تہذیب، ایک ہی معاشرتی وعائلی نظام ایک ہی عائلی قانون اور اکثر ایک ہی مذہب اور زبان رائج ہے) یہ خیال ان مشرقی وایشیائی ممالک میں آیا جہاں کئی کئی مذہب مختلف تہذیبیں اور مختلف معاشرتی نظام کبھی بھی باہمی نفرت، زور آزمائی اور انتشار کا باعث نہیں ہوئے، انتشار وافتراق کا اصل سبب ہمیشہ ملکوں کے سیاسی اغراض اور قوموں کے سیاسی رہنماؤں کے ذاتی مفادات ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمل مذہبی، تہذیبی اور عائلی وحدت کے باوجود دو دو خوں آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے مشرق وایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون ومعاشرت تقریباً ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے، تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک

اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ مسلمان مدعی ہے، اور مسلمان ہی مدعیٰ علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے، کہ اس میں بھی عائلی قانون (Personal Law) کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی، اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت اور دولت پرستی کے جنون سے اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہئے، تا کہ آپس میں اتحاد و الفت پیدا ہو؟ طوطے کی طرح اس بات کو دہراتے رہنا سطحیت (Loose Thinking) مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

ان دو محرکات کے ساتھ (معذرت کے ساتھ) یہ بھی اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ بعض فرقوں کے عائلی قوانین میں ایسی ناہمواریاں اور نقائص پائے جاتے ہیں، (اور ایسا مخلص سے مخلص اور لائق سے لائق انسان قانون سازوں کے بنائے ہوئے قوانین میں بھی ہونا ضروری ہے) کہ ان کی اصلاح اور جدید حالات کے مطابق نئے قوانین کا وضع کرنا ایک رفاہی جمہوری (Welfare Democratic) حکومت کا بھی فرض ہے، اور اس فرقہ کے فرض شناس اور حقیقت پسند رہنماؤں

اور نمائندوں کا بھی، اس لئے ہمیں اس معاملہ میں (جہاں تک ان قوموں کا تعلق ہے) نہ ملامت کا حق ہے، نہ احتجاج کا۔

مسلمانوں کا عائلی قانون اس علیم وخبیر کی طرف سے نازل کردہ ہے جو زمان ومکان کا خالق ومدبر ہے

لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے، جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے، اور اس کائنات کا بھی، اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ہ

(سورۃ الملک : ۱۴)

"کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔"

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال ومستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے، تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق

ہے) ایک اعتقادی و عملی نفاق کے سوا کچھ نہیں، پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی و عملی شواہد، اور مسلم و غیر مسلم مشرقی و مغربی فضلاء جری وانصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی ''شپرہ چشم'' ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے، اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام، اسی خطرہ کے مقابلہ کی طرف پہلا قدم

ہندوستان میں جب یہ مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہو گئی ہیں، اور یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے، کسی وقت ضرور برسے گا، تو انہوں نے ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر یہ، یا کوئی دوسرا مسئلہ شب خون نہ مارنے پائے، یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا، جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رخ معلوم ہو گیا، اور اتنا ثابت ہو گیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فی صد متفق ہیں، اس لئے دانشمندی، حقیقت پسندی، اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

شاہ بانو کیس اور دریا کے ساکن سطح میں تموج واضطراب

یہ صورت حال قائم تھی، اور مسلمان اقلیت اور اس معاشرہ و ماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی کہ ۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں وہ ہنگامہ خیز فیصلہ دیا جس سے ملت اسلامی، مسلم معاشرہ اور علماء و دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی نظیر اپنی وسعت وعمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت وکرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات، خوں ریزی وانسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کی موجودگی میں بھی نہیں ملتی، اس لئے کہ یہ مسلمانوں کی تہذیبی، معاشرتی ارتداد، شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ ۝

(سورۃ المائدہ : ۴۴)

”جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں۔“

کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا اور اس سے غیر مسلم جج صاحبان یا قرآن وحدیث وتفسیر، فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان میں مہارت خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لئے قرآنی آیات، اس کے الفاظ واصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد، سکنڈ ہینڈ معلومات سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات ”ترقی پسندی“ یا بیرونی اثرات وموٴثرات سے تاثر کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے، من مانی تفسیر اور خواہش مندانہ تشریح (Wishful Thinking) کا آزادانہ موقع مل سکتا ہے، اور یہ نہ صرف دین وشریعت، مذہبی صحیفوں بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول، اختصاص (Specilaisation) اور علوم و فنون میں اتھارٹی (Authority) کے تسلیم واحترام کے اس اصول کے خلاف تھا جو

ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جارہا ہے، اور جس پر زبان وادب، فلسفہ، منطق، سائنس وٹکنالوجی، اجتماعیات، ومدنیات کا نظام چل رہا ہے۔

دین وشریعت سے وابستگی اور خودداری کی بے نظیر مثال

اس موقع پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملی غیرت وخودداری کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر عرصہ دراز سے ملی ودینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے، جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسہ عام میں جو ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ (نصف ملین) انسان تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ترین ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیر ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں۔

میڈیا کا منفی کردار

اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (Opposed Tooth And Nail) کا مظاہرہ کیا جس کی مثال شاید تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی اس شدت احساس، اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل

کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) ـــــــ متاثر ہوتی تھی کو اس نظر سے دیکھا گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی ملک گیر مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ (Dialogue) اور پریس کانفرنس میں کہا ہے انھوں نے اس بارے میں اصول ''احساس تناسب'' (Sense of Proportion) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔''

''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل'' حکومت کی حقیقت پسندی کا مظہر

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم و احترام، قانون اور سنجیدگی وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا) بورڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ و ہدایت سے جمہوریہ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انھوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کیں، اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں ان کو اس مسئلہ کی نوعیت و اہمیت، مذہبی و شرعی نقطہ نظر، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات و تأثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب و بے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہنچ چکی ہوگی) صبر و سکون اور احترام کیساتھ یہ باتیں سنیں اور وہ اس بارے میں مطمئن (Convinced) ہوگئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے، اور اس کی صحیح ترجمانی وہی علماء کر سکتے ہیں، جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے، اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین و شریعت کے صحیح ترجمان ہیں، اور اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، چنانچہ انھوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر

نامور علماء سے تبادلہ خیال کرلیا ہے، اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقہ اناث (Femal Sex) بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اوران کو حق دیتا ہے، وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرأت، اوراحساس ذمہ داری، اورعزم وفیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کا بل پارلیمنٹ میں لائے اوراس پر واضح اور طاقتور وہپ (Whip) جاری کیا، اور وہ ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو "تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل" کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح (جو صحیح وغلط تائید ومخالفت اور خلوص وسیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی) اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبہ شرافت کے ساتھ اعتراف اوراپنے تشکر وامتنان کا اظہار کیا اوروزیر اعظم صاحب کے نام ملک کے کونہ کونہ سے شکریئے کے تار آیئے، بیرونی ملک کے بھی بعض مؤقر تنظیموں اور علمی مجلسوں نے شکریہ وتحسین کے تار بھیجے، سعودی عرب، کویت، امارات، اور برطانیہ کی عربی اخبارات ورسائل نے پہلی مرتبہ اس پر مسرت کا اظہار اور حکومت ہند کی حقیقت پسندی کا اعتراف کیا۔

ظالمانہ اور غیر منصفانہ قانون کو ٹوٹنے سے نہیں بچایا جا سکتا

یہ واقعات کی منطق (Logic) اور حقیقت پسندی کا دانشمندانہ تقاضا تھا، اس موقع پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہمیر (E-Boden Heimer) نے "فلسفہ قانون اوراس کی سماجی اہمیت" سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو، لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہو کہ ان کے

ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، تو اس قانون کو توڑنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابل برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظام قانون کو برقرار رکھنے پر مصر ہو اسے اس کو نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پر خطر ہوگا، جیسا کہ جان ڈکنسن (John, Dickenson) نے کہا ہے، ہمیں کسی عام اور متعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابل عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار، اندرونی رجحان کی خلاف ورزی کرے گا ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی، اور اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہو جائے گا'' (۱)

حقیقت کا اظہار اور اعتراف

اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ میں اتحاد رائے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے تعاون کرنے کا تعلق ہے، ملک کی تمام مسلم سیاسی و غیر سیاسی جماعتوں و تنظیموں اور مذہبی مکاتب خیال نے اس سے پورا اشتراک عمل اور تعاون کیا، اور ان کے قائدین نے اس مشترک ملی مسئلہ سے پوری دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا، اور ملک گیر دوروں میں شریک رہے۔

اس سلسلہ میں ناسپاسی ہوگی اگر ہم ان خاص شخصیتوں کا نام نہ لیں،

---

(۱) E_Bodenheimer,jurisprudence,Harvard,1967 p.212

جنھوں نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر پوری طاقت اور لیاقت کے ساتھ مسئلہ کی وکالت اور مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کی، ان میں ارکان حکومت میں سے جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب اور ممبران پارلیمنٹ میں سے جناب محمود بنات والا صاحب خاص طور پر ملت کے شکریہ کے مستحق ہیں، خواتین میں سے محترمہ نجمہ ہبۃ اللہ صاحبہ اور بیگم فخر الدین علی احمد صاحبہ اور بعض دوسری اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین نے اپنی دینی حمیت اور اسلامی مسائل سے دلچسپی کا ثبوت دیا، اور اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صرف مردوں کا طبقہ ہی اس جدوجہد میں شریک اور اسلام کے عائلی قانون سے مطمئن نہیں، بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی اسلامی قوانین سے مسرور و مطمئن اور اس کی برتری و بہتری کی قائل ہیں۔

سمجھنے کی پہلی بات:

یہ دین ہم تک بانیان سلطنت یا دانشوران قوم کے ذریعہ نہیں بلکہ انبیاء و مرسلین کے ذریعہ پہنچا ہے

حضرات!

یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے، اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Reformers) یا بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں اور کسی تہذیب، نظام فکر، دبستان (School Of thought) اور خالص مطالعہ، غور و فکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (Line Of Demarcation) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حد فاصل یہ

ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں، جن کو اللہ تعالی نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حد فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفۂ سماجیات (Social Sciences) کا علم تہذیب وتمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکر ودانش کا ایک مستقل مدرسہ (School Of Thought) بھی ہے، لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک ''دین'' ہے اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے، اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہیں، اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ ان سے باہر اور ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لئے اسی درجہ قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لئے اور سارے امتیوں کے لئے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ؕ

(سورۃ النجم: ۳۔۴)

''اور وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اوران کی طرف بھیجا جاتا ہے)۔''

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَاالْكِتٰبُ وَلَاالْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (سورة الشوریٰ : ۵۲)

''آپ نہیں جانتے تھے کہ لکھنا پڑھنا کیا ہوتا ہے، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینے میں اتارا اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں، اور بیشک (اے محمدؐ) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو۔''

وحی ونبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی ونبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے، اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

دوسری بات:

اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے، اس

بارے میں مذاہب میں خود اختلاف ہے، اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کرلیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے، جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:۔

يَآ يُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

(سورۃ البقرۃ : ۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔''

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی، عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے، تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفہ اخلاق، فلسفہ نفسیات، اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں، (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی

ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری، اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

آپ کا کام یہ ہے کہ اپنے ملی تشخص کی حفاظت آئینی طریقہ پر کریں

حضرات!

میں اجازت چاہتا ہوں کہ چند دن پیشتر (۲۲ رنومبر ۱۹۸۶ء) کو وارانسی کی صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس میں میں نے جو خطبہ پڑھا تھا اس کا ایک اقتباس آپ کے سامنے پیش کروں کہ وہ اس مسئلہ (مسلم پرسنل لا) سے بھی وہی تعلق رکھتا ہے، جو مسلمانوں کی نئی نسل کی دینی تعلیم کے مسئلہ سے میں نے عرض کیا تھا کہ:۔

"آپ ایسے ملک میں ہیں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، وہ جمہوری ملک ہے، اور وہاں قانون ساز مجلسیں قانون بناتی ہیں، جب یہ ملک جمہوری ہے تو پارلیمنٹ ہی قانون بنائے گی، اور جمہوریت کا یہ قاعدہ ہے کہ اکثریت کی رائے اور تائید سے قانون بنتا ہے، اس لئے ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ ایسے قوانین بنیں جو ہمارے بنیادی عقائد، مسلمات، ہمارے جذبات اور ہماری ضرورتوں کے خلاف (بدنیتی سے کم اور ناواقفیت سے زیادہ) بنیں، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہاں مذہبی، تہذیبی، اور لسانی بنیادوں پر جارحانہ احیائیت (Aggressive Revivalism) اور کلیت پسندی (Totalitarianism) کی تحریکیں بھی زور شور سے چل

رہی ہیں، اب آپ کا کام یہ ہے کہ ایسے سیکولر اور جمہوری ملک میں اپنے ملی تشخص کی حفاظت آئینی طریقہ پر کریں، آپ ہندوستان کے وفادار، مفید، کارآمد اور اس کے ضروری جزو ہونے کی حیثیت سے اپنی افادیت و اہمیت ثابت کریں، اور مطالبہ کریں کہ کوئی قانون ہماری شریعت، آسمانی کتاب، اور ہمارے عقائد کے خلاف نہیں بننا چاہئے، آپ اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت کریں کہ خلاف شریعت قانون بننے سے آپ کو اس سے زیادہ اذیت ہوتی ہے، اور آپ کا ملی وجود اس سے زیادہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے، جتنا کھانا روکنے سے، کوئی جمہوری حکومت، کسی اقلیت اور کسی فرقہ کی غذائی ضرورتوں کو نہیں روک سکتی، کوئی حکومت چاہے کتنی ہی طاقتور ہو، یہ قانون نہیں بنا سکتی کہ فلاں فرقہ کو غلہ کی فراہمی روک دی جائے، یا بازار میں اسکو دوکان کھولنے کی اجازت نہ دی جائے، یا اس کے بچوں پر تعلیم اور تعلیم گاہوں کے دروازے بند کر دیئے جائیں، ایسا اگر ہونے لگے تو آپ قیامت برپا کر سکتے ہیں، آپ ثابت کر دیں کہ اس قانون اور اس نئے نظام تعلیم سے آپ کو ایسی گھٹن ہو رہی ہے، جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر باہر رکھنے سے ہوتی ہے، آپ کے چہروں کے اتار چڑھاؤ، حرکات و سکنات سے معلوم ہو جائے کہ آپ کی صحت اور توانائی اور کارکردگی پر اثر پڑ رہا ہے، اور یہ محسوس کر لیا جائے کہ یہ ایک مغموم قوم کے افراد ہیں، اس نئے قانون سے ان کا دم گھٹ رہا ہے، اور یہ ان کی آئندہ نسل کے قتل کے مرادف ہے، یہ کام آپ کو خلوص کے ساتھ عملی طور پر ایسی کیفیات کے ساتھ کرنا ہوگا کہ ہر شخص اسٹیشنوں، پارکوں، اور بسوں میں آپ کی بے چینی کو محسوس کرے، اگر آدھا نہیں تو کم از کم اس کا چوتھائی حصہ ثابت کرنا ہوگا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک ہفتہ بھی ایسا قانون نہیں چل سکتا، میں نے دنیا کے آئینوں اور دستور حکومت کا مطالعہ کیا ہے، اور جمہوریتوں کی تاریخ پڑھی ہے، اس لئے میں یہ بات

کہہ رہا ہوں۔"

احتساب کائنات پر احتساب نفس کو مقدم کرنے کا عہد کیجئے

برادران ملت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی وقرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی وقرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ، مدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن کے راستہ سے آئی، یہ لعنت کہاں سے آئی جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا آپ کی غیرت ملی کو آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں ببانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں، وہ شکایت بجا، ہم شکایت کرتے رہیں گے اور شکایت کرنا ہمارا حق ہے، ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخبار کے کالموں میں، وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو، اس کے بغیر نہیں چل سکتا، حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوان قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی

خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اس لئے ہم اپنی حکومت سے شکایت کریں گے اور سو بار کریں گے، اور کو اس پر فخر کرنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اسی میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لئے ہمارے اس ملک کا یہ افتخار، ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکان حکومت سے، انتظامیہ (Administration) اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑ لیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا، اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے؟

یہاں سے یہ عہد کر کے جائیے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں

ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے،(۱) کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارہ ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال : ۳۳)

"اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے، انہیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔"

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر، شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقہ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے، جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کر دیں گے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے اور عورتوں کی، بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے، جو شریعت میں بیان کی گئی ہے،

---

(۱) روزنامہ قومی آواز دہلی ۱۰/جون ۱۹۸۴ء

طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس کو سمجھا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن و مغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں۔ (۱)

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ کس طرح برباد ہو رہا ہے، وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اور اس میں ہزار دقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے، اور چند مہینوں سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور اس کے واجب الاحترام امیر کی ذاتی نگرانی میں مستند علماء اور ماہرین فقہ کے ذریعہ جدید زبان و اسلوب و ترتیب کے ساتھ عائلی قانون اور مسائل نکاح و طلاق حقوق و فرائض کی تدوین کا کام شروع ہو گیا ہے، اور اس کا خاصہ حصہ مرتب ہو کر ممتاز علماء اہل نظر کی خدمت میں رائے و مشورہ کے لئے بھیجا جا چکا ہے، اس کی ترتیب کے بعد

---

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں جو بیان کی جاتی، اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے، پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

عدالتوں اور مجلس قانون ساز اور معترضین کو یہ کہنے کا حق بھی نہیں ہوگا کہ ہمارے پاس قدیم تراجم کے علاوہ جو زیادہ تر غیر مسلم قانون دانوں اور مصنفین کی مرتب کی ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کا مستند و براہ راست کوئی مجموعہ قوانین نہیں ہے، اسی کے ساتھ اصلاح معاشرہ، اصلاح رسوم اور مسلمانوں کی عائلی زندگی کو شرعی احکام، قرآنی تعلیمات اور اور اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں منظم و بہتر بنانے کی کوشش بھی جاری کردی گئی ہے، اور جا بجا دار القضاء بھی قائم کیے جا رہے ہیں، تاکہ مسلمان اپنے تنازعات و مسائل خاص شریعت کی روشنی میں حل کریں، اور امکانی حد تک مقدمات و اختلافات کا فیصلہ کرانے میں (خصوصیت کے ساتھ جن کا تعلق احکام شرعی سے ہے) خود کفیل ہو جائیں۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ والتفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث و آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا۔

خطبۂ صدارت

اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ ۴/۵/مارچ ۱۹۸۹ء

کان پور

''موجودہ حالات میں ہمیں مایوس اور شکستہ دل ہونے کی ضرورت نہیں اس حقیقت کو ہم پیش نظر رکھیں کہ اسلام اس ملک میں یونہی نہیں آیا بلکہ تقدیر الٰہی کے ساتھ آیا ہے بلکہ اس ملک میں اسلام کو بھیجا گیا اللہ نے اپنی رحمت، تائید اور اپنی نصرت کے ساتھ اسلام کو بھیجا ہے۔ یہ دین یہاں سے ختم نہیں ہوگا۔''

(ماخوذ از کارروائی رجسٹر مجلس عاملہ بورڈ ۲۵/اپریل ۹۸ء دہلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔

مسلمانوں کا عائلی قانون خودساختہ نہیں بلکہ خدائے بزرگ وبرتر کی طرف سے نازل کردہ ہے

حضرات!

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزو ہے کہ ان کا عائلی قانون (PERSONAL LAW) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی، اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ○ (سورہ ملک: ۱۴)

"وہی کیا وہ آگاہ نہ ہوگا؟ جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی)
باریک بیں اور باخبر ہے۔"

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال، مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے۔

اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید ملت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (LOGICAL CONTRADICTION) (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی و عملی نفاق (HYPOCRISY) کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے بارہ میں عقلی و عملی شواہد، اور مسلم اور غیر مسلم، مشرقی و مغربی فضلاء، جری وانصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی "شپرہ چشم" ہی ان سے انکار کرسکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے اور بڑا قیمتی مواد جمع کردیا ہے متعدد انصاف پسند مغربی فضلاء اور معاشرتی وتمدنی تاریخ کے ماہرین نے ان قرآنی اور شرعی تعلیمات کی برتری کا اعتراف کیا ہے جو عورتوں کے احترام اور ان کے حقوق وتحفظات پر مشتمل ہے۔

اسلام کے عائلی قانون کے توازن واعتدال کے بارہ میں چند اعترافات وشہادتیں

ہم یہاں دو تین شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت

ایک مغربی فاضلہ کی ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی واصلاحی تحریک کی قائد اور جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارہ (تھیاسوفیکل سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں، انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، کسی خاتون کی شہادت اس لئے بھی اہم اور قیمتی ہوتی ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں حساس ہوتی اور اس کی طرف سے دفاع میں دل چسپی رکھتی ہے، مسز اینی بسنت (MRS. ANNIE BESANT) کہتی ہیں:

"......ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جارہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا......جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائیداد، وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا، اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، یک زوجگی اور تعدد ازدواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کردیا ہے اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔" (۱)

مسٹر (N.J. COULSON) لکھتے ہیں:-

"بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے معاملہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں، جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں......اسے قانونی

(۱) Annie Besant, THE LIFE & TEACHINGS OF MUHAMMAD. (Madras-1932).p.3

شخصیت عطا کی گئی جو اسے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے، وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے۔"(۱)

مذہب واخلاق کی انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:-

"پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفّی شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی، بلکہ خود ترکہ پانے کی حق دار ہوگئی، اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہوگیا کہ وہ اسے وہ سب چیزیں دے دے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم اور شاعری سے دلچسپی لینے لگیں اور کچھ استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقۂ عوام کی عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگی، ماں کی عزت کی جانے لگی۔"

یورپ کا معاشرہ تباہی کے آخری دہانے پر

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ انتشار وزوال کے آخری مرحلہ پر پہنچ گیا ہے، عائلی زندگی کی ابتری اور معاشرتی ربط وتعلق کی کمزوری، بے وقعتی اور مذہب واخلاق سے اس کی آزادی اور آخری درجہ کی جنسی بے راہ روی

---

(۱) N.J.Coulson,ISLAMIC SURVEYS: A HISTORY OF ISLAMIC LAW, (Edinburg-1971, p.14)

(۲) RNCYLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS (New York. 1912) .vol. v, p271

نے پورے پورے ملک نہیں بلکہ مغربی تہذیب کو اس انجام کے قریب لاکر کھڑا کر دیا ہے جو قدیم یونانی، رومی، ساسانی تہذیبوں کو پیش آیا اور تاریخ میں صرف اُن کا نام رہ گیا اس انجام سے اس کو اس کی مادّی و صنعتی، علمی و تحقیقی ترقیاں جو نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہیں اور جنگی اسلحہ و سیاسی طاقت اور دنیا کے اقوام و ملل پر حاکمانہ و سرپرستانہ و ناصحانہ و محتسبانہ اثر و نفوذ بھی روک نہیں سکتا کہ جس گھر کا شیرازہ اندر سے درہم برہم ہو چکا ہو، اس کو نہ کوئی جنگی طاقت بچا سکتی ہے، نہ باہر کی مدد، بقول اقبالؔ ؎

خود بخود گرنے کو ہے پکّے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا، لیکن طلاق دینا معیوب ہے اور اس میں ہزاروں دقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

مغرب میں عائلی زندگی اور معاشرت کا جو بحران (CRISIS) پایا جاتا ہے اور اس کا اعصاب و اخلاق پر جو اثر ہے اس کے لئے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے:

"شہری خانہ بدوشوں کی ایک نسل ہے جو خاندان کے مرکز سے بہت دور جا چکی ہے اور جو اپنے کام میں روحانی سکون کی متلاشی ہے، جس کے ذریعہ اُسے حرارت اور تقویت حاصل ہوتی ہے، لیکن (کام کا) نگراں اگر احمق ثابت ہوا یا مشاہرہ ناکافی ہوا یا ملازمت غیر محفوظ یا غیر منفعت بخش ہوئی تو اسے قلبی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی فریب میں مبتلا تھا، اس کے دل کو ایک گہری چوٹ لگتی ہے یا شاید اس چوٹ سے اُسے انکشاف ہوتا ہے کہ اس کے اندر تو پہلے سے ہی خلا موجود تھا اور پھر اس انکشاف

کے بعد وہ پستول کا سہارا لیتا ہے یا پھانسی کے پھندہ کا یا پھر نشہ آور گولیوں کا اور صرف یہ نوٹ چھوڑ جاتا ہے کہ "خاک شدم"۔(۱)

ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے۔

دفعہ ۲۵ ہندوستان کا امتیاز اور دفعہ ۴۴

اس امتیاز کو ختم کرنے کی تیاری

حاضرین کرام!

ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی و عالمی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں مذہبی آزادی اور ملی تشخص کے نہ صرف جواز و امکان کا اعتراف بلکہ احترام کیا ہے، اس خصوصیت کی نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے بلکہ اس کی حفاظت و بقا اور ترقی کو بھی پسند کیا گیا ہے اور اس کو ملک کی عزت و عظمت اور نیک نامی و شہرت کا ذریعہ سمجھا گیا ہے اور اسی کیلئے نامذہبی (SECULAR) اور جمہوری طرزِ حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانبداری اور ذہن و ضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) کو سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام سمجھ کر قبول کیا گیا ہے اور یہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام و ملل، تمدنوں، تہذیبوں اور علوم و فنون اور فلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

اس حقیقت پسندی اور صحیح جمہوریت کے قیام اور ملک کے مختلف فرقوں،

---

(1) Lance Morrow: *THE BURNOUT OF ALMOST EVERYTHING IN THE TIME MAGAZINE*, Washington, Dated September. E. Bodenheimer, JURISPRIDENCE, Harvard,1967 p. 212

آبادی کے مختلف النوع عناصر اور اقلیتوں کو مطمئن رکھنے اور ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو (جو ملک کا قیمتی سرمایہ ہے) اپنے مذاہب وعقائد، اپنے تمدنوں اور تہذیبوں اور اپنے معاشرتی وعائلی اصولوں اور نظاموں کی حفاظت ودفاع میں صرف کرنے کے بجائے، ملک کی تعمیر وترقی، اس کی سالمیت کی حفاظت اور اس کے استحکام اور بین الاقوامی عزت ومقام کے کام پر مرکوز رکھنے کے لئے دستور ہند میں دفعہ ۲۵ شامل کی گئی ہے جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے اور جس میں ہندوستان شہریوں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی ہے، اس دستور کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

> ''امن عامہ، اخلاق اور صحت نیز اس حصہ میں مندرج دوسرے دفعات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اشخاص کو ضمیر کی آزادی اور آزادانہ طور پر مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ و اشاعت کا یکساں حق ہوگا۔''

یہ دفعہ ہندوستان کی سیاسی، نسلی، تمدنی، تہذیبی ونفسیاتی صورت حال کے عین مطابق تھی اور اس پر پوری دیانت داری، خلوص اور عزم وفیصلہ کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت تھی، لیکن اس قابل احترام دستور ہند کا جس میں ملک کے ماہرین قانون اور دستور سازوں کی بہترین ذہنی اور قانونی صلاحیتیں صرف ہوئیں جس نے بہت وقت لیا اور جس کے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک نقطہ اور شوشہ پر طویل اور عمیق بحثیں اور موشگافیاں ہوئی ہوں گی، عجیب وغریب تضاد اور دستور ہند کی تاریخ کا ایک معمہ ہے کہ اسی دستور کے دفعہ ۴۴ کی شکل میں یکساں مدنی قانونی کی دفعہ (UNIFORM CIVIL CODE) شامل کی گئی اور اس کو دستور ہند کے رہنما اصول کا درجہ دیا گیا، اس دستور کا متن حسب ذیل ہے:-

> ''مملکت ہندوستان کے پورے قلمرو میں شہریوں کے لئے

یکساں مدنی ضابطہ (UNIFORM CIVIL CODE) کے حصول کی سعی کرے گی۔"

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک:

(۱) غیر آسمانی عائلی قانونوں میں اصلاح وترمیم کی ضرورت کا احساس

اس مسئلہ کے دو بڑے محرک ہیں، ایک یہ کہ "سلطانی جمہور" کے اس دور میں قانون سازی کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط سمجھا جاتا ہے اور "عائلی قانون" (PERSONAL LAW) زندگی کا ایک ایسا اہم شعبہ ہے جو افراد کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور افراد کو ایک دوسرے سے مربوط بھی رکھتا ہے، جن قوموں یا مذہبی فرقوں میں "آسمانی قانون" کا کوئی تخیل یا عقیدہ نہیں ہے اور وہ عائلی قانون کو محض زندگی کے تجربات کا نتیجہ اور خواہشات وضروریات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں (اور بد قسمتی سے دو بڑے آسمانی مذہبوں اسلام اور یہودیت کے علاوہ عام طور پر مذہبی قوموں اور فرقوں بالخصوص آریائی نسلوں میں یہی تخیل پایا جاتا ہے) ان قوموں اور فرقوں میں اس قانون میں حالات اور ضروریات کے مطابق تبدیلی اور زندگی سے اس کی مطابقت کا احساس اور مطالبہ بالکل قدرتی امر و بدیہی حقیقت ہے، اس لئے کہ وہ انسانوں ہی کے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق بنائے ہوئے قوانین ہیں، زمانہ بدل جانے اور حالات تبدیل ہو جانے سے تمدن وتہذیب اور لباس ومعاشرت کی طرح ان میں بھی اصلاح وترمیم اور تبدیلی نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات فرض و واجب ہو جاتی ہے۔

(۲) مختلف عناصر واجزاء میں وحدت کا رُجحان

دوسرا بڑا محرک کسی ملک کی آبادی کے مختلف عناصر اور اجزا میں زیادہ سے

زیادہ ہم رنگی و وحدت کا وہ عالمگیر رجحان ہے جس کا تقریباً اس صدی کے اوائل سے بڑی قوت وشدت کے ساتھ پروپگنڈہ کیا گیا اور اس میں ادب، شاعری، علم وسیاست اور صحافت وخطابت سب نے پورا حصہ لیا ہے، یورپ سے (جہاں تقریباً ایک مذہب، ایک طریقۂ زندگی، ایک تہذیب، لیکن متعدد زبانیں رائج ہیں) یہ خیال ان مشرقی وایشیائی ممالک میں آیا جہاں کئی کئی مذہب، مختلف تہذیبیں اور مختلف معاشرتی وعائلی نظام بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ مذہب، تہذیبیں اور مختلف معاشرتی نظام کبھی باہمی نفرت، زور آزمائی اور انتشا کا باعث نہیں ہوئے، انتشار وتضاد کا اصل سبب ہمیشہ سیاسی اغراض اور سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے ذاتی مفادات اور اقتدار کی خواہش ثابت ہوا ہے، خود یورپ میں مکمل مذہبی اور معاشرتی وحدت کے باوجود دو دو خوں آشام جنگیں ہو چکیں، جن کے شعلوں سے مشرق وایشیا کا دامن بھی نہیں بچ سکا، پہلی جنگ عظیم بھی اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں اور ان کا عائلی قانون ومعاشرت تقریباً ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر ''یونیفارم سول کوڈ'' جنگ روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دونوں ملک اس طرح سے لڑ پڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں۔

''وحدت'' کا فلسفہ مسئلہ کا حل نہیں

دور کیوں جائیے آپ اپنے ملک بلکہ شہر کی عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ مسلمان مدعی ہے اور مسلمان ہی مدعا علیہ ہے، مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل،

ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یہی حال ہندو فرقہ کا بھی ہے کہ اس میں بھی عائلی قانون (PERSONAL LAW) کی یکسانی اور اشتراک کے باوجود مقدمہ بازی، خانہ جنگی اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت، دولت پرستی کے جنون، حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور اس نظام و نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیئے تا کہ آپس میں اتحاد و اُلفت پیدا ہو، طوطے کی طرح اس بات کو دُہراتے رہنا سطحیت (SHALLOWNES) مرعوبیت اور اندھی تقلید کی ایک افسوس ناک مثال ہے۔

وہی قانون باقی رہ سکتا ہے جو

مبنی بر انصاف اور فطرت سے ہم آہنگ ہو

اس موقع پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہمیر (E.BODENHEIMR) نے فلسفۂ قانون اور اس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری آنکھ کھولنے اور حقیقت پسندی سے کام لینے کے لئے کافی ہے، وہ کہتا ہے:

> ''کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو، لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی

مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتے، جسے وہ نامناسب یا ناقابلِ برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظامِ قانون کو برقرار رکھنے پر مُصر ہو، اسے اس کو نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پُر خطر ہوگا، جیسا کہ جان ڈکنس نے کہا:

''ہمیں کسی عام اور متعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابلِ عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار اور اندرونی رجحانات کی خلاف ورزی کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی۔ اور وہ اتنا ناپائیدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہوجائے گا۔(۱)

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یکسانی اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اگر کوئی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد باہمی تعاون، ملک کی تعمیر وترقی میں گرم جوشی وخلوص اور سکون ومسرت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے، مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی، بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کرسکتا ہے، جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لئے جذام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

یہ دین ہم تک کیسے پہنچا؟

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم، آپ امین

E. Bodenheimer, *JURISPRUDENCE*. Harvard. 1967,p2(1)

اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (SOCIAL WORK) اور بانیانِ سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا یہ سارے گروہ قابلِ احترام ہیں، لیکن "دین" اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (SCHOOL OF THOUGHT) اور خالص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (LINE OF DENARCATION) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (CONFUSION) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وُسعتِ مطالعہ اور وسعت نظام کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں۔

یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حد فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفۂ سماجیات (SOCIOLOGY) کا علم، تہذیب وتمدن (CIVILIZATION) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ، یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں، اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکر ودانش کا ایک مستقل مدرسہ (SCHOOL OF THOUGHT)

بھی ہے لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ کہ وہ ایک دین ہے اور اس کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہیں اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرزِ فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا بلکہ ان سے باہر اور وہ ان سے بلند تھا، اور وہ ان کے لئے اسی درجہ قابلِ احترام اور قابل اطاعت تھا جیسے ہمارے اور آپ کے لئے اور سارے امتیوں کے لئے ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی۔

(سورۃ النجم: ۳-۴)

"اور وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اور ان کی طرف بھیجا جاتا ہے)"

مَا كُنتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْراً نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (سورۃ الشوریٰ : ۵۲)

"تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے نہ ایمان کو، ہم نے اس کو ایک نور کی طرح آپ کے سینہ میں اُتارا اور اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور (بیشک اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سیدھا راستہ دکھاتے ہو"

علم و تجربہ اور وحی و نبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی و نبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بھی بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی اور نفسیاتی تجزیہ یہ

ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارے میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کا اخلاقی یا قانونی طور پر مجاز نہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ایک تاریخی و علمی حقیقت ہے کہ کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی و نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کر لیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی بھی ہے، عمومی بھی، عمیق بھی ہے، اور وسیع بھی، متعین بھی ہے اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ٥

(سورۃ البقرۃ : ۲۰۸)

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔“

اس لئے اگر مسلمان مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کر لیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں۔

مذہب کو معاشرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا

حضرات!

فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے

جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر اور محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط وتعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوتِ ارتداد کا کرنا چاہیئے، اور یہ ہمارا شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہارِ خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

تقسیم ہند کے بعد

ملک آزاد ہونے کے بعد ہی تیز اور دور بین نگاہ رکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ اُفق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں، یکساں سول کوڈ (UNIFORM CIVIL CODE) اور عائلی قوانین میں ترمیم کی صدائیں (کسی قدر خاموشی کے ساتھ) بلند ہونے لگی ہیں اور انھوں نے محسوس کرلیا کہ یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے، کسی وقت ضرور برسے گا، تو انھوں نے مسلم پرسنل لابورڈ کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رُخ کا جائزہ لیا جاتا رہے اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا

سامان کیا جاتا رہے تا کہ اچانک ان پر یہ یا کوئی دوسرا مسئلہ شب خون نہ مارنے پائے، یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا، جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رُخ معلوم ہوگیا اور اتنا ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فیصد متفق ہیں، اس لئے دانش مندی، حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

شاہ بانو کیس ایک ہنگامہ خیز فیصلہ

یہ صورت حال قائم تھی اور مسلمان اقلیت اور اس معاشرہ و ماحول کے دریا کی سطح ساکن تھی کہ ۲۳/ اپریل ۱۹۸۵ء کو سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں نفقہ مطلقہ کے بارے میں وہ ہنگامہ خیز فیصلہ دیا جس سے ملت اسلامی، مسلم معاشرہ، علماء اور دانشوروں اور مسلم ماہرین قانون کے حلقہ میں ایک ایسا تلاطم اور طوفانی کیفیت پیدا ہوئی، جس کی نظیر اپنی وسعت و عمومیت، شدت احساس بلکہ اذیت و کرب کے لحاظ سے عظیم فرقہ وارانہ فسادات، خوں ریزی و انسان سوزی کے لرزہ خیز واقعات کے معاملہ میں بھی نہیں ملتی، اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے تہذیبی، معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ٥

(سورۃ المائدۃ : ۴۴)

"جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں۔"

وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا اور وہ حقیقتاً غیر مسلم جج صاحبان یا قرآن وحدیث وتفسیر، فقہ، اصول فقہ اور عربی زبان میں مہارتِ خصوصی نہ رکھنے والے مسلمان ججوں کے لئے قرآنی آیات، اس کے الفاظ واصطلاحات کی دوسری زبانوں کے ترجمہ کی مدد، سکنڈ ہینڈ معلومات، سطحی اور عاجلانہ مطالعہ اور بعض اوقات ''ترقی پسندی'' یا بیرونی اثرات ومؤثرات سے تأثر کا نتیجہ تھا اور اس سے مَن مانی تفسیر اور خواہش مندانہ (WISHFUL) تشریح کا دروازہ کھلتا تھا، یہ نہ صرف دین وشریعت، مذہبی صحیفوں، بلکہ دنیا کے دائمی عالمگیر اصول اختصاص (SPECILAIZATION) اور علوم وفنون میں ''اتھارٹی'' کے تسلیم واحترام کے اس اصول کے خلاف تھا، جو ساری علمی، فنی دنیا میں صدیوں سے تسلیم کیا جارہا ہے اور جس پر زبان وادب، فلسفہ، منطق، سائنس وٹکنالوجی، اجتماعیات ومدنیات کا نظام چل رہا ہے۔

ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی اسلام سے

وفاداری اور ملی غیرت وخودداری

اس موقع پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملی غیرت وخودداری کا ایسا ثبوت دیا، جس کی نظیر عرصۂ دراز سے ملی ودینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسۂ عام میں جو ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ 500.000 نصف ملین) انسان تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ

پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ارکان اور ملک کے ممتاز علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیراعظم ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویزیں بھیجی گئیں۔اس کے بالمقابل انگریزی و ہندی پریس نے اس مسئلہ پر ایسی مخالفانہ صف آرائی (CONFRONTATION) کا مظاہرہ کیا، جس کی مثال شاید تقسیم ہند اور جداگانہ قومیت کے مسئلہ پر بھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی، پریس اور فرقہ پرست جماعتوں کی قیادت نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی شدت احساس، اس فیصلہ کو تبدیل کرانے کی کوشش اور ایک جزوی عائلی مسئلہ میں اسلام کے قانون شرعی پر عمل کرنے کی اجازت کو بحال رکھنے کے مطالبہ کو جس سے ایک فرقہ (مسلمانوں) کے ایک محدود طبقہ (خواتین) کی ایک چھوٹی سی تعداد (مطلقہ خواتین) متاثر ہوئی تھی ——— کو اس نظر سے دیکھا گویا اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے، یا کوئی ہیبت ناک کوہ آتش فشاں پھٹنے والا ہے، یا کوئی مہلک وبا پھیلنے والی ہے، جیسا کہ میں نے اپنے دہلی کے ڈائلاگ اور پریس کانفرنس میں کہا تھا، انھوں نے اس بارے میں اصول ''احساس تناسب'' (SENE OF PROPORTION) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

''شاہ بانو کیس'' سے ''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل'' تک کی جدوجہد کی مختصر داستان

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم واحترام قانون اور سنجیدگی، وقار کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے) بورڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ وہدایت سے جمہوریہ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انھوں نے راجیو جی سے دو تین

مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کی اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں ان کو اس مسئلہ کی نوعیت واہمیت مذہبی وشرعی نقطۂ نظر اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات وتأثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوشش کی، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب و بے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہنچ چکی ہوگی) صبر وسکون اور احترام کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور وہ اس بارے میں مطمئن ہوگئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے اور اس کی صحیح ترجمانی وہی علماء کرسکتے ہیں جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین وشریعت کے معتبر ترجمان ہیں اور اس سے وہ کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، چنانچہ انھوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر نامور علماء سے تبادلۂ خیال کرلیا ہے اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقۂ اناث (FAIR SEX) بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ ''وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اور ان کو حق دیتا ہے'' وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرأت اور احساس ذمہ داری اور عزم وفیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کا بل پارلیمنٹ میں لائے اور اس پر واضح اور طاقتور وہپ (WHIP) جاری کیا۔

اس بل کے پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے سے پہلے بورڈ کے ذمہ داروں اور قانون داں ممبروں نے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، ان کو اس میں متعدد خامیاں اور اصلاح طلب نقاط نظر آئے، چند ممتاز قانون داں شرکائے کار نے احتیاط کے ساتھ اور ضروری حد تک ایک مختصر فہرست ترمیمات واصلاحات کی مرتب کی اور صدر بورڈ نے اپنے ہاتھوں سے براہِ راست وزیر اعظم صاحب کو بل کے پارلیمنٹ میں آنے سے پہلے پیش کی اور ان سے درخواست کی کہ بل کے پیش کرنے سے پہلے

وہ ان کی روشنی میں بل کو اس مکمل اور صحیح شکل میں پیش کرنے کی تکلیف گوارا کریں، جس سے وہ اس مقصد کی پورے طور پر تکمیل کرے جس کے لئے یہ ساری جدوجہد کی گئی ہے، انھوں نے اس کا وعدہ کیا، لیکن اس تھوڑے وقت میں وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے، انھوں نے اس کو اس کی موجودہ شکل میں ایک بار منظور ہو جانے کو بڑی کامیابی تصور کیا اور وعدہ کیا کہ وہ یہ خامیاں دوسرے موقعہ پر دور کردیں گے اور ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو "تحفظ حقوق مسلم مطلقہ" بل کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا، اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح (جو تائید ومخالفت اور خلوص وسیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی) اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی اور جذبۂ شرافت کے ساتھ اعتراف اور اپنے تشکر وامتنان کا اظہار کیا۔

محترم سامعین!

درمیان میں قبل اس کے کہ بل پر پارلیمنٹ میں بحث ہو ایک اور نازک مرحلہ پیش آ گیا، بل کے پیش ہو جانے کے بعد مخالفین نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا اور جسٹس آئر نے صاف کہا کہ اس بل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے اور چونکہ یہ بل دستور کی دفعہ ۱۴ اور ۱۵ کے خلاف ہے اور دستور میں دی گئی ذاتی آزادی (قانون کی نظر میں یکساں حقوق اور مذہب وصنف کی بنا پر عدم امتیاز) سے ٹکراتا ہے، اور ہندوستان کے باشندوں میں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے، اس لئے سپریم کورٹ بہرحال اس بل کو مسترد کردے گا کہ ایسی قانون سازی جو دستور ہند کی دفعات کے خلاف ہو اُسے مسترد کرنا سپریم کورٹ کی ذمہ داری ہے، ان حالات میں بل میں ایک دفعہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی بدنصیب "مطلقہ" اس بل سے مطمئن نہ ہو، اسلامی قانون کے تحت نفقہ حاصل کرنا نہ چاہتی ہو، بلکہ وہ دفعہ ۱۲۵

ہی کے ذریعہ نفقہ حاصل کرنا اپنے لئے صحیح سمجھتی ہو تو ایسی درخواست دے سکتی ہے اور پھر مجسٹریٹ دفعہ ۱۲۵ ہی کے تحت اس کا فیصلہ کرے گا۔

ترمیم میں یہ کہا گیا کہ صرف مطلقہ کا درخواست دینا اور دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرنا قطعاً کافی نہ ہوگا، بلکہ مطلقہ اور اس کے سابق شوہر دونوں کی رضامندی ضروری ہوگی اور دونوں کی مشترکہ درخواست کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا، جس کی توثیق حلف نامہ کے ذریعہ کی گئی ہو اور اگر تنہا مطلقہ نے درخواست کی تو پھر اس کا فیصلہ بل کے ہی مطابق ہوگا، دفعہ ۱۲۵ کے مطابق نہیں، دوسری شرط یہ لگائی گئی کہ یہ درخواست اور رضامندی مقدمہ کی سماعت کے پہلے ہی دن ہونی چاہئے ورنہ قابل قبول نہ ہوگی۔

یہ گفتگو ۱۹/اپریل ۱۹۸۶ء کو ہوئی، ہم لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کسی ہوشیار اور باریک بیں مخالف قانون داں نے وزیر قانون یا راجیو جی کے کسی اہم مشیر کار کو سمجھایا ہے، اب اگر ہم اس کو مسترد کر دیتے ہیں تو پھر جہاں سے چلے تھے وہیں آجائیں گے اور عنقریب پیش ہونے والا بل تعویق میں پڑ جائے گا، یا تعطل کا شکار ہو جائے گا، راجیو جی کے قریب ترین مُشیر کار نے اس کا بھی اشارہ کیا کہ اگر آپ نے یہ اضافہ مان لیا تو گورنمنٹ خود بل کی حفاظت اور اس کے لئے قانونی چارہ جوئی کرے گی، ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس اضافہ میں دو شرطیں لگا کر دفعہ ۱۲۵ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور عملاً اس کو بیکار کر دیا گیا، دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ شوہر کو تا نکاح ثانی یا حین حیات نفقہ دینا پڑتا ہے، کوئی نادان شوہر ہی ہوگا جو دفعہ ۱۲۵ کے ذریعہ نفقہ کا فیصلہ کرانا چاہے گا اور مطلقہ کی دی ہوئی درخواست پر اپنی رضامندی ظاہر کرے گا اور اس پر دستخط ثبت کرے گا اور کوئی ناخدا ترس اور ناسمجھ مطلقہ ہی ایسی ہوگی جو اسلامی قانون کو چھوڑ کر جس میں اسے ہر مرحلہ میں نفقہ کی ضمانت ہے، ایسے غیر

شرعی قانون کو ترجیح دے گی جس میں اس کے نفقہ کا انحصار شوہر کی خوش حالی اور زندگی پر ہے، اگر شوہر مُفلس ہے یا اس کا انتقال ہو جائے تو پھر مطلقہ کے لئے پریشانی اور حیرانی کے سوا کچھ نہیں۔

اب آپ سے ایمان وقرآن مخاطب ہے

برادرانِ ملت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی وقرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں اور آپ کے عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے، آپ اسلامی اور قرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں، اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا، اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی، مکہ، مدینہ حرمین شریفین سے آئی ہے، قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے، یہ لعنت کہاں سے آئی ہے؟

جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرتِ ملّی کو، آپ کے وجودِ ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں ببانگِ دُہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے، شکایت کرنا ہمارا حق ہے۔

ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں

حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔

حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوان قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں اور اس کو ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقع ملتا رہے، اسی لئے ہم اپنی حکومت سے شکایت کرتے رہیں گے اور ۱۰۰ ربار کریں گے اور اس کو اس پر فخر کرنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اس میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لئے ہمارے ملک کا یہ افتخار ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکانِ حکومت سے، انتظامیہ اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اپنی حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ اُن سے تو شکایت کریں گے، اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان پکڑلیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا، جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حُرمت ہے؟

تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکوت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو

چلائے، اس کا احترام کرے، یہ کیا بوالعجبی ہے؟

آپ عہد کیجئے!

یہاں سے یہ عہد کر کے جائیے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کیے جاتے ہیں، اُن کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے۔ کیا اس کائنات کے خالق اور نوعِ انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ ''رحمۃ اللعالمین'' کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (سورۃ الانفال : ۳۳)

''اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انھیں عذاب دے۔''

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے، اور بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے، پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن و مغلّظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق اَبغض

المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں، لیکن یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے۔

حضرات!

اس موقع پر بورڈ کے بعض نئے اقدامات اور کارگزاری کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ، بہار واڑیسہ اور اس کے واجب الاحترام امیر کی ذاتی نگرانی میں مستند علماء اور ماہرین فقہ کے ذریعہ جدید زبان واسلوب وترتیب کے ساتھ عائلی قانون اور مسائل نکاح وطلاق وحقوق وفرائض کی تدوین کا کام جو چند مہینے پہلے شروع کیا تھا، مرتب ہو کر ممتاز وصاحبِ فن علماء کی نظر سے گزر کر مکمل ہو گیا ہے، اس کی ترتیب کے بعد عدالتوں اور مجلس قانون ساز اور معترضین کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ ہمارے پاس قدیم تراجم کے علاوہ جو زیادہ تر غیر مسلم قانون دانوں اور مصنفین کی مرتب کی ہوئی ہیں، شریعت اسلامی کا مستند و براہ راست مجموعہ قوانین نہیں ہے۔

۲۔ اس کے ساتھ اصلاحِ معاشرت، اصلاح رسوم اور مسلمانوں کی عائلی زندگی کو شرعی احکام، قرآنی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں منظم و بہتر بنانے کی کوشش بھی جاری ہے، اور جا بجا دار القضاء بھی قائم کئے جا رہے ہیں، تاکہ مسلمان اپنے تنازعات اور مسائل خاص شریعت کی روشنی میں حل کریں، اور امکانی حد تک مقدمات واختلاف کا فیصلہ کرانے میں (خصوصیت کے ساتھ جن کا تعلق احکام شرعی

سے ہے) خود کفیل ہو جائیں۔

۳۔ بورڈ کے ذمہ داروں نے بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں جن کا سو فیصدی صحیح اندازہ پہلے سے کرنا مشکل تھا، اس بل کی افادیت کو عملاً ثابت کرنے اور اس سے قانونی طور پر فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لئے دو کام ضروری سمجھے، ایک، یہ کہ بل پر از سر نو ماہرین فقہ اور ممتاز قانون داں (جن کی خوش قسمتی سے خود ارکان بورڈ میں اطمینان بخش نمائندگی ہے) غور، تبادلۂ خیال اور بحث ومباحثہ کے بعد اس کو ایسی ترمیم شدہ شکل میں جو اس مثبت اور تعمیری انداز میں ہو جس سے بل کی بنیادی ضرورت اور افادیت اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تاریخی بلکہ تاریخ ساز جد وجہد لا حاصل اور ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کے مصداق نہ معلوم ہو، اصلاح شدہ بل کو مؤثر اور مؤقر نمائندگی کے ذریعہ وزیر اعظم کو پیش کیا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اس ترمیم شدہ مکمل بل کو (جو اپنے قدیم دائرہ ہی کے اندر ہے) پارلیمنٹ میں پیش کر کے دوبارہ منظور کرائیں، یا وہ طریقہ اختیار کریں، جس سے یہ بل موجودہ شکل میں نافذ العمل ہو، اس طرح وہ اُس جمہوری تقاضہ اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ کے ایک جائز مطالبہ (جو خالص مذہبی بنیاد پر ہے) منظور کرا کے حقیقت پسندی، جمہوری روح اور ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو جو ہندوستان سے باہر بھی دنیا کے وسیع ترین رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے، مطمئن اور شکر گذار ہونے کا موقع دیں، اور یہ بات صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ملک کے مفاد میں ہوگی، بورڈ اس سلسلہ میں جلد عملی اقدامات کرے گا اور اس کا نتیجہ ملک کے سامنے آئے گا۔

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ وزارت قانون یا سپریم کورٹ کے ذریعہ عدالتوں کو یہ اطلاع دے دی جائے کہ مسلم مطلقہ کے معاملہ میں اب زندہ، فعّال،

اور نافذ العمل دفعہ ''مسلم مطلقہ کے حقوق کے تحفظ'' کا (ترمیم شدہ شکل میں) یہ نیا بل ہے، جو ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ نے پاس کیا، اس لئے کہ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ عدالتیں اس بل سے تجاہل عارفانہ برتتی ہیں، یا اس کو نظر انداز کر کے دفعہ ۱۲۵ ہی کے مطابق فیصلہ کر رہی ہیں، جیسا کہ گجرات اور کیرالا وغیرہ کے ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے اس حقیقت کا بھی اظہار ہوا ہے کہ خود وہ وکلاء اور ایڈوکیٹ جو طلاق دینے والے فریق (مرد) کی طرف سے بحث کرتے ہیں، وہ یا تو اس بل سے سرے سے ناواقف ہیں، یا وہ اس کو نافذ العمل ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے اور کامیاب بحث کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں، اور اس کی صحیح وکالت نہیں کرتے، اس لئے ملک کے قانون داں طبقہ کو بھی (خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں) صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کو صحیح صورت حال سے واقف کرنا ضروری ہے، اور بورڈ کو اس سلسلہ میں علمی اور قانونی طور سے اس طبقہ کو (اگر رہنمائی کا لفظ اس کے شایان شان نہیں) مواد مہیا کرانے اور (FEED) کی ضرورت ہے، ورنہ تجاہل اور تغافل کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اور یہ پاس شدہ بل اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا، امید ہے کہ بورڈ اس سلسلہ میں بھی جلد اقدام کرے گا۔

آخر میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کا نیز آپ کی توجہ و التفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا آپ نے مجھے اپنے خیالات کے بے لوث اور آزاد طریقہ پر پیش کرنے کی اجازت دے کر اظہار فرمایا:

ہمیں خوشی ہے کہ یہ اجلاس ایک ایسے تاریخی شہر میں ہو رہا ہے، جس نے ملی مسائل، دینی تعلیم، تحریکِ خلافت و آزادی میں شایان شان حصہ لیا، جہاں سے سب سے پہلے تحریک ندوۃ العلماء کا آغاز ہوا اور اس کے ابتدائی جلسے اور مشاورتی مجالس ہوئیں جن میں اس عہد کے ممتاز و سربرآوردہ علماء شریک ہوئے جس سے

ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی اور ایک تعلیمی تجربہ گاہ دارالعلوم کا منصوبہ تیار ہوا، جس کے لئے حکمت الٰہی نے اسی شہر کے ایک پڑوسی (شہر) لکھنؤ کا انتخاب کیا، یہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی و مفکر حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے والد نامدار، شیخ وقت حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء کا بڑا وقت گزرا، اور یہیں ندوۃ کا تخیل ان کے ذہن میں آیا، یہیں مچھلی بازار کی مسجد پر انگریزی حکومت کے ایک ناروا اقدام پر سارے ہندوستان میں ناراضگی، حفاظت مساجد اور حمیتِ دینی کی لہر دوڑ گئی، جس کی مؤثر ولولہ انگیز ترجمانی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے پُرزور قلم سے ''الہلال'' میں کی، اور اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تلاطم خیز مضمون ''مشہد اکبر'' نکلا یہ تاریخی یادیں اور یہ قابل فخر خصوصیات اس شہر کے لئے، اس اہم اجلاس و سیمینار کے انعقاد کے لئے نہ صرف جواز بلکہ استحقاق پیش کرتی ہیں۔

اجلاس دہم

خطبۂ صدارت

منعقدہ ۲۳/۲۴؍نومبر ۱۹۹۱ء

دہلی

''یہ بھی یاد رکھئے کہ اسلام صرف چند رسوم اور تقریبات کا نام نہیں، چند عبادات تک بھی محدود نہیں ، بلکہ یہ مکمل زندگی گزارنے کا طریقہ اور کامل دین ہے، ایک مختصر جملہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مستقل تہذیب ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں اسلام کا کوئی مخصوص طرز زندگی اور اس کی کوئی مستقل تہذیب نہیں، لہذا دوسری قومیں اور دوسرے ممالک کے لوگ اسلام قبول کریں تو اسلامی عقائد کو لے لینا ہی کافی ہے، تہذیبی اقدار کو لینے اور اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ غیر اسلامی طرز فکر ہے، اسلام کو اصرار ہے کہ عقائد واعمال کے ساتھ، اس کا مخصوص طرز زندگی بھی اپنایا جائے ،قرآن وسنت سے منصوص طریقے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک خاص طرح کی زندگی اور خاص طرح کی معاشرت چاہتا ہے، اسلام میں سونے جاگنے، کھانے پینے سے لے کر عائلی قانون ، نکاح وطلاق اور وراثت تک کے متعین ضوابط و احکام ہیں، اور اسلام کا مطالبہ ہے کہ انھیں کے مطابق زندگی گذاری جائے ، اس کی خلاف ورزی نہ ہو۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

دو حقیقتیں

حضرات!

ایک ایسے وقت میں کہ ملک سیاسی، آئینی، اقتصادی، اجتماعی اور اخلاقی انتشار اور بحران کے ایسے دور سے گزر رہا ہے، جس سے اس کا حال غیر معتدل (Abnormal) اور مستقبل پر خطر و مشکوک نظر آنے لگتا ہے، اور جہاں جانوں، عزتوں مذہبی آزادی، جمہوری قدروں اور نفس مذاہب و ادیان اور ان کے مرکزوں کے بقاء و سلامتی ہی کا مسئلہ درپیش ہے، پھر دہلی جیسے حساس اور فیصلہ کن شہر میں جس کو اس صورت حال اور حقائق و مسائل کا ذمہ دارانہ اور فیصلہ کن مرکز کی حیثیت سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا ہمہ گیر پیمانہ پر سالانہ اجلاس بلانا اور مسلم پرسنل لا اور اس کے سلسلہ میں درپیش خطرات و امکانات کا جائزہ لینا اور ان کی طرف متوجہ کرنا ایک ''بے وقت کی شہنائی'' معلوم ہوتی ہے۔

لیکن بغیر کسی معذرت اور طویل تمہید کے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ خالص ملک

کے مفاد میں ہے اور ایک بروقت اور برمحل اقدام ہے جس کے لئے ملک کے بہی خواہوں اور حقیقت پسند اشخاص، اداروں، حکومت کے ذمہ داروں اور تمام باضمیر انسانوں کو شکر گزار ہونا چاہئے اور اس کا پورا نوٹس لینا چاہئے کہ اس کے بغیر جمہوریت اور اس ملک کا خمیر وضمیر اور اس کا امتیاز باقی نہیں رہ سکتا۔

ملک کی تعمیر وترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے، کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کرسکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر میں اپنے مستقبل کے بارہ میں اپنے عقائد اور اس آئین، ضوابط اور ہدایات کے بارہ میں جن کے مطابق ان کو زندگی گزارنا ضروری ہے، شکوک وشبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لئے بدخواہی نہیں ہوسکتی کہ وہ توانائی جو ملک کی سالمیت، اس کی حفاظت اور تعمیر وترقی میں صرف ہونی چاہئے تھی، وہ شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک وشبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اور ان پر یقین کرنے والی نہیں جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں، اور جو ہمارے لئے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لئے مضر نہیں ملک کے لئے بھی مضر ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے اور اس میں درجوں کا فرق ہے کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی ونبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انہوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کرلیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے، جو عبد ومعبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان خدا کا فرمانبردار بندہ

ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے اور وسیع اور جامع بھی قرآن شریف میں ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۔

(سورۃ البقرۃ : ۲۰۸)

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔"

ان دو حقیقتوں کو اگر سمجھ لیا جائے کہ یہ دین ہمیں وحی سے ملا ہے، نیز یہ کہ پیغمبر کو بھی اس پر عمل کرنے کا حکم ہے، قرآن مجید میں صاف صاف آتا ہے:-

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (سورۃ الجاثیہ : ۱۸)

(اے پیغمبر) ہم نے آپ کو دین کے خاص طریقہ (شریعت) پر کر دیا ہے، تو آپ اسی پر چلتے جایئے اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

نبی معصوم اور نبی محبوب سے یہ کہا جا رہا ہے تو ہم سے کیسے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم شریعت کو بدل دیں۔

یہ دو حقیقتیں ہیں جن کو سمجھنے کے بعد اس غلط فہمی کا پردہ ہی چاک ہو جاتا ہے، اور ایک غیر ضروری صورت حال کا مقابلہ کرنے اور اس پر اپنی ذہانت و توانائی صرف کرنے سے ہمیں چھٹی مل جاتی ہے اور ملک و حکومت کو دوسرے ضروری کاموں کے لئے وقت بچ جاتا ہے۔

ایک سیدھا سوال

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لئے، سالمیت کے لئے اور مشترک وطنی شعور کے لئے ضروری ہے کہ ایک مشترک واحد عائلی قانون (Uniform Civil Code) نافذ ہو، تو میں ایک سیدھی سی بات پوچھتا ہو، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے سکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم جو ہوئی تھی وہ اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کرسچین ہیں پروٹسنٹ بھی ہیں اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کرسکتا ہے کہ جہاں تک عیسائی قانون کا تعلق ہے، ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر "یونیفارم سول کوڈ" جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہئے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسنٹ جن کی تہذیب بھی، عائلی قانون بھی، بلکہ معاشرت بھی ایک ہے، وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں بھی جا کر دیکھ آیئے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف اور ہندو ہندو کے خلاف مدعی ہے، اور مدعا علیہ کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے ہے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، یہ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہو جانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ "یونیفارم سول کوڈ" ہونا چاہئے تا کہ

کوئی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر، ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد، باہمی تعاون، ملک کی تعمیر وترقی میں گرم جوشی، خلوص اور سکون ومسرت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کرسکتا ہے جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لئے جذام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

اس دین کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہم تک انبیاء ومرسلین کے ذریعہ پہنچا

حضرات!

یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم اور آپ امین ہیں، اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Social Workers) اور بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن "دین" اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (School Of Thought) اور خالص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (Line Of Demarcation) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو

آپس میں اتحاد والفت پیدا ہو۔

اس موقع پر ایک مشہور برطانوی ماہر قانون بوڈن ہیمر (EBODEN HEIMER) نے فلسفہ قانون اور اس کی سماجی اہمیت سے بحث کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری آنکھ کھولنے اور حقیقت پسندی سے کام لینے کے لئے کافی ہے، وہ کہتا ہے:

> "کسی قانونی نظام سے جس کا منشا زندگی میں یکسانیت پیدا کرنا ہو اگر لوگوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے تو اس قانون کو ٹوٹنے یا اس سے بچنے سے محفوظ رکھنا حکومت کے ذمہ داروں کے لئے انتہائی مشکل ہوگا، لوگ کسی ایسے قانون کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتے جسے وہ نامناسب یا ناقابل برداشت سمجھتے ہوں، جو حکومت اس قسم کے نظام قانون کو برقرار رکھنے پر مصر ہو اس کے نافذ کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے کوئی نظام جس کی بنیاد انصاف پر نہ ہو غیر محفوظ اور پرخطر ہوگا جیسا کہ جان ڈکنسن نے کہا ہے:
>
> "ہمیں کسی عام اور متعین ضابطہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایسے ضابطہ کی ہے، جس کی بنیاد انسانی ضرورت اور صلاحیت پر ہو، ورنہ وہ نظام قابل عمل نہ ہوگا، یہ قانون منصفانہ اقدار اور اندرونی رجحانات کی خلاف ورزی کرے گا، ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کی جائے گی، اور وہ اتنا ناپائدار ہوگا کہ اس کا جواز ہی ختم ہوجائے گا" (۱)

پھر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یکسانی اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اگر

(۱) E BODEN HEIMER JURIS PRUDENCE HARVARD 1967, P 212

تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ (۱) اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں۔

اسلام کا عائلی قانون خدا کا نازل کردہ ہے

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے، جس نے قرآن اتارا اور عقائد و عبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی اور جو اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:-

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ٥

(سورۃ الملک: ۱۴)

"کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔"

کوئی قانون کسی آبادی کے کسی عنصر، ملک کے کسی فرقہ اور کسی مذہب کے ماننے والوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہے، تو وہ اتحاد، باہمی تعاون، ملک کی تعمیر وترقی میں گرم جوشی، خلوص اور سکون ومسرت کا احساس پیدا کرنے کے بجائے مزید انتشار، بے دلی یا نیم دلی بلکہ مجبوری اور غلامی کا وہ احساس پیدا کرسکتا ہے جو کسی آزاد ملک یا متحدہ قومیت کے لئے جذام اور کوڑھ سے کم نہیں۔

اس دین کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہم تک انبیاء ومرسلین کے ذریعہ پہنچا

حضرات!

یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم اور آپ امین ہیں، اور (محافظ کا لفظ تو بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (Social Workers) اور بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن "دین" اور تہذیب، نظام فکر، مکتب خیال (School Of Thought) اور خالص مطالعہ، غور وفکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل، سرحدی لکیر (Line Of Demarcation) ہوتی ہے، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو اللہ تعالی نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نادانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں، جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں، وہ بعض اوقات ان کی

تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔(۱) اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت نظر کے اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں۔

اسلام کا عائلی قانون خدا کا نازل کردہ ہے

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے، جس نے قرآن اتارا اور عقائد و عبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی اور جو اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:-

اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ۟

(سورۃ الملک: ۱۴)

''کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔''

اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال و مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے، جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا

---

(۱) جیسا کہ شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ میں قرآنی لفظ واصطلاح ''متاع'' کی تشریح میں کیا گیا۔

مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی اور عملی نفاق کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کی عقلی وعلمی شواہد، اور مسلم وغیر مسلم، مشرقی ومغربی فضلاء جری وانصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی "شپرہ چشم" ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے، اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

"شاہ بانو کیس" اور مسلمانان ہند

حضرات!

شاہ بانو کیس کا سپریم کورٹ سے فیصلہ صادر ہونے کے موقع پر ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور ملی غیرت وخودداری کا ایسا ثبوت دیا جس کی نظیر عرصہ دراز سے ملی ودینی تحریکات کی تاریخ میں دیکھنے میں نہیں آئی، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عظیم الشان جلسے ہوئے، بعض اضلاع اور چھوٹے مقامات میں بھی ایک ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع تھا، کلکتہ کے جلسہ عام میں جو ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں منعقد ہوا تھا محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ (نصف ملین) انسان موجود تھے، شمالی ہند سے جنوبی ہند کے آخری سرے، کشمیر کی فلک بوس چوٹی سے جنوب میں کنیا کماری تک جلسوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا، جس میں بورڈ کے ذمہ دار ارکان اور ملک کے ممتاز ترین علماء بذات خود شریک تھے، اس کے علاوہ وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو جی اور وزیر قانون کے نام ہزاروں کی تعداد میں احتجاجی تار اور جلسوں کی تجویز بھیجی گئیں۔

اس ملک گیر عوامی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں کے ساتھ (جس میں نظم

واحترام قانون، سنجیدگی اور وقار کا پورالحاظ رکھا گیا) بورڈ کے ذمہ داروں نے وزیر اعظم ہند راجیو جی سے اور ان کے اشارہ و ہدایت سے جمہوریہ ہند کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین اور ان کے رفقاء سے رابطہ قائم رکھا، انہوں نے راجیو جی سے دو تین مرتبہ شخصی اور خصوصی ملاقاتیں کیں اور آزادانہ و بے تکلفانہ فضا میں ان کو مسئلہ کی نوعیت و اہمیت، مذہبی و شرعی نقطۂ نظر اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے جذبات و تاثرات سے واقف کرانے کی مخلصانہ کوششیں کیں، راجیو جی نے بھی (جن کو یقیناً اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اضطراب و بے چینی اور عظیم الشان جلسوں کی رپورٹ پہنچ چکی ہوگی) صبر و سکون اور احترام کے ساتھ یہ بات سنی اور وہ اس بارہ میں مطمئن (Convinced) ہو گئے کہ یہ مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ ہے، اور اس کی ترجمانی وہی علماء کر سکتے ہیں، جن کا دین کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے اور وہ مسلمانوں کے نزدیک دین و شریعت کے صحیح ترجمان ہیں، اور اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے ہیں، چنانچہ انہوں نے ایک سے زائد بار اس کا اظہار کیا کہ انہوں نے اس مسئلہ پر نامور علماء سے تبادلہ خیال کر لیا ہے اور وہ مطمئن ہیں کہ اسلام طبقہ اناث (Female Sex) بشمول مطلقہ خواتین کے حقوق کا پورا تحفظ کرتا ہے، اس سلسلہ میں یہاں تک ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ وہ موجودہ قانون سے بھی زیادہ ان کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، اور ان کو حق دیتا ہے، وہ حقیقت پسندی، اخلاقی جرأت، اور احساس ذمہ داری اور عزم و فیصلہ کے ساتھ مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کا بل پارلیمنٹ میں لائے اور اس پر واضح اور طاقتور وہپ (Whip) جاری کیا، اور وہ ٦ رمئی ۱۹۸٦ء کو ''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ بل'' کے عنوان سے کھلی اکثریت کے ساتھ پاس ہوا اور مسلمانوں نے ایک ایسی ملت کی طرح جو صحیح و غلط تائید و مخالفت اور خلوص و سیاست میں فرق کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوئی، اس شریفانہ اور جرأت مندانہ اقدام کا پوری فراخ دلی

اور جذبہ شرافت کے ساتھ اعتراف اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا۔

اب ضروری کام یہ ہے کہ وزارت قانون یا سپریم کورٹ کے ذریعہ عدالتوں کو یہ اطلاع دے دی جائے کہ مسلم مطلقہ کے معاملہ میں اب زندہ، فعال اور نافذ العمل دفعہ ''مسلم مطلقہ کے حقوق کے تحفظ'' کا (ترمیم شدہ شکل میں) یہ نیا بل ہے، جو ۶ رمئی ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ نے پاس کیا، اس لئے کہ یہ دیکھا جارہا ہے کہ عدالتیں اس بل سے تجاہل عارفانہ برتتی ہیں، یا اس کو نظر انداز کر کے دفعہ ۱۲۵ ہی کے مطابق فیصلہ کر رہی ہیں جیسا کہ گجرات اور کیرالا وغیرہ کے ہائی کورٹ کے فیصلہ سے ظاہر ہوتا ہے، دوسرے اس حقیقت کا بھی اظہار ہوا ہے کہ وہ وکلاء اور ایڈوکیٹ جو طلاق دینے والے فریق (مرد) کی طرف سے بحث کرتے ہیں، وہ یا تو اس بل سے سرے سے ناواقف ہیں یا وہ اس کو نافذ العمل ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے اور کامیاب بحث کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں، اور اس کی صحیح وکالت نہیں کرتے، اس لئے ملک کے قانون داں طبقہ کو بھی (خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں) صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کو صحیح صورت حال سے واقف کرنا ضروری ہے اور بورڈ کو اس سلسلہ میں علمی اور قانونی طور سے اس طبقہ کو (اگر رہنمائی کا لفظ اس کے شایان شان نہیں) مواد مہیا کرنے اور فیڈ (Feed) کرنے کی ضرورت ہے ورنہ تجاہل اور تغافل کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا، اور یہ پاس شدہ بل اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا، بورڈ کا ایک موقر وفد وی پی سنگھ جی کے زمانہ وزارت عظمیٰ میں ان سے ملا تھا اور ان کو اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داری اور ادائے فرض کی طرف متوجہ کیا تھا، اور انھوں نے اس کا وعدہ کیا تھا، ضرورت ہے کہ یہ کوشش اور سلسلہ جنبانی جاری رہے، اور اس کو ایک مہم کی طرح چلایا جائے۔

دونوں فرقوں کے مذہبی قانون و آئین میں ایک فرق ہے

حضرات!

میں چند لفظ اپنے ان غیر مسلم برادران وطن، دانشوروں اور صحافیوں سے بھی کہنا چاہتا ہوں، جنھوں نے شاہ بانو کیس کے فیصلہ پر مسلمانوں کا شدید رد عمل ظاہر ہونے اور پارلیمنٹ میں مسلم مطلقہ خاتون کے بارہ میں بل پیش ہونے اور پھر اس کے اکثریت کے ساتھ منظور ہونے پر اپنے شدید رد عمل تلخ تنقید و تبصرہ اور حیرت و استعجاب کا مظاہرہ کیا اور اس کو طبقہ نسواں کے حق میں شدید ناانصافی قرار دیا۔

اس سلسلہ میں ایک حقیقت تو یہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلم معاشرہ اور ہمارے ملک کے غیر مسلم معاشرے، سماج، خاندانی زندگی اور ماحول اور اسی کے ساتھ دونوں فرقوں کے مذہبی قانون و آئین میں ایک فرق ہے، جس کو ملحوظ رکھنا چاہئے، وہ یہ کہ اسلام اور مسلمانوں میں عورت کی شادی ہو جانے کے بعد وہ اپنے خاندان، والدین اور بھائیوں سے کٹ نہیں جاتی اور نکاح وطلاق دونوں حالتوں میں خاندان کے ایک ایک فرد ماں باپ (اگر وہ زندہ ہیں) کی بیٹی اور بھائی بہنوں کی بہن ہوتی ہے، وہ ترکہ (Heritage) اور جائداد میں اس پورے حصہ کی مستحق ہوتی ہے جو شریعت اسلامی نے مقرر کر دیا ہے، اور جس کا قرآن مجید میں ذکر اور اس کے دینے کی تاکید ہے اور وہ شرعاً و قانوناً اس کا مطالبہ کر سکتی ہے اور شرعی عدالت اس کے حق میں فیصلہ کرے گی، اس کے خلاف جو عمل کیا جائے گا، وہ گناہ اور شریعت میں مداخلت بلکہ اس سے بغاوت ہوگی۔

اس کے برخلاف (معذرت کے ساتھ کہا جاتا ہے) ہندو معاشرہ اور سماج میں عورت شادی کے بعد اپنے خاندان، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے کٹ جاتی ہے، اس کی کفالت کی ذمہ داری سر تا سر شوہر پر عائد ہوتی ہے، اسی صورت حال اور سماجی ڈھانچہ کی وجہ سے شوہر کے انتقال پر عورت بالکل لاوارث اور تنہا ہو جاتی ہے،

اس کی کفالت، سکونت وحفاظت کی ذمہ داری کسی طرح اس کے خاندان (میکہ) پر عائد نہیں ہوتی اور اس کے لئے عزت کے ساتھ زندگی گزارنا ناممکن ہوجاتا ہے، اسی صورت حال اور رواج نے قدیم زمانہ میں (جس کی تاریخی تحدید مشکل ہے) خواتین کے طبقہ کو جو بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں، ستی کی رسم کی طرف مائل کیا، جو اس کس مپرسی اور لاوارثیت سے نجات پانے کا واحد راستہ نظر آتا تھا، اور صدیوں بلکہ شاید ہزاروں برس سے اس ملک میں یہ رسم جاری تھی اور یہ شریف اور معزز گھرانوں کی ایک روایت اور قابل تقلید بلکہ قابل فخر عمل بن گیا تھا، مسلمانوں نے اپنے زمانہ حکومت میں مذہب میں مداخلت کے الزام سے بچنے کے لئے اس کو قانوناً منسوخ اور ممنوع قرار نہیں دیا لیکن جیسا کہ ڈاکٹر برنیر (Burnier) نے اپنے "سفر نامہ ہند بعہد سلطنت مغلیہ" میں لکھا ہے کہ حکمراں اور بااثر طبقہ کی بیگمات ان گھرانوں میں جاتی تھیں اور بیوہ کو ستی ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھیں (۱) برطانوی حکومت نے اس کو یکسر ممنوع قرار دیا، لیکن اب بھی کہیں کہیں (خاص طور پر راجپوتانہ میں) یہ رسم جاری ہے، اور اس کے واقعات سننے میں آتے ہیں۔

اس فرق کی نشاندہی کے علاوہ جو ضرورتاً اختیار کی گئی اور جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان مطلقہ خاتون طلاق کے بعد یکسر لاوارث نہیں ہوجاتی، اور وہ بھیک مانگنے یا زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتی، وہ اپنے ان اہل خاندان اور خونی رشتہ رکھنے والوں کے پاس عزت کی زندگی گزار سکتی ہے، اس حقیقت کی طرف ادب کے ساتھ ان معترضین وناقدین کو متوجہ کرنا ہے کہ اس مسئلہ سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق خود ان کے فرقہ اور طبقہ نسواں کی سیکڑوں، ہزاروں نئی بیاہی دلہنوں کے جلائے جانے، یا غیر طبعی طور پر ان کو ہلاک کردینے کے وہ واقعات ہیں جن سے

(۱) وقائع سیر وسیاحت ڈاکٹر برنیر جلد دوم ص ۱۷۲

شاید اس لمبے چوڑے ملک میں کوئی دن خالی جاتا ہو۔

یہ اس احساس تناسب (SENSE OF PROPORTION) کے بھی خلاف ہے، جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکر و پریشانی کا مستحق ہے، اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا، نہ عقل سلیم کا تقاضا ہے، نہ عقل عملی (PRACTICAL WISDOM) کا۔

قرآن کا مطالبہ، عملی زندگی کا محاسبہ

برادران ملت!

اب میں اس مجمع کو ایمانی و قرآنی زبان میں خطاب کرنا چاہتا ہوں، اور آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کرتا ہوں، آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی و قرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم و راج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ و مدینہ، حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے، یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملی کو، آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا بھی گریبان پکڑلیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہو گا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا، جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے

ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے؟۔

یہاں سے یہ عہد کر کے جائیے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے(۱) کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی کے ہی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ٥ (سورۃ الانفال : ۳۳)

”اور خدا ایسا نہ تھا جب تک تم ان میں تھے انھیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔“

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائے کہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر، شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام

---

(۱) قومی آواز دہلی ۱۰؍جون ۱۹۸۴ء

دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقہ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے، جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کردیں گے۔

ایسے ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے۔ اور طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے، پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن مغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر آپ یہ بھی سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے، لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہے، اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں (۱)

حاضرین کرام!

آپ اجازت دیں کہ عدالت وحکومت اور آئین ساز ادارہ وانتظامیہ پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ اپنی ملت کا بھی ناقدانہ، لیکن منصفانہ وحقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے، ایک اہم چیز جو عالم غیب میں بڑا اثر رکھتی ہے، اور ملی واجتماعی زندگی میں بھی اس کے اثرات بڑے وسیع اور دور رس ہیں، وہ مسلمانوں کا اپنے ذاتی

---

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے، پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

معاملات پر اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں بے دریغ روپیہ صرف کرنا اور اپنے پڑوسیوں، عزیزوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقر وفاقہ، اضطرار واضطراب اور ان افسوسناک حالات سے چشم پوشی اور بے حسی ہے، جن میں کم سے کم انقلاب کے بعد مسلمان اس ملک میں مبتلا ہو گئے ہیں، فقہ وفتاویٰ کی محتاط ومحدود زبان اور حلال وحرام کے معین حدود واحکام میں خواہ اس کے لئے حرمت کا کوئی صریح فتویٰ اور لرزہ خیز لفظ نہ ملے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعادل ذات اور ربوبیت اور رحمت عامہ صفات کے لئے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے کہ ایک ایسے ماحول وزمانہ میں جہاں ایک کثیر تعداد نان شبینہ کی محتاج ہو، جاں بلب مریض دوا اور برہنہ تن شریف مرد اور عورتیں ستر پوشی سے محروم ہوں کہیں کسی بیوہ کے چولھے پر توا اور کہیں کسی غریب جھونپڑے میں دیا نہ ہو ایک ایک دعوت اور ایک ایک تقریب میں ہزاروں لاکھوں روپئے بے دریغ خرچ کئے جائیں۔

زمانہ کے بہت سے تغیرات وانقلابات اور علم وترقی کے باوجود مسرفانہ اور "شاہانہ" شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا، البتہ بعض جگہ انہوں نے جدید (ماڈرن) طرز اختیار کرلیا ہے، اور سیاسی مصالح ومقاصد بھی کہیں کہیں ان سے وابستہ ہو گئے ہیں، آج بھی ہماری بہت سی برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں تقریبات پر (جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا) دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں مگر انہوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے۔

حقیقتاً اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ان فرائض و

تقریبات کا تخیل ومفہوم یکسر بدلنے کی ضرورت ہے، اس کے خلاف اعلان جنگ اور اعلان بغاوت کی ضرورت ہے، اس بات کو صاف طریقہ پر واضح کردینے کی ضرورت ہے کہ یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لئے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لئے وبال وادبار کا باعث ہیں، اللہ تعالی کی رحیم وحکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام ونمود اور اس عارضی رونق وزینت یا کام ودہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سیکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی۔

خوش حال وسربرآوردہ مسلمانوں کے سامنے یہ واقعہ آنا چاہئے کہ مدینہ منورہ کی محدود ومختصر آبادی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نکاح کرتے ہیں، اور اس ذات گرامی کو اطلاع بھی نہیں ہوتی جس کی شرکت وموجودگی ہر بزم کے لئے باعث فخر وزینت تھی، خصوصا ایک جلیل القدر صحابی اور مہاجر کے کاشانہ کا چراغ بجا طور پر تھی، جس نے ابھی ابھی اس نئے شہر میں قدم رکھا تھا، اور جس کے سارے تعلقات اسی مہاجر برادری سے قائم تھے، اور یہاں کی رونق وبرکت سب اسی ذات عالی کے طفیل تھی، جس سے ازدواجی زندگی کا یہ طریقہ اور اس کے یہ احکام معلوم ہوئے تھے، آج دور دراز کے عزیزوں اور دوستوں کو یہاں تک کہ ان ملکوں سے جہاں پاسپورٹ اور ویزا ہے مدعو کیا جاتا ہے، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ کی شادی کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت ہوتی ہے، جب ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ملاحظہ فرمایا جاتا ہے، پوچھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شادی کرلی ہے، اس وقت برکت کی دعا کی جاتی ہے، اور ولیمہ کے لئے ہدایت ہوتی ہے خواہ ایک بکری ہی ذبح کرکے ہو(۱)

اب وقت آگیا ہے کہ ان ''حوصلہ مندیوں'' پر جن کا ان مواقع پر اظہار کیا

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح مسلم، باب النكاح علی وزن نواة من ذهب

جاتا ہے، ہمارا ذمہ دار طبقہ اپنی پوری ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرے، ان حوصلہ مند حضرات کو بھی سوچنا چاہئے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات، مسلمانوں کی معاشی پستی اور بدحالی بلکہ فلاکت اور ہلاکت کے دور میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ کوئی فرد اپنے یہاں کی کسی ایک تقریب پر اتنے مصارف کردے جس سے ایک برادری کی پرورش یا مکمل ادارہ کا انصرام ہوسکتا ہے؟ ان کو آخرت کے مواخذہ اور حساب سے بھی ڈرنا چاہئے جب ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا اور افراد وملت کی شدید ضروریات کی موجودگی میں اس دریا دلی کا جواز پیش کرنا ہوگا جو اپنی ذات تک محدود تھی، اور جس نے محض نام ونمود یا اپنی حیثیت عرفی کا مظاہرہ اور بعض اوقات اس کو ترقی دینا، اس کی توسیع اور اس سے اجتماعی یا سیاسی فوائد حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

حضرات!

اس طویل سمع خراشی کے بعد اور اس کے ساتھ یہ ناچیز یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی نیاز آگیں آنکھیں اس مؤقر مجمع میں اس شخصیت کے چہرہ کو تلاش کر تی ہیں، جس نے مسلم پرسنل لا میں مداخلت اور مسلمانوں کے دین وشریعت کے صریح احکام کے مطابق عائلی زندگی گزارنے کی نہ صرف دشواری بلکہ اس کے ناممکن ہوجانے کے خطرہ کو شدت کے ساتھ سب سے زیادہ اور بہت پہلے محسوس کیا، اور اس کے لئے اس کے اندر ایسی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا جس نے بالآخر پوری ملت کو اور ملک کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کردیا، ۱۹۷۲ء میں بورڈ کی تشکیل ہوئی اور اس سلسلہ میں وہ مہم اور تحریک چلی جس نے حکومت کو بھی سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور بالآخر وہ ایکٹ پارلیمنٹ سے منظور ہوا جس کی مثالیں ملک کی آئینی وجمہوری زندگی میں کم ملتی ہیں، آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کس محبوب شخصیت سے ہے، پھر بھی دل کو تھام کر عرض کرتا ہوں کہ

مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی وروح رواں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ سے ہے، جن کی ایسے بڑے اجلاس میں پہلی مرتبہ غیر موجودگی شدت سے محسوس کی جارہی ہے، اللہ تعالی ان کے درجے بلند فرمائے اور پوری ملت کی طرف سے ان کو شایان شان جزا عطا فرمائے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

خطبۂ صدارت

اجلاس آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ ۹/۱۰/اکتوبر ۱۹۹۳ء

جے پور

''سچی بات تو یہ ہے کہ سوسائٹی کی تعمیر تو پیغمبروں ہی کے اصولوں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ اور خدا کی دی ہوئی طاقتیں اسی کام پر لگا دیتے ہیں اور ان کی نظر کبھی اس مقصد سے نہیں چوکتی، وہ مسائل کو گڈمڈ نہیں کرتے، وہ سوسائٹی سے ان ہونی امیدیں قائم نہیں کرتے، وہ اس پر وہ بوجھ نہیں ڈالتے جو اس سے اٹھایا نہ جائے، وہ پہلے ایمان اور عقیدہ پیدا کرتے ہیں اس کے اخلاق اور عمل کو سدھارتے ہیں اسی طرح صحیح کیریکٹر پیدا کرتے ہیں، اپنی خواہشات اور فائدوں کے خلاف کام کرنے کی طاقت پیدا کرتے ہیں۔ پھر جس طرح پھل دار اور بے روگ درخت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جس طرح آگ کے ساتھ گرمی اور سورج کے ساتھ روشنی ضروری ہے اسی طرح صحیح کریکٹر اور صحیح تربیت سے آزادی، حکومت کی صلاحیت، قربانی وخدمت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے، انسانی فطرت کا ہمیشہ سے یہی راستہ ہے اور ہمیشہ یہی راستہ رہے گا۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ اجلاس برمحل اور برموقع ہے

حضرات!

میں آپ سب حضرات کا خیر مقدم کرتے ہوئے جو ہندوستان میں امت مسلمہ اور شریعت اسلامی کے مختلف میدانوں میں اور مختلف سطح اور متفاوت درجات کے ساتھ نمائندگی کرتے ہیں، اور توفیق الٰہی کے مطابق دین اور علم کی اشاعت اور شریعت کی حمایت اور دفاع میں مشغول ہیں، اپنے اس احساس واعتراف اور تاثر کو چھپا نہیں سکتا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاس عام صحیح وقت کے ساتھ ایک مناسب، موزوں اور تاریخی ودینی اور شرعی اہمیت کے حامل مقام (جے پور) میں ہو رہا ہے، اس لئے کہ اس تاریخی شہر کے کچھ فاصلہ پر وہ شہر (ٹونک) واقع ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں وہاں شہادت گاہ بالاکوٹ سے حامیان شریعت اور فدایان ملت کا وہ قافلہ منتقل ہوا، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے شہادت فی سبیل اللہ کے بجائے شہادت بالحق اور حمایت واشاعت شریعت کی سعادت مقدر فرمائی تھی۔

میری مراد تیرہویں صدی ہجری کے مجدد اور مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کے متعلقین اور افراد خاندان کا وہ مجموعہ ہے جو ان کے ہم رکاب اور ان

کا ہم سفر تھا، نیز رفقائے سفر ہجرت وجہاد کے وہ عالی حوصلہ، قوی الایمان اور باحمیت افراد جن کے لئے اللہ تعالی نے شہادت جسمانی کے بجائے شہادت ایمانی ولسانی اور شرعی ودینی زندگی کا عملی نمونہ دکھانے اوراس کو برت کر بتانے کی سعادت اورامکان کو ترجیح دی تھی اور جس آیت کی تفسیر ہے:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (سورۃ الاحزاب : ۲۳)

''مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انہوں نے خدا سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انھوں نے (اپنے قول) کو ذرا بھی نہیں بدلا۔''

یہ قافلہ ٹونک کے قوی الایمان، صاحب حمیت وحمایت اسلامی متشرع والی ریاست نواب وزیر الدولہ مرحوم (متوفی ۱۲۸۱ھ۔۱۸۶۴ء) جو سید صاحب کے مرید بااخلاص اور محبّ بااختصاص تھے کی دعوت ہی نہیں بلکہ اصرار اور خوشامد پر ٹونک منتقل ہوا، جس کا بحیثیت ریاست کے کچھ ہی عرصہ پہلے قیام ہوا تھا، اور انہوں نے شہر کے جس حصہ میں قیام اختیار کیا اس کا نام ہی ان کی رعایت سے ''قافلہ'' پڑ گیا، اور آج بھی وہ اسی نام سے مشہور ہے۔

ان بقیۃ السیف اور بقیۃ السلف مہاجرین ومجاہدین کی جنھوں نے ٹونک میں قیام اختیار کیا یہ خصوصیت تھی کہ وہ عقائد وفرائض وعبادات ہی نہیں، عادات و اخلاق ومعاملات، شادی وغمی کی تقریبات اور روزمرہ کی زندگی میں بھی متبع شریعت اور عامل بالسنّت تھے، اوران رسوم وعادات سے جو غیر مسلموں کے اختلاط اور دین و

شریعت سے ناواقفیت یا قدیم رسوم کی پابندی کی وجہ سے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں رواج پکڑ چکی تھیں، اورانھوں نے اکثر مقامات پر شریعت کی جگہ لے لی تھی، نہ صرف محفوظ بلکہ بیزار و باغی تھے، اوران کی زندگی اپنے پورے لوازم و تنوعات کے ساتھ عہد سلف کی یاد تازہ کرتی تھی، اور یہ نتیجہ تھا حضرات شہیدین (حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کی صحبت و تربیت کا۔

پھر اس ریاست کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہاں روز اول سے ریاستوں کے الغا و منسوخی کے آخری دن تک عدالتیں شریعت کے مطابق فیصلہ کرتی تھیں، اور وہاں شرعی قانون ہی نافذ تھا، جس کے ترجمان و شارح اوراس کی تنفیذ و اجراء کا کام کرنے والے جید علماء فقہاء و محدثین تھے۔

اس قرب مکانی اور قابل فخر جوار کا لحاظ کرتے اوراس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؔ کا یہ شعر پڑھنا ہر طرح موزوں اور برمحل معلوم ہوتا ہے ؎

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اس قرب مکانی اوراس پس منظر کے علاوہ یہ بھی اس اجلاس کے برمحل اور برموقع ہونے کی ایک دلیل اور فال نیک ہے کہ یہ اجلاس پہلی مرتبہ اس سرزمین پر ہورہا ہے، جس کو اسلام کے اس مقبول، مؤثر اور عہد آفریں و تاریخ ساز داعی اور مربی روحانی کے مرقد بننے کا شرف حاصل ہے، جس کو ہندوستان کے ایمانی و روحانی فاتح کا لقب دیا جاسکتا ہے، اور جس نے ہندوستان کی زمین، علاقے اور ملک کو اسلام کی تحویل میں لینے کے بجائے اس کا دل جیت لیا اوراس کے عقیدے، معاشرہ اور اخلاق پر سب سے زیادہ گہرا اثر ڈالا، اور اسلامی فتوحات کو حقیقی طور پر مؤثر عمیق اور دائمی بنایا، میری مراد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ذات والا صفات

سے ہے جن کا مرقد مبارک اس راجپوتانہ کی سرزمین کے ایک شہر اجمیر میں واقع ہے

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اسلام اور دیگر نظامہائے زندگی کا ایک بنیادی فرق

سامعین کرام و حاضرین ذوی الاحترام! اب میں اصل موضوع پر آتے ہوئے پہلے یہ عرض کروں گا کہ اسلام، اور دوسرے مذاہب، معاشروں اور نظامہائے زندگی کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں ازدواجی زندگی، مرد و عورت کا تعلق اور عائلی (Personal) رفاقت اور اس کی ذمہ داریاں، ان کے باہمی حقوق و فرائض، مذہب آسمانی اور شریعت خداوندی کا ایک شعبہ اور دین کا ایک جزء ہے، جس کے لئے آسمانی ہدایات، شرعی قوانین اور سنت رسولؐ رہنما اور نمونہ ہے، جب کہ دوسرے مذاہب اور دنیا کے معاشروں اور تمدنوں میں وہ زندگی کی ایک ضرورت، ایک انسانی، نسلی اور تمدنی، کبھی اختیاری اور کبھی اضطراری اور کبھی (مجھے معاف کیا جائے) تفریحی والتذاذی ضرورت ہے، اس بارہ میں اسلام کے امتیاز کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے صحیفہ آسمانی میں طبقہ اناث اور صنف ازواج کو ایک احسان اور مردوں کے لئے ذریعہ سکون اور مستحق مودّت ورحمت قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (سورۃ الروم: ۲۱)

"اور اس کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف (مائل ہوکر) آرام حاصل کرو اور تم میں محبت و مہربانی پیدا

کر دی، جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے ان باتوں میں
(بہت ہی) نشانیاں ہیں۔"

پھر اس حقیقت خلقت اور مظہر رحمت کے آسمانی اعلان کے ساتھ جس کا تعلق طبقۂ اناث اور ازدواجی زندگی سے ہے، نسل انسانی کے رہبر اعظم اور اسوۂ اعلیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور آپ کی سیرت و نمونہ ہے، جس سے ازدواجی اور عائلی زندگی گزارنے کے لئے ہدایات ملتی ہیں، اور رفیقۂ حیات کا درجہ اور اس کا حق معلوم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں چند احادیث پر اکتفا کی جاتی ہے:

عن عائشه رضی الله عنها قالت :قال رسول الله صلی الله علیه و آله و سلم :خیر کم خیر کم لأهله وأنا خیر کم لأهلی: (ابن ماجہ باب حسن معاشرۃ النساء)

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم میں سب سے بہتر ہوں۔"

سیرت اور اسوۂ نبوی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے کسی کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر شفیق و رحیم نہیں دیکھا۔ (۱)

عمرو بن الاحوص جوشمی روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حجۃ الوداع کے موقع پر سنا کہ آپ نے خطبہ میں حمد وثنا اور تذکیر ونصیحت کے بعد فرمایا کہ "عورتوں کے ساتھ اچھا معاملہ رکھو اس لئے کہ وہ تمھاری زندگی میں تمہاری

(۱) مسند احمد وصحیح مسلم

معاون اور رفیقۂ حیات ہیں، ان کا حق ہے کہ تم ان کو اچھا کھلاؤ اچھا پہناؤ'' (۲)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل ایمان میں سب سے زیادہ کامل الایمان وہ ہے جو سب سے زیادہ خوش خلق ہو اور تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں''۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''دنیا ایک گزارہ کی چیز ہے اور اس کی سب سے بڑی دولت نیک بی بی ہے'' (۱)۔

اس ازدواجی تعلق کی اہمیت کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطبہ نکاح سے ہوتا ہے جس میں سورۂ نساء کی پہلی آیت پڑھی گئی، اس میں نسل انسانی کے آغاز کا تذکرہ ہے، جو اس مبارک موقع پر نہایت مناسب اور فال نیک ہے کہ حضرت آدمؑ کی ایک اکیلی ہستی تھی اور ایک رفیقۂ حیات جن سے اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی تخلیق کی اور اس نے روئے زمین کو بھر دیا، اللہ تعالی نے ان دو ہستیوں میں ایسی محبت والفت اور ان کی رفاقت اور ان کی رفاقت میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ آج دنیا اس کی گواہی دے رہی ہے، تو خدا کے لئے کیا مشکل ہے کہ ان دو ہستیوں سے جو آج مل رہی ہیں، ایک کنبہ کو آباد اور ایک خاندان کو شاد وبامراد کردے؟ پھر فرماتا ہے کہ اپنے اس پروردگار سے شرم کرو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ساری زندگی سوالات کا مظہر اور نمونہ ہے، یہی متمدن زندگی کا خاصہ ہے، یہ عقد اور نکاح کیا ہے؟ یہ بھی ایک مہذب اور مبارک سوال ہے، ایک شریف خاندان نے ایک دوسرے شریف خاندان

---

(۱) ترمذی شریف (حدیث حسن صحیح)

(۲) صحیح مسلم، حقوق زوجین کے بارہ میں مذاہب اور اخلاقیات کے تقابلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو، سیرۃ النبی جلد ششم تالیف علامہ سید سلیمان ندویؒ کا عنوان ''حقوق زوجین'' ص ۲۴۸۔۲۶۴۔

سے سوال کیا کہ ہمارے نورعین اور لخت جگر کو رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے، اس کی زندگی نامکمل ہے، اس کی تکمیل کیجئے، دوسرے شریف خاندان نے اس سوال کو خوشی سے قبول کیا، پھر وہ دونوں اللہ کا نام بیچ میں لاکر ایک دوسرے سے مل گئے اور دو ہستیاں جو کل تک ایک دوسرے سے سب سے زیادہ بیگانہ، سب سے زیادہ اجنبی اور سب سے زیادہ دور تھیں، وہ ایسی قریب اور یگانہ بن گئیں کہ ان سے بڑھ کر یگانگت اور قرب کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ اور ایک کا لطف و انبساط دوسرے پر منحصر ہو گیا، یہ سب اللہ کے نام کا کرشمہ ہے، جس نے حرام کو حلال، ناجائز کو جائز، غفلت ومعصیت کو طاعت وعبادت بنادیا اور زندگیوں میں انقلاب عظیم برپا کردیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اس نام کی لاج رکھنا، بڑی خودغرضی کی بات ہوگی کہ تم یہ نام درمیان میں لاکر اپنی غرض پوری کرلو اور کام نکال لو، پھر اس پر عظمت نام کو صاف بھول جاؤ، اور زندگی میں اس کے مطالبات پورے نہ کرو، پھر فرمایا کہ ہاں رشتوں کا بھی خیال رکھنا، اس رشتہ سے قدیم رشتوں کا دور اور ان کے حقوق ختم نہیں ہوجاتے اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ ایسی باتوں کی کون نگرانی کرے گا، اور کون ہمیشہ ساتھ رہے گا، تو فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً ٥ (١)

(سورۂ نساء : ۱)

''اللہ تعالیٰ دائمی نگراں اور محاسب ہے۔''

اس کے برخلاف مختلف قدیم مذاہب اور قدیم وجدید تہذیبوں میں عورت کو کیا درجہ اور کیا حقوق دیئے گئے ہیں، اس سے واقفیت کیلئے وسیع النظری اور ہمت

---

(۱) ملاحظہ ہو پورے خطبہ کی تشریح اور اس کے نکات وحقائق کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں'' ص ۲۰۴ تا ۲۰۹، شائع کردہ ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ''۔

ومحنت کے ساتھ مذاہب اور تہذیبوں کے بارہ میں تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔(۱)

اسلام کے عائلی قانون کے بارہ میں غیر مسلم فضلاء

اور ماہرین قانون کے اعترافات اور تصریحات

اب یہاں پہنچ کر ہم اسلام کے عائلی قانون اور حقوق زوجین کے بارہ میں چند غیر مسلم فضلاء اور ماہرین قانون کے اعترافات اور تصریحات پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ بعض مسلم مکاتب خیال اور ناعاقبت اندیش مسلمان اہل قلم کی تحریروں اور اعلانات سے ہندی وانگریزی پریس میں اسلام کا عائلی قانون اور اس کا ازدواجی نظام، اور اسلام میں رفیقۂ حیات ہی نہیں عورت کا درجہ طنز واعتراض اور تحقیر و تضحیک کا موضوع بن گیا۔

ہم یہاں تین چار شہادتوں پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں سے ایک شہادت ایک مغربی فاضلہ کی ہے، جو ہندوستان میں ایک تربیتی واصلاحی تحریک کی قائد رہی ہیں، اور انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، ہماری مراد مسز اینی بسنت (Mrs Annie Besant) سے ہے، وہ کہتی ہیں:۔

> ''ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جارہے تھے، یہ سب سے منصفانہ قانون تھا، جو دنیا میں پایا جاتا تھا، جائداد، وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا، اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا، یک زوجگی اور

---

(۱) نمونہ کے طور پر ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب ''المرأة بين الفقه والقانون'' طبع پنجم، المكتب الاسلامی بیروت ودمشق، ص ۱۳۔۲۲۔ اور اس کا عنوان ''المرأة في الحضارة الغربية'' ص ۲۶۸، ۲۷۸ ملاحظہ ہو۔

تعداد ازواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ ان سے ان کا دل بھر جاتا ہے، اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا'' (۱)۔

مسٹر (N.J.Coulson) لکھتے ہیں:

''بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں.......... اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے''۔(۲)

مذاہب واخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

''پیغمبر اسلام نے یقیناً عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا، خصوصی طور پر عورت متوفی شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی بلکہ خود ترکہ پانے کی حقدار ہوگئی اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا، طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہوگیا کہ اسے وہ سب

(۱)(ANNIE BESANT, THE LIFE AND TEACHING OF MOHAMMAD, MADRAS-1932-P.3)

(۲) (N.J. COULSON ISLAMIC SURVEYS: A HIOSTORY OF ISLAMIC LAW) (EDINBURG 1971-P.14)

چیزیں دے دے جو اسے شادی کے وقت ملی تھیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم و شاعری سے دلچسپی لینے لگیں اور کچھ نے استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا، طبقہ عوام کی عورتیں اپنے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگیں، ماں کی عزت کی جانے لگی"۔(۱)

تقابلی قوانین کی بین الاقوامی کانفرنس (INTERNATIONAL CONFERENCE ON COMPARATIVE LAW) منعقدہ پیرس کی ایشیائی قوانین کے مطالعہ کی شاخ (BRANCH OF ORIENTAL STUDIES) نے جس میں مغرب و مشرق کے فضلاء قانون شریک تھے، رزولیوشن مورخہ ۷رجولائی ۱۹۵۱ء میں کہا ہے، اسلامی قوانین پر ہفتہ بھر چلنے والے مباحثوں سے مندوبین کے سامنے یہ بات ابھر کر آئی کہ اسلامی قوانین کے اصولوں کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں ہے، قانون کی اس عظیم شاخ میں وہ تمام اصول و طریقہ کار موجود ہیں، جو اسے جدید زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل بناتے ہیں۔"(۲)

مسئلہ جس قدر سنگین ہے اسی نسبت سے اس طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے

حضرات!

یہ واقعہ ہے کہ ملک کے عام باشندوں اور خاص طور پر اخبار بینوں اور ملک میں پیش آنے والی تحریکوں اور سرگرمیوں پر نظر رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ جب سپریم

---

(۱)(ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS, NEWYORK, 1912) VOL. V, P-271)
(۲)ISLAMIC STUDIES QUARTERLY, VOL XXIII, NO 4

کورٹ کے فیصلہ کے خلاف جس میں مطلقہ کو حین حیات نفقہ دلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ایما اور ہدایت پر وہ ملک گیر تحریک چلی جس کی اپنی عمومیت، باہوش جوش اور سنجیدگی اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں، تنظیموں اور مکاتب خیال کے اتحاد وتعاون میں تحریک خلافت کے علاوہ اور اس کے بعد کوئی نظیر نہیں ملتی تو ہندوستان کے غیر مسلم صحافیوں، دانشوروں اور عوام کی طرف سے ایک ایسے ردعمل، جوش ونفرت اور خوف وہراس کا مظاہرہ ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید اس ملک پر کوئی غیر ملکی طاقت حملہ کرنے والی ہے یا بجلی گرنے والی ہے یا زلزلہ آنے والا ہے، حالانکہ یہ اس حقیقت پسندی اور اس احساس تناسب (Sense Of Proportion) کے خلاف ہے جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکر وپریشانی کا مستحق ہے اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ عقل سلیم کا تقاضا ہے نہ عقل عملی (Practical Wisdom) کا، سب کو معلوم ہے کہ اس ملک میں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر دلہنیں اور معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، نیشنل پریس کے ایک صحیفہ ''قومی آواز'' دہلی ۔۱۰ رجون ۱۹۸۴ء کے بیان کے مطابق ''صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹہ پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے'' پھر اس سرزمین پر جہاں ہم آپ اس وقت جمع ہیں، مختلف اطراف میں ستی کی رسم اب بھی جاری ہے، اور اس کے واقعات پیش آتے رہے، ایسی صورت میں کیا احساس تناسب، عقل سلیم اور انسانی ہمدردی بلکہ اپنے فرقہ سے محبت کا تقاضہ یہ نہیں تھا کہ ان مظالم کی طرف توجہ اس سے کہیں زیادہ کی جائے جو مسلمانوں کے اپنے اسلامی عائلی قانون کے تحفظ کے مطالبہ اور یونی فارم سول کوڈ کی مخالفت میں کی جارہی ہے جس سے ملک میں حقیقی اتحاد پیدا ہونے کی امید رکھنا محض خوش فہمی اور دنیا کے واقعات

سے اور دو گذشتہ جنگ عظیم سے سبق لینے کے مخالف ہے، جو ایک ہی عائلی قانون اور سول کوڈ کی ماننے والی دو پروٹسٹنٹ عیسائی قوموں اور ملکوں کے درمیان ہوئی۔

پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے تھا کہ اسلام اور مسلمانوں میں عورت کی شادی ہو جانے کے بعد وہ اپنے خاندان، والدین اور بھائیوں سے کٹ نہیں جاتی، اور مسلمان مطلقہ خاتون طلاق کے بعد یکسر لاوارث اور بھیک مانگنے یا زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتی، نکاح اور طلاق دونوں حالتوں میں وہ خاندان کے ایک فرد، ماں باپ (اگر وہ زندہ ہیں) کی بیٹی اور بھائی بہنوں کی بہن ہوتی ہے، وہ ترکہ (Heritage) اور جائداد میں اس پورے حصہ کی مستحق ہوتی ہے، جو شریعت اسلامی نے مقرر کر دیا ہے، اور جس کا قرآن مجید میں ذکر اور اس کے دینے کی تاکید ہے۔

اس کے برخلاف ہندو معاشرہ اور سماج میں عورت شادی کے بعد اپنے خاندان، ماں، باپ، بھائی بہنوں سے کٹ جاتی ہے، اس کی کفالت کی ذمہ داری سرتاسر شوہر پر عائد ہوتی ہے، اور شوہر کے انتقال پر عورت بالکل لاوارث اور تنہا ہو جاتی ہے اسی صورت حال اور رواج نے قدیم زمانہ میں (جس کی تاریخی تحدید مشکل ہے) خواتین کے طبقہ کو جو بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا، ستی کی رسم کی طرف مائل کیا جو اس کس مپرسی اور لاوارثیت سے نجات پانے کا واحد راستہ نظر آتا تھا۔

اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

حضرات! سپریم کورٹ کے فیصلہ کی منسوخی (جس میں مطلقہ کو حین حیات نفقہ دینے کو لازم قرار دیا گیا تھا) اور پارلیمنٹ میں اس کے خلاف ممتاز تاریخی غیر معمولی اکثریت کے ساتھ پرسنل لا بورڈ کے مطالبہ اور مسلمانوں کی رائے عامہ کے مطابق بل پاس ہو جانے کا جو تاریخ ساز اور یادگار واقعہ پیش آیا اور جس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو کھلی کامیابی ہوئی، اس کے بعد بھی مسلم پرسنل لا بورڈ کا (اور حقیقۃً

شریعت اسلامی کی حفاظت وحمایت کرنے والوں اور مسلمانوں کے عائلی قانون (پرسنل لا) کے باقی رہنے کی جدوجہد کرنے والوں کا کام ختم نہیں ہوا بقول شاعر ؎

مکتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

اس کے بعد ایک اہم مرحلہ تو یہ ہے کہ جو بورڈ کی توجہ کا موضوع اور حقائق وواقعات کا فطری تقاضا کہ بل کے پارلیمنٹ سے پاس ہوجانے کے بعد بھی ہندوستان کی بعض ریاستوں اور بعض مقامات کی عدالتیں سپریم کورٹ کے سابقہ فیصلہ کے مطابق مطلقہ کوحین حیات نفقہ دینے کے حق میں فیصلہ کررہی ہیں، جوصریح قانونی تضاد بلکہ حقیقۃً ایک منظور شدہ قانون سے بغاوت کے مرادف ہے، جو مرکزی حکومت کا پاس کیا ہوا ہے، اور واجب العمل ہے، اس کے لئے بورڈ کی مجلس منتظمہ اور اس کے قانون داں ارکان اور وکلاء کوشش کررہے ہیں اور اس سلسلہ میں مقدمات بھی دائر ہوئے ہیں یہ مرکزی حکومت کا فرض تھا اور ہے کہ وہ اپنے وزیر قانون کے ذریعہ یا اپنے اختیارات سے اس سلسلہ کو بند کرائے، اس سلسلہ میں بورڈ کے ایک وفد نے سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ جی سے ملاقات بھی کی تھی اور ان کی توجہ مبذول کرائی تھی اور انھوں نے اس کا وعدہ بھی کیا تھا، لیکن نہ ان کے عہد حکومت میں اس پر کوئی توجہ دی جاسکتی اور نہ بعد کی حکومتوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور اس میں مرکزی حکومت کی اہانت محسوس ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ پوری توجہ اور تنظیم وامن کے ساتھ احتجاج اور قانونی چارہ جوئی کا سلسلہ جاری رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان محنتوں پر پانی نہ پھر جائے جو اس سلسلہ میں کی گئیں۔

اصلاح معاشرہ کا کام ایک اہم ترین اور بنیادی ضرورت

بورڈ کے اہم ترین اور بنیادی مقاصد میں اصلاح معاشرہ کا کام داخل ہے

اس سلسلہ میں کوششیں ہوتی رہی ہیں، جلسے بھی اور دورے بھی ہوئے ہیں، جن میں سب سے بڑا عوامی جلسہ اور اجتماع یکم مارچ ۱۹۹۲ء کو پٹنہ کے گاندھی میدان میں ہوا، جس کی اپنی وسعت اور مقبولیت میں دور دور تک اور دیر دیر تک نظیر نہیں ملتی، لیکن ضرورت ہے کہ اس کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہندگیر دورے اور عظیم و وسیع جلسے ہوں، دینی جلسوں اور مساجد کے مواعظ و خطبات کا بھی یہ موضوع بن جائے اور عام زندگی پر اس کا اثر پڑے۔

اسلامی عائلی قانون کے موضوع پر ایک مستند اور مفصل کتاب کی تیاری

عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ اسلامی عائلی قانون کے موضوع پر ایک مستند اور مفصل کتاب تیار کی جائے جو آزاد اور شرعی دار القضا سے لے کر سرکاری عدالتوں تک میں ایک قابل اعتماد حوالہ کی کتاب اور فقہی مرجع ہو، انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں محمڈن لا (Mohammadan Law) پر مسلمان ماہرین قانون سے کتابیں لکھوائیں، جن میں جسٹس سید امیر علی اور جسٹس عبدالرحیم کی کتابیں خاص طور پر مشہور و مقبول ہوئیں اور وکلاء اور ججوں نے ان پر اعتبار کیا۔

لیکن ضرورت تھی کہ از سر نو اور زیادہ محنت، وسیع النظری اور دقیق النظری کے ساتھ ہندوستان کے مستند علماء و ماہرین فقہ وحدیث اس کام کو انجام دیں اور ایک ایسی نئی کتاب کی ترتیب عمل میں آئے جو مرجع اور سند کا کام دے۔

اس ضرورت کا احساس سب سے پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کو ہوا، جن کو اللہ تعالی نے دور بینی، بیدار مغزی اور حقیقت شناسی اور خطرات کی آگاہی کی دولت سے خاص طور پر بہرہ مند فرمایا تھا، اور اسی بصیرت اور ذہانت و توفیق الٰہی نے ان سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا

بورڈ کی تشکیل کا کام لیا اور انھوں نے اپنی نگرانی و سرپرستی میں مونگیر میں یہ کام شروع کرادیا لیکن اس کام کی تکمیل کی نوبت نہیں آئی تھی کہ انہیں سفر آخرت پیش آگیا۔

لیکن مولانا مرحوم کی وفات کے بعد بھی بورڈ اور امارت شرعیہ نے اس کام کو جاری رکھا اور ہندوستان کے مستند و ممتاز علماء، ماہرین فقہ اور مفتیان عظام نے اپنے مقامات سے سفر کر کے مونگیر اور پٹنہ میں ربیع الاول ۱۴۱۴ھ میں توفیق واعانت الٰہی سے یہ کام مکمل کرلیا، جس کو فی الحال ''اسلام کے عائلی قوانین کی دفعہ وار تدوین'' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے(۱)۔

ضرورت ہے کہ اس کتاب کو انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہوتا کہ وکلاء اور جج صاحبان بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں، اور قدیم محمڈن لا کی کتابوں کے قائم مقام ہو اور اس کی ایک سند اور مرجع کی حیثیت ہو۔

آخری بات

حضرات سامعین کرام! اب میں دین کے ایک نمائندہ اور داعی کی حیثیت سے اور ''مسلم پرسنل بورڈ'' کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے آپ سے ایمانی وقرآنی زبان میں کچھ خطاب کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بغیر یہ شرف جو آپ نے اس عاجز کو بخشا ہے، اور یہ قیمتی وقت جو آپ نے اس مؤقر مجلس میں شرکت کے لئے دیا ہے، اس کا حق نہیں ادا ہوگا اور اندیشہ ہے کہ اللہ کے یہاں محاسبہ ہو، یہاں پر میں اس عرضداشت

---

(۱) اس تدوینی اور اہم علمی کام میں جن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ وقت دیا اور اس کے مستقل شرکاء تھے ان میں مولانا مفتی نعمت اللہ، (مفتی امارت شرعیہ) مولانا برہان الدین، سنبھلی (دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا مفتی احمد علی سعید (دارالعلوم وقف) مولانا ظفیر الدین (دارالعلوم دیوبند) اور مولانا نصر اللہ مفتی امارت شرعیہ کا خاص حصہ ہے، جزوی شرکاء میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام (قاضی امارت شرعیہ) مولانا ولی رحمانی (سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ ونگراں مجلس ومیزبان) ہیں۔

کا اعادہ کروں گا جو دہلی کے اجلاس منعقدہ ۲۳۔۲۴ر نومبر ۱۹۹۱ء میں کی گئی تھی۔

آپ دیکھئے کہ آپ اسلامی وقرآنی قانون معاشرت کا خود کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی ہے؟ مکہ ومدینہ حرمین شریفین سے آئی ہے؟ قرآن مجید کے راستہ سے آئی ہے؟ یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو بطور سزا کے آپ کی غیرت ملی کو، آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بنایا جاتا ہے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے لیکن آپ کا گریبان پکڑ لیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے اس کا احترام کرے۔

یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی کو (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) یہ چیز

گوارا ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے؟ خدا کی رحمت ونصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین ﷺ کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی، میں نے دہلی ہی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ٥ (سورۃ الانفال : ۳۳)

''اور خدا ایسا نہ تھا جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔''

آپ رحمۃ للعالمین ﷺ کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کی عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر، شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے، جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کردیں گے۔

ایسے ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہو۔ اور طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے، پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے اس کو سمجھنا چاہئے، یہ بھی جاننا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتا ہے؟ طلاق بائن مغلظہ کیا ہوتا ہے؟ پھر آپ یہ بھی سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

ہے کہ جائز ہے لیکن آخری درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہوگیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے جتنا طعنہ دیتے ہیں اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں۔(۱)

حضرات! اب آپ اس اجلاس سے جو جے پور میں ''جامعہ ہدایت'' کے سایہ میں ہو رہا ہے، اپنے اپنے مقامات پر واپس ہو جائیں گے، ضرورت ہے کہ آپ جامع پیغام ہدایت لے کر جائیں اور یہ اجلاس نہ صرف آپ کے عائلی اور خاندانی دائرہ میں کتاب وسنت اور ہدایت ربانی کے مطابق زندگی گزارنے، اہل حقوق کو ان کے حقوق ادا کرنے اور ایک صالح وعادل اور متبع سنت معاشرہ کا نمونہ پیش کرنے کا باعث ہو بلکہ آپ کے ذریعہ آپ کے ہم وطن اور ہم شہر مسلمانوں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے سامنے بھی اسلامی عائلی زندگی اور صالح معاشرہ کا ایک ایسا نمونہ سامنے آئے جس سے ان کو صرف اسلام کی تعلیمات کی قدر اور اعتراف ہو بلکہ اس کی طرف کشش اور انجذاب پیدا ہو۔ وماذلك على الله بعزيز۔

(۱) ابن ماجہ باب (۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے، جو بیان کی جاتی ہے، اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے پھر بھی تھوڑی سی بے اعتدالی ضرور ہے۔

اجلاس دوازدہم

خطبۂ صدارت

منعقدہ ۷/۸/ ۱ اکتوبر ۱۹۹۵ء

احمد آباد- گجرات

”ملک کا سیاسی مستقبل نہایت اندیش ناک ہے محض فرائض کا نام دین نہیں ہے شعائر اسلامی اور قوانین شریعت کا تحفظ بھی دین کا اہم شعبہ ہے اس لئے ہمارا یہ سفر ابھی جاری رہے گا ہر دور میں ادارے اور تحریکیں اٹھی ہیں مسلم پرسنل بورڈ بھی ایک تحریک ہے اس لئے ہمارا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔“

(ماخوذ از رجسٹر کارروائی مجلس عاملہ ۸/مئی ۹۱ء لکھنؤ)“

خطبۂ صدارت اجلاس دوازدہم

الحمدُ للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد و الہ وصحبہ اجمعین و من تبعھم باحسان و دعابدعوتھم الیٰ یوم الدین

حضرات علمائے کرام، برادرانِ اسلام وحاضرین جلسہ!

اہلِ عرب جب کسی عمل یا کارروائی کے متعلق یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ برمحل اور برموقع ہوئی تو کہتے ہیں "جاء فی مکانہ و فی اوانہ" یہ بات اپنے صحیح محل ومقام اور مناسب موقع اور وقت پر پیش آئی (یا پیش کی گئی)

اس حقیقت پسندانہ جملہ کی روشنی میں پہلے اس حقیقت اور واقعہ کا اعتراف واعلان کیا جاتا ہے کہ "مسلم پرسنل لابورڈ" کا یہ بارہواں (۱۲) اجلاس اپنے صحیح محل و مقام پر ہورہا ہے، اور پھر عرض کیا جائے گا کہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کی بنا پر منعقد کیا جارہا ہے اور وہ ایک فریضہ کی ادائیگی اور حقیقت پسندی اور فرض شناسی کا ثبوت ہے۔

صوبۂ گجرات کی شاندار علمی وتہذیبی تاریخ اوراس کا تقاضہ

جہاں تک اجلاس کے محل و مقام کی مناسبت اور اس اہم اجلاس کے یہاں منعقد کرنے کے جواز بلکہ معقولیت اور صحیح انتخاب کا سوال ہے، صوبۂ گجرات (جو اس صوبہ کا قدیم تاریخی اور علمی دنیا میں معروف نام ہے) کے بارے میں ہندوستان کے اسلامی عہد کے سب سے بڑے مؤرخ وسوانح نگار پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء(۱) کی کتاب کے چند اقتباسات پیش کرنے پر قناعت کی جائے گی، جو گجرات کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔

> ''علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا، تو حدیث کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا، علم حدیث کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ یہاں فقہ میں بھی شاندار کارنامے انجام پائے تھے، ہندوستان کے کسی دوسرے علاقہ کی علمی اور تمدّنی سرگرمیوں کی تاریخ اتنی مسلسل اور طویل نہیں ہے جتنی گجرات کی۔''

اس اجلاس وموضوع کی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ گجرات کا فقہ حنفی اور اصول فقہ میں بھی امتیازی حصہ ہے، یہاں مفتی رکن الدین ناگوری نے جو نہروالہ کے مفتی تھے، فقہ حنفی کی دوسو چار ۲۰۴ کتابوں کو پیش نظر رکھ کر فتاویٰ حمادیہ تصنیف کی، جس کے حوالے فتاویٰ عالمگیری میں جابجا ملتے ہیں۔

اسی طرح مفتی قطب الدین (م ۹۹۹ھ) کا ذکر کئے بغیر بھی رہا نہیں

---

(۱) متوفی ۱۳۴۲ھ-۱۹۲۳ء، ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب نزهة الخواطر یا الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام (۱-۸) الثقافة الاسلامية في الهند، الهند في العهد الاسلامي۔ (عربی) یا دایام یا تاریخ گجرات اور گلِ رعنا (اردو)

جاتا جن کو حرم شریف میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا، علامہ قاضی شوکانی صاحب نیل الاوطار نے اپنی کتاب ''البدر الطالع'' میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حرمین شریفین اور دیار عرب میں، جن کے فضل و کمال کا سب سے زیادہ اعتراف کیا گیا، اور جن سے استفادہ کو باعث فخر و شرف سمجھا گیا، وہ زیادہ تر علمائے گجرات تھے، و کفیٰ به فخراً و شرفاً۔

اس سلسلہ میں وزیر آصف خان کا نام لینا کافی ہوگا، جن کو یہ شرف و خصوصیت حاصل ہے کہ علامہ ابنِ حجر مکّی نے ان کے حالات پر مستقل رسالہ لکھا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:-

> ''جس زمانہ میں آصف خاں مکّہ معظّمہ میں آکر رہے تھے، عجب طرح کی رونق مکّہ معظّمہ میں پیدا ہوگئی تھی، علماء و فقہاً اُن کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے، گھر گھر علم کا چرچا ہوگیا تھا، مکّہ والوں نے تحصیل علم میں پوری کوشش کی تھی، انہوں نے اہلِ علم پر اپنے احسان و کرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا، جس کی نظیر اُن کے معاصرین میں بلکہ ایک مدّت سے مفقود تھی، علامہ عزالدّین عبدالعزیز مکّی نے آصف خاں کی مدح میں چھیاسی شعر کا قصیدہ لکھا''۔

علوم دینیہ بالخصوص فقہ و قضاء و افتاء کی صلاحیت میں علمائے گجرات کے امتیاز و اختصاص کا نتیجہ تھا کہ سلطنت دہلی نے بھی، اُن کے اس امتیاز و اختصاص سے فائدہ اٹھایا، اور اُن کو ''قاضی القُضاۃ'' کے عہدہ پر فائز کیا، قاضی شیخ الاسلام گجراتی دارالملک دہلی کے قاضی تھے، ۱۰۸۶ھ میں عالمگیر نے اُن کو مجبور کر کے ''اقضی القُضاۃ'' کا عہدہ عنایت کیا، اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض انہوں نے

نہایت آزادی اور راست بازی کے ساتھ انجام دیئے اور حق بات کے ظاہر کرنے میں کسی بادشاہ کے سامنے بھی نہیں چوکے، ان کے بعد ان ہی کے داماد قاضی ابو سعید ۱۰۹۴ھ میں اُن کی جگہ "اقضی القُضاۃ" کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے، عہد عالمگیری میں دہلی کے "اقضی القُضاۃ" کے عہدہ کے لئے گجرات ہی کے علماء کا منتخب ہونا، اس کے علمی وفنّی امتیاز کا کھلا ثبوت ہے۔

شخصی، خاندانی وموروثی سلطنت کے دور میں والیانِ سلطنت اور اُن کے وزراء کا نہ صرف مُتّبع شریعت وسنّت ہونا، بلکہ صلاح وتقویٰ میں اور شرع و دین کی واقفیت میں ممتاز ہونا، پوری قلمرو، زیر حکومت علاقہ، اور خواص وعوام کے طبقہ پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس سے پوری قلمرو میں دین کا احترام اور شریعت پر عمل کرنے کا جذبہ اور رُجحان پیدا ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں بھی گجرات کو ایک محدود لیکن طویل مدّت تک (یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں بعض ایسے سلاطین صاحب اقتدار اور فرمانروائے ملک رہے ہیں، جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کے صوبوں کی تاریخ اور سلاطین وقت کی سوانح (سلطان محی الدین اورنگ زیب کو مستثنیٰ کر کے، جن کو بعض فضلائے عرب نے "سادس الخلفاء الراشدین" کا لقب[1] دیا ہے) میں مشکل سے ملتی ہے، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں مُظفّر شاہ حلیم گجراتی (م ۹۳۲ھ) کی ذات ہے، مولانا سید عبدالحی صاحبؒ، اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "فضل وکمال کے ساتھ تقویٰ وعزیمت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی، تمام عمر نصوصِ احادیث پر عمل رہا، ہمیشہ باوضو رہتا، نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا، روزے عمر بھر نہیں چھوٹے۔"

---

(۱) نامور عرب ادیب ومصنف علامہ علی الطنطاوی مراد ہیں۔

اُن سلاطین میں بعض ایسے سلاطین بھی گذرے ہیں، جن کی خدمتِ دین، اشاعتِ علم اور اس کی سرپرستی کا دائرہ گجرات ہی کے حدود سے نہیں بلکہ ہندوستان کے حدود سے بھی نکل کر مرکز و مصدر علم دین ''حجاز مُقدّس'' تک وسیع تھا۔ وکفی به فخراً و شرفاً۔

مولانا سید عبدالحئی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:-

''محمود شاہ دوم (م ۹۶۱ھ) کی توجہ و سرپرستی سے مکّہ معظّمہ میں ایک عظیم الشان مدرسہ باب عُمرہ سے متصل قائم کیا گیا، جس میں علاّمہ شہاب الدین ابن حجر مکّی اور عزّ الدین عبدالعزیز زمزمی وغیرہ علمائے مکّہ، تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، علاوہ اُس کے کئی رباط اور مکتب مکّہ معظّمہ میں تعمیر کیے گئے۔

محمود شاہ نے اس پر قناعت نہیں کی بلکہ اس نے خلیج کنبایہ (کھمبایت) میں ایک بندرگاہ کی آمدنی محض حرمین محترمین میں رہنے والوں کے واسطے وقف کر دی تھی، یہاں سے ایک لاکھ اشرفیوں کی قیمت کا مال جدّہ بھیجا جاتا تھا، اور اُس کے بھیجنے میں جو کچھ صرف ہوتا تھا، وہ خزانۂ شاہی سے دیا جاتا تھا، اس مال کے فروخت سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی، وہ سب اہل حرمین محترمین پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔''(۱)

حضرات! ان قابلِ فخر تاریخی حقائق اور گجرات کے شاندار علمی و دینی دور کا تقاضہ ہے کہ حفاظت و حمایتِ شریعت بلکہ غیرتِ دینی و حمیّتِ اسلامی کا جو قدم ہندوستان بلکہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اُٹھایا جائے، اور مسلمانوں کو پوری

---

(۱) یاد ایام ص ۵۶ بحوالہ ظفر الوالہ مصنفہ محمد بن عمر الآصفی۔

شریعت پر عمل کرنے، جس میں وہ عائلی قانون (پرسنل لا) بھی داخل ہے، جس کی بنیاد کتاب و سنّت کے نصوص، آیات قرآنی اور احادیثِ صحیحہ پر ہے، اور اپنے معاشرتی معاملات، ازدواجی و عائلی زندگی کے مختلف مراحل اور تقاضوں کے سلسلہ میں شرعی و قانونی طور پر خود کفیل ہونے، اور اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کی دعوت دی جائے تو اہلِ گجرات اس پر لبیک کہیں اور اس کے لئے اپنے صوبہ کی فضا کو موافق و معاون بنائیں، بلکہ اس کی کامیابی اور نفاذ کے لئے اگر ہندوستان کے کسی گوشہ سے بھی صدا لگائی گئی ہے، اور اس کے لئے جدّ و جہد شروع کی گئی ہے تو اس کے ساتھ پورا تعاون و اشتراک کریں۔

اسلام کا عائلی قانون بلند و برتر اور فطرت انسانی کے مطابق ہے

حضرات! اب جب اسلام کے عائلی قانون کا تذکرہ آگیا ہے تو مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عائلی قانون کی بلندی و برتری، اس کے انسانیت کے احترام، فطرتِ انسانی سے مطابقت، عورت کے اسلام میں مرتبہ اور اُس کے حقوق کے اعتراف، اس کے ساتھ انصاف بلکہ رعایت و فیاضی کے بارے میں بھی کچھ عرض کیا جائے، اور قوانین مروّجہ دنیا کے مختلف مذاہب و تہذیبوں، اور معاشرتی و ازدواجی زندگی کے رائج الوقت نمونوں اور مناظر کو سامنے رکھ کر، تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی روشنی میں کچھ غیر مسلم مفکرین، ماہرین قانون، تمدّن و تہذیب عالم کے مؤرخین اور فضلاء کے اقوال پیش کئے جائیں، جنہوں نے اسلام کے عائلی قانون کی برتری، انصاف پروری، احترام انسانی نہیں بلکہ احترامِ نسوانی کا برملا اعتراف کیا ہے، اس کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ عام طور پر غیر اسلامی ذرائع ابلاغ، پریس اور یک طرفہ ناقدین نے اس کے بارے میں عام طور پر یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ

اسلام کا عائلی قانون، طبقۂ نسواں کے ساتھ انصاف پر مبنی نہیں ہے، وہ قدیم تہذیب و معاشرت اور اس عہد کی یادگار ہے، جب عورت کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا، جس کی وہ مستحق ہے، اور یہ قانون اب اس ترقی یافتہ دور میں باقی رہنے اور چلنے کے قابل نہیں ہے، جب حقائق سے پردہ اٹھ گیا ہے، قدیم رسم و رواج داستانِ پارینہ بن گئے ہیں۔ عورت زندگی میں برابر کی شریک ہے، اور اب ترقی یافتہ مغرب ہی اس سلسلہ میں قابل تقلید و استفادہ ہے۔

اس پروپیگنڈہ کا کچھ اثر مسلمان بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر بھی ہوا ہے، اور وہ ایک طرح کے احساس کہتری Inferiority Complex میں مبتلا ہو گیا ہے اور اس میں اپنے عائلی قانون پر افتخار ہی نہیں، اعتماد و اطمینان اور دفاع کا جذبہ بہت جگہ سرد پڑ گیا ہے، ہم اس موقع پر چند مغربی ماہرین قانونِ مؤرخین تمدّن و تہذیب اور مغربی دانشوروں کے اقوال پیش کرتے ہیں، جنہوں نے صاف اس بات کا اعتراف کیا ہے، کہ اسلام کا عائلی قانون، دوسرے قوانین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منصفانہ، حقیقت پسندانہ، اور کہیں زیادہ طبقۂ نسواں کے احترام اور اس کے ساتھ انصاف و مراعات پر مبنی ہے، یہ بیانات ہمارے مرعوب تعلیم یافتہ طبقہ کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دینے کے لئے کافی ہیں جس نے آزاد تقابلی مطالعہ کی زحمت گوارہ نہیں کی، اور وہ یک طرفہ سطحی بیانات سے متأثر ہے۔

اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ایک مغربی فاضلہ کا بیان پیش کرتے ہیں، اس لئے کہ اس سلسلہ میں خواتین زیادہ حسّاس (Sensitive) جذباتی، زود احساس اور رقیق الشعور (Sentimental) واقع ہوتی ہیں اس لئے کہ یہ اُن کے طبقہ کا قضیّہ ہے، اور وہ اپنے طبقہ کی طرف سے دفاع اور اس کی حمایت اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

مسز اینی بسنٹ (Mrs. Annie Besant) ہندوستان میں ایک تربیتی اصلاحی تحریک کی قائد اور جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارہ (تھیا سوفیکل سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں، انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، وہ اپنی کتاب ''ہندوستان کے عظیم مذاہب'' میں لکھتی ہیں:-

''قرآن مجید کی آیت ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (النساء-۱۲۴) (اور جو کوئی نیکیوں پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا) پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات عام اخلاقی ہدایات میں محدود نہیں، بلکہ عورتوں کی وراثت کے لئے پورا قانون قرآن میں موجود ہے، اور وہ قانون اپنے عدل و انصاف اور آزادی کی وسعت اور کارفرمائی میں اس مسیحی و انگریزی قانون سے کہیں زیادہ فائق ہے، جس پر اب سے بیس ۲۰ سال پہلے تک برطانیہ میں عمل ہوتا رہا ہے، اسلام نے عورت کے لئے جو قانون بنایا ہے، وہ ایک مثالی قانون کا درجہ رکھتا ہے، اس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اور امکانی حد تک ان کی مدد کا ذمہ لیا ہے اور اُن کے کسی ایسے حصہ پر (جو وہ اپنے اعزاء، بھائیوں اور شوہروں سے پائیں) دست درازی کا سدّ باب کر دیا ہے[1] ''۔

ایک دوسری جگہ لکھتی ہیں:-

---

(۱) کتاب ''ہندوستان کے عظیم مذاہب''۔

''یک زوجگی و تعدُّد ازدواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے، اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر ڈالنا نہیں چاہتے، جس سے اس کے اوّلین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے اُن کا دل بھر جاتا ہے، اور پھر اُن کی کوئی مدد نہیں کرتا۔(۱)''

عظیم و نامور فرنچ مصنف و دانشور گستاؤلیبان (Gustavli Bon) اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''تمدن عرب'' میں لکھتا ہے:-

''میراث کے وہ اصول جو قرآن میں صراحت کے ساتھ آئے ہیں، وہ عدل و انصاف کا ایک واضح مظہر ہیں، ان کے اور ان حقوق و قوانین کے درمیان مقابلہ کرنے سے جو فرانس و انگلستان میں عورت کے بارے میں ہیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی نے شادی شدہ خواتین کو (جن کے بارے میں مغرب میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے) میراث کے وہ حقوق دیئے ہیں جن کی نظیر ہمارے قوانین میں نہیں ملتی، اسلام کا اثر مشرق میں عورت کی پوزیشن پر بہت گہرا اور وسیع تھا، اس نے عورت کی معاشرتی پوزیشن کو گھٹانے کے بجائے بہت بلند کر دیا ان تمام دعاوی و مزعومات کے خلاف، جو بغیر کسی دلیل و مطالعہ کے یورپ میں دہرائے جاتے ہیں، قرآن نے عورت کو وہ وراثتی حقوق عطا کئے ہیں، جو ہمارے مغربی قوانین سے کہیں بہتر ہیں، اسلام میں

(1) Annie Besant The Life of Muhammad, Madrasa.1932 p.3

عورتوں کے مرتبہ واہمیت پر اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ عربوں کے تمدن کے عروج کے زمانہ میں اُن میں کثرت سے ایسی خواتین نظر آتی ہیں، جو بڑا بلند علمی وادبی مقام رکھتی تھیں (۱)، عہد عباسی میں ان کی ایک بڑی تعداد مشرق میں اور عہد اموی میں اسپین (اندلس) میں پائی جاتی تھی (۲)۔"

والٹیر (Voltaire) اپنے مضمون میں، جو فلسفۂ قرآن کے عنوان سے ہے، ڈکشنری آف فلاسفی (Dictionary of Philosophy) میں لکھتا ہے:۔

"ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ قرآن، عورت کا وہ امتیاز مانتا اور بیان کرتا ہے، جو اس کو فطرت کی طرف سے ملا ہے، لیکن قرآن اس بارے میں تورات سے مختلف نظر آتا ہے کہ وہ عورت کی فطری کمزوری کو "خدائی سزا" نہیں مانتا، جیسا کہ سفر التکوین الاصحاح الثالث نمبر ۱۶ میں ہے۔

یہ غلط بیانی اور تلبیس کی بات ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے عظیم شارع کی طرف عورتوں کے حق میں زیادتی و ناانصافی منسوب کی جائے، حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:

---

(۱) ان باکمال و بافیض خواتین کی فہرست بہت طویل ہے، اور اس کے لئے ان کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا، جن میں ان فاضلات ومُعلّمات، ادیبات وشاعرات اور صالحات و عابدات خواتین کے تراجم ہیں، یہاں پر صرف ایک نام لینا کافی ہوگا، جن کا نام کریمہ بنت احمد بن محمد المروزیۃ (م ۴۶۳ھ) تھا، اور جو صحیح بخاری (جو "اصح کتاب بعد کتاب اللہ" کہی جاتی ہے) کی راویہ تھیں اور ان سے کثیر التعداد طالبان علم حدیث اور محدثین نے سند لی ہے، اور وہ اس بارے میں بہت سے مرد شیوخ حدیث سے زیادہ تلامذہ ومستفیدین کی تعداد رکھتی ہیں۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تمدن عرب" کا باب چہارم "مشرقی عورتوں کی حالت" ترجمہ شمس العلماء سید علی بلگرامی مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی ص ۳۶۵-۳۶۸

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (سورہ النساء : ۱۹)

اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں، تو عجب کیا کہ تم ایک شئی کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ دے۔

نیز

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥ (سورہ الروم:۲۱)

اور اسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت و ہمدردی پیدا کردی بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے رہتے ہیں۔

ایک دوسرا مغربی مصنف اپنی کتاب (Defence of Islam) میں لکھتا ہے:

''اگر معاشرتی نقطۂ نظر سے یورپ میں عورت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچ گئی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کی پوزیشن مذہبی و قانونی حیثیت سے چند سال پہلے تک (اور بعض مقامات پر اب تک) اپنے مرتبہ و مقام میں اس سے کم ہے، جو مسلمان خاتون کو عالم اسلامی میں حاصل ہے[۱]''۔

مسٹر (N.J. Coulson) لکھتے ہیں:۔

۱؎ (Spirit of Civilisation P. 268)

''بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں، نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں، جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں.....اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے حاصل نہیں تھی، طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عِدّت کو اس میں شامل کرنا ہے(۱)''۔

مذہب و معاشرت کا رشتہ اٹوٹ ہے

حضرات!

ان نقول و اقتباسات کے جو اسلام کے عائلی قانون کی نہ صرف معقولیت، انصاف پسندی بلکہ امتیاز و برتری کی شہادتوں پر مشتمل تھے، پیش کرنے کے بعد اہلِ دین و اہلِ دانش کے اس تاریخی اجتماع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ نفسیات اور فلسفۂ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظامِ معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب اور معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی

(۱) (Islamic Surveys: A History of Islamic Law, Edinburg 1971-P.14)

ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔

اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظامِ معاشرت، نظامِ تمدّن اور عائلی قانون مسلّط کیا جائے، ہم اس کو دعوتِ ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوتِ ارتداد کا کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری، آئینی، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور، اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمّت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی، ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مطالبہ (سپریم کورٹ کا ایک شگوفہ)

مگر ابھی آئینی اور حکومتی سطح پر کوئی ایسا اقدام یا خطرہ سامنے نہیں آیا تھا، جس کا کھلے طور پر نوٹس لیا جائے، اور اس خطرہ کو دفع کرنے، یا اس سے محفوظ رہنے کی منظّم اور جمہوری طریقے پر کوشش کی جائے، کہ اچانک سپریم کورٹ کی طرف سے یکساں عائلی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا، اور حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ وہ دستور ہند کے اس رہنما اصول کو نافذ کرے، کہ اس سے ملک میں اتحاد، معاشرت میں یکسانی اور وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے ان بعض خطرات کا ازالہ ہوتا ہے، جو بعض فرقوں (بلکہ صحیح معنی میں اکثریت) کو پیش آرہے ہیں(۱)۔

سپریم کورٹ کے اس شگوفہ کو چھوڑنے سے جو دستور ہند کے بنیادی اصول اور دفعہ "مذہب میں عدم مداخلت" کے بالکل منافی اور اقلیت کے لئے ایک چیلنج ہے، مسلمانوں کو اور خاص طور پر دین کا علم اور ملّی غیرت رکھنے والوں اور ان میں بھی

---

(۱) ان میں سب سے زیادہ اہمیت دوسری شادی کرنے کے لیے اکثریت کے بعض افراد کے قبول اسلام کے معدودے چند واقعات کو دی گئی۔

خصوصی طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو چونکا بلکہ لرزا دیا، جنہوں نے مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کے خلاف مہم چلائی تھی، اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو منسوخ کرانے میں جو اس نے شاہ بانو کیس میں کیا تھا، غیر معمولی اور تاریخی کامیابی حاصل کی تھی۔

سپریم کورٹ کی حکومت کو اس توجہ دہانی اور پریس میں اس کے آجانے کے بعد سے مسلمانوں میں (بلا اختلاف فرقہ واریت، حلقۂ خیال اور سیاسی تنظیم و پارٹی) ایک کھل بلی سی مچ گئی، اور شاہ بانو کیس سے بھی زیادہ اس سے مذہب میں صریح مداخلت کے خطرات پیدا ہو گئے، اس لئے کہ شاہ بانو کیس صرف ایک جزئیہ سے تعلق رکھتا تھا، اور وہ مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کا مسئلہ تھا، جس کی شریعت اسلامی میں کوئی قید و شرط نہ تھی، لیکن یونیفارم سول کوڈ پوری شریعت اسلامی، نکاح و طلاق، تعدد ازدواج کی اجازت، نفقہ و میراث سب کے لئے ایک چیلنج اور ان کے ازالہ و سد باب کے لئے دروازہ کھولتا تھا، اور مسلمانوں کے لئے (جو ایک مکمل آسمانی شریعت منزل من اللہ کتاب اور عادلانہ و مطابق فطرت معاشرتی قانون رکھتے ہیں) خطرہ کی ایک گھنٹی بلکہ زندگی کی پوری چلتی ہوئی گاڑی کے لئے خطرہ کا اور روکنے کا ایک سگنل تھا۔

پھر سپریم کورٹ کی یہ توجہ دہانی بالکل ایک بے وقت، بے ضرورت اور بے فائدہ کام تھا کہ اس سے ملک کے حالات میں کوئی بہتری، باہمی اعتماد کی فضا اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوئی جذبہ اور جوش نہیں پیدا ہوتا تھا، بلکہ ملک میں ایک نئے انتشار کا اندیشہ اور صف آرائی کا خطرہ تھا، اس لئے کہ کم سے کم مسلمان اپنے عائلی قانون کو (بجا طور پر) عقائد و فرائض کی طرح دین کا ایک جز اور قرآن کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، اس عائلی قانون کی بنیادیں، اس کے اہم اجزاء قرآن مجید میں (نصوص کی صورت میں) صراحۃً موجود ہیں، پھر اس سے ملک کے مختلف فرقوں اور مذہبوں

میں کسی طرح بھی اتحاد اور وحدت نہیں پیدا ہو سکتی کہ اس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں، اور دن رات اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک ہی عائلی قانون رکھنے والے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار اور دست و گریبان ہیں۔(۱)

موجودہ صورت حال میں کرنے کے دو کام

اس سلسلہ میں کچھ فیصلے اور اقدامات ضروری ہیں، جو اس ملک میں جو آئینی حیثیت سے اور اعلان کی حد تک سیکولر (Secular) ہے لیکن عملی اور واقعاتی طور پر وہ اکثریت کے مذہب، تہذیب و معاشرت اور رجحانات کے تابع ہوتا جا رہا ہے، اور یہاں تدریجی طور پر ملک کا رُخ اکثریت کے ترجمان و پسندیدہ نظامِ تعلیم، طرزِ عمل اور عائلی قوانین و رسوم کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

۱- پہلا ضروری اقدام و فیصلہ یہ ہے کہ اس ملک میں جا بجا شرعی دار القضاء قائم ہوں، جہاں سے عائلی اختلافات و تنازعات اور واقعات و حوادث کا شرعی فیصلہ معلوم کیا جائے اور اس پر عزم و خلوص اور دیانتداری کے ساتھ عمل کیا جائے، اس سے مسلمان خاندان اس طوالت، مصارف کثیر اور سب سے بڑھ کر شریعت کی

---

(۱) اگرچہ وزیر قانون نے اس کا اعلان کر دیا اور اطمینان دلا دیا ہے کہ بعض ہندو احیاء پرست (جماعتوں) کے اس مطالبہ کو منظور نہیں کیا جائے گا، اور قانون کی صورتحال جو ابھی تک تھی، باقی رہے گی اور مرکزی حکومت کی طرف سے بھی بعض ایسے اشارے دیئے گئے ہیں، لیکن مسلمانوں کو بحیثیت ملّت اور مسلمانوں کے عائلی قانون کے تحفظ کے مقصد کے لئے قائم ہونے والی جماعتوں بالخصوص آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کو اس سلسلہ میں بیدار اور چوکنا رہنا چاہئے کہ کسی وقت بھی ہندو احیاء پرستی کے جوش میں یا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے یہ مطالبہ زندہ ہو سکتا ہے، اور اس کے لئے کوششیں پھر سرگرم ہو سکتی ہیں، اسلامی حمیت اور خطرات کا شعور رکھنے والی جماعتوں کے لئے حکیم شاعر کا پیغام ہے ؂

مکتبِ عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

مخالفت کے امکان وخطرہ سے بچ جائیں گے، جس کا عدالتی فیصلوں سے خطرہ ہے اور اس کے بار بار تجربے ہو چکے ہیں، پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شرعی فیصلہ پر فریقین اکثر راضی ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے ہیں، اور وہ محاذ آرائی ختم ہو گئی ہے، جو اس سے پہلے موجود تھی، پھر اس سے اُن کو وہ اجر وثواب ہوتا ہے، جو حکم خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دینے سے حاصل ہوتا ہے، اور وہ خدا کے حکم سے اس سرتابی اور بغاوت سے بچ جاتے ہیں، جس کے بارہ میں قرآن مجید کے صاف الفاظ ہیں:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

(سورہ المائدہ : ۴۷)

اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں اسلام کے عائلی قانون پر کتاب کی تدوین مکمل ہو چکی ہے، اور ضرورت ہے کہ وہ جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو اور اس کا انگریزی و ہندی میں ترجمہ بھی ہو جائے اور اسی کی روشنی میں ایسی شرعی عدالتوں ''اسلامی دارالقضاء'' میں فیصلے ہوں۔

۲۔ دوسرا کام ''اصلاح معاشرہ'' کا کام ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام صرف چند عقائد وفرائض اور عبادات مفروضہ کی ادائیگی میں محدود نہیں، وہ ایک پورا نظام حیات ومعاشرہ ہے، جس کا تعلق دونوں انسانی جنسوں (ذکور واناث) اور ہر عہد اور ہر ملک کے مسلمانوں سے ہے، مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت (اپنے تمام اقسام ومراحل کے ساتھ) شریعت کے اس سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئے، جو اللہ کے آخری رسولؐ قیامت تک کے

لئے لے کر آئے اور جس کے متعلق واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط (المائدہ : ۳)

آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین کے پسند کر لیا۔

اور اسی حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر نبی کو انسانی لباس میں (بشر کی حیثیت سے) بھیجا تا کہ وہ اپنی امت، متبعین، اور اپنے ملک و معاشرہ اور اپنے عہد کے زندہ انسانوں اور مختلف الانواع طبقات کے لئے نمونہ اور مثالی و قابلِ تقلید ہستی بنے، خود سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نوع بشر کے لئے اسوۂ کامل بنا کر بھیجا اور آپ کو ان تمام مراحل اور زندگی کے شعبوں سے گذارا، جو انسانی زندگی کے فطری و ضروری شعبے ہیں، یعنی صحت و مرض، شباب و کہولت، فراغت و مجاہدہ، صلح و جنگ، ازدواجی زندگی، اولاد کی پیدائش بھی اور ان میں سے بعض کی وفات بھی، پھر بعض دختران خاندانِ نبوت کے فریضۂ ازدواج کی ادائیگی، پھر ان سب مراحل و شعبوں کے بارے میں (حدیث و سیرت کے ذریعہ) مستند ترین معلومات مہیا کرنے اور محفوظ رکھنے کا غیبی انتظام فرمایا، جس کی مثال صالحین و متقین، مصلحین و معلمین کا کیا ذکر، گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی نہیں ملتی، اور پھر اس سب کے بعد فرمایا:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

(سورہ الاحزاب : ۲۱)

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے یعنی اس
کے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور روز آخرت سے اور ذکر الٰہی کثرت
سے کرتا ہو۔

پھر اس کے بعد آپ ہی کی حیات طیبہ مبارکہ میں دار الہجرہ مدینہ میں وہ اسلامی معاشرہ قائم کیا، جو زندگی، قدرت واستطاعت، فراغت وعسرت، شباب و کہولت، خاندانی وقبائلی اختلافات، ذوق وصلاحیت کے تنوع کے ساتھ ایک زندہ، متحرک، حساس، عمل واختیار کی صلاحیتوں کے تنوع کے ساتھ آپ کی حیاتِ طیبہ میں دس سال تک، اور آپ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں ایک مثالی معاشرہ تھا، اس میں قدرۃً وفطرۃً شادیاں بھی ہوتی تھیں، نکاح بھی ہوتے تھے، اور طلاق بھی، بیٹی کو نکاح کے بعد رخصت بھی کیا جاتا تھا، اور بہو کو بیاہ کر گھر بھی لایا جاتا تھا، مہر بھی معیّن ہوتا تھا، اور کسی نہ کسی شکل ومقدار میں جہیز بھی دیا جاتا تھا، والدین کے انتقال کے بعد میراث بھی تقسیم ہوتی تھی، اور املاک وجائداد میں حصہ بھی دیا جاتا تھا، تجارت، زراعت اور انواع معیشت میں مشارکت وحصہ داری بھی ہوتی تھی، غرض زندگی اپنے پورے تنوع کے ساتھ موجود تھی اور مستند ترین تاریخی ذرائع (تاریخ ومستند ومتواتر روایات کے ذریعہ) اس کی ایسی تصویر محفوظ ہے، جس میں اس سب کے نمونے انواع والوان، مظاہر ومناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں، مہاجر ہیں اور قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتے ہیں، اور اس کا پورا امکان ہے کہ اوپر ان کے خاندان کے اور بنی ہاشم (خاندان رسالت) کے رشتے بھی ہوئے ہوں، ایک دن معمول کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپؐ اُن کے لباس میں عطر کی ایسی خوشبو پاتے ہیں، جو عام طور پر اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی،

آپؐ سوال فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن! کیا بات ہے، آج تمہارے کپڑوں میں بہت عطر لگا ہوا ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ یارسول اللہؐ! میں نے نکاح کیا ہے، اس پر حدیث وروایات کی کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ آپؐ نے شکایت واستعجاب کا کوئی لفظ فرمایا ہو کہ عبدالرحمٰن! اتنی جلدی یہ بے تعلقی یا بے مروّتی، تم نے ہمیں خبر بھی نہیں کی اور نہ دعوت دی، اور نہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے معذرت وشرمندگی کا کوئی جواب منقول ہے، حالانکہ یہ مُسلم ہے اور تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یثرب (جواب مدینہ طیبہ ہے) کوئی ایسا بڑا شہر نہیں تھا، جہاں اطلاع دینے کے لئے کوئی بڑا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور یہ بھی ایک تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے کہ ایک شہر یا ایک نسل و پیشہ کے لوگ جب ترکِ وطن کر کے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جاتے ہیں تو عام طور پر قریب ہی رہتے ہیں، اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے مزاج اور روایات سے واقف ہوتے ہیں، اور خواتین کو بھی ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں آسانی ہوتی ہے، آپ یہ سننے کے بعد کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے نکاح کیا، صرف یہ فرماتے ہیں کہ "اولم ولو بشاۃ" (دیکھو ولیمہ ضرور کرنا، چاہے ایک بکری کا ہو)۔

یہ واقعہ اور روایت اس پر پوری روشنی ڈالتی ہے کہ عقد و نکاح کوئی ایسی ہنگامہ خیز اور زلزلہ انگیز تقریب یا واقعہ نہیں ہے کہ سارے شہر کو، پوری برادری کو، اور اہل تعلق کو اس کی خبر کی جائے، اور اُن کو مدعو کرنا ضروری سمجھا جائے ورنہ یہ سخت قابلِ شکایت بات ہوگی اور پھر اس میں ایسے اہتمام اور ایسی دھوم دھام سے کام لیا جائے، جس سے نکاح کرنے والے یا اس کے سرپرست وخاندان کی حیثیت عرفی (Social Position) کا اظہار و تعین ہو۔

مدینۂ طیبہ کی اس مثالی اور معیاری معاشرہ اور طرز زندگی کے بعد عرصۂ دراز تک (جب تک مسلمان بیرونی تمدنوں اور طرز معاشرت سے متاثر نہیں ہوئے

اوران میں اظہار شان وشوکت کی بیماری نہیں آئی) یہی طرزِ نکاح واز دواج اور اس کی سادگی اور محدودیت قائم رہی، عام طور پر مساجد میں نکاح ہوتے تھے، بعض مرتبہ کسی نماز کے بعد اچانک اعلان کر دیا جاتا تھا کہ نماز کے بعد حاضرین تشریف رکھیں، فلاں کا نکاح ہوگا، اکثر خاندان کے تمام افراد کو بھی اس کی پہلے سے خبر نہیں ہوتی تھی۔(۱)

لیکن جب مسلمان ان ملکوں میں جا کر بسے، جہاں دوسرا نظامِ معاشرت، طریقۂ شادی وغمی اور طرزِ زندگی رائج تھا، جس میں عزّت وافتخار، شہرت ونا موری اور حُبِّ جاہ کا جذبہ کام کر رہا تھا، یا وہ اس ملک کے قدیم روایات کے مطابق تھا، جس میں دین و مذہب کا کم اور رسم ورواج کا زیادہ دخل تھا، اور جو وہاں کے مذاہب کے علم برداروں اور اجارہ داروں کے تساہل وتغافل اور ایک حد تک تعاون کا نتیجہ تھا تو مسلمان جن کو اس معاشرہ و ماحول پر اثر ڈالنا چاہئے تھا اور اس کی اصلاح کرنی چاہئے تھی، وہ الٹے اس معاشرہ وماحول اور طرزِ زندگی سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نکاح کے اس مسنون فریضہ کو، جو نہایت سادگی اور سہولت سے ادا کیا جا سکتا تھا، ایک ''ہفتخوان'' سر کرنے کے مرادف بنا دیا، جس کے لئے بعض اوقات سودی قرض لینے، املاک کو فروخت کرنے یا رہن رکھنے کی نوبت بھی آجاتی ہے، اور وہ تمام قبائح ومنکرات اس میں شامل ہو جاتے ہیں، جن سے شریعت نے روکا ہے، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین وشریعت کے صحیح ترجمانوں نے

---

(۱) ریاست ٹونک میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان کے وہ لوگ، جو صوبۂ سرحد سے زندہ سلامت واپس آئے تھے، اور دوسرے افراد خاندان، ان کے وطن ''رائے بریلی'' سے آکر بس گئے تھے، اور اسی وجہ سے اس محلّہ کا نام ''قافلہ'' پڑ گیا، یہی دستور تھا۔
معذرت کے ساتھ بطور لطیفہ کے لکھا جاتا ہے کہ ابھی حال میں راقم سطور نے لکھنؤ کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد جمعہ ختم ہونے پر وہیں منبر پر بیٹھ کر بیس نکاح پڑھائے اور یہ سب کام بغیر کسی شور و ہنگامہ کے ایک گھنٹہ کے اندر ختم ہو گیا۔

اُن کی مذمت کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ مذمت اور لائق توجہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کے مطالبہ کا ہے، جس کو خود مسلمانوں نے اختیار کرلیا ہے، کہیں اس کا نام ''تلک'' ہے، کہیں ''گھوڑا جوڑا'' اس کے سلسلے میں وہ قابل مذمت اور لائق نفرت اقدامات بھی پیش آنے لگے ہیں اور بیاہی خاتون کے ساتھ احتجاج اور مقاطعہ کے وہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، جو نہ صرف شرعاً واخلاقاً مذموم ہیں بلکہ دور وحشت و جاہلیت کی یادگار ہیں، جب دولت کی معبود کی طرح پرستش ہوتی تھی، اور اس کے حصول کے لئے سب کچھ جائز سمجھا جاتا تھا۔

پھر اسی طرح طلاق کے بارے میں، ترکہ کی تقسیم و میراث کے بارے میں، رفیقۂ حیات کے حقوق کی ادائیگی اور معاشرت کے بارے میں بہت سی کوتاہیاں مسلمانوں کے معاشرہ اور عائلی زندگی میں ایسی داخل ہوگئی ہیں جنھوں نے اسلامی معاشرہ کا امتیاز اور وقار کھودیا ہے، اور کثیر التعداد مشکلات پیدا کردی ہیں، جو محض اس شریعت سے روگردانی اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے، جو ایک نعمت خداوندی کے طور پر انسانوں کو دی گئی تھی۔

ان حقائق کے پیش نظر جنھوں نے اسلام کی عمومیت، ابدیت، مطابق فطرت ہونے اور نعمت خداوندی ہونے پر پردہ ڈال دیا ہے، اور مسلمان معاشرہ کو صدہا مشکلات میں اور قبائح میں مبتلاء کردیا ہے، ایک عالمگیر تو نہیں، لیکن ہندگیر مہم چلانے کی ضرورت ہے، یہ کام ''اصلاح معاشرہ'' کے عنوان سے مسلم پرسنل لا بورڈ نے شروع سے اپنے پروگرام میں داخل اور اپنے فرائض میں شامل کیا تھا، اس سلسلہ میں پٹنہ میں، لکھنؤ میں، میرٹھ اور بستی میں اور بعض دوسرے مقامات پر ''اصلاح معاشرہ'' کے نام سے کامیاب اور کثیر الازدحام کانفرنسیں ہوئیں، جن میں پوری

طاقت وتاثیر کے ساتھ عقائد وفرائض اسلام کی پابندی کے ساتھ، اس کے معاشرتی نظام اور عائلی زندگی کے احکام کو قبول کرنے اور ان پر پورے عزم وقوت کے ساتھ عمل کرنے کی دعوت دی گئی، اور صفائی کے ساتھ اس آیت کی روشنی میں مکمل مسلمانوں کو کامل اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔

يَآ يُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوا فِي السِّلۡمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيۡطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ (سورۃ البقرۃ ۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

ضرورت ہے کہ یہ کام ہمہ گیر پیمانہ پر ہو، جابجا "اصلاح معاشرہ" کے وسیع ومؤثر جلسے ہوں، اس میں صوبۂ گجرات کے، جس کی شاندار علمی ودینی تاریخ اور اس کے اس امتیاز وتفوق کا ذکر، خطبہ کی ابتدا میں آچکا ہے، جو اس کو صرف اس برّصغیر میں نہیں بلکہ (ایک طویل عرصہ تک) عالمِ عربی واسلامی میں حاصل رہا ہے، ہر طرح شایانِ شان، قرین قیاس اور حسب توقع ہے، واللہ الموفق والمعین۔

آخر میں میں اس اعزاز کے لئے، جو صدارت کی شکل میں ناچیز کو حاصل ہوا، اور اس توجہ والتفات اور حسن استماع کے لئے جس کا موقر حاضرین جلسہ نے اظہار کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

الحمد لله الذی هدانا لهذ او ما کنا لنهتدی لو لا ان هدانا الله لقد جاء ت رسل ربنا بالحق

خطبۂ صدارت

اجلاس سیزدہم

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

منعقدہ : ۲۸/۳۰/اکتوبر ۱۹۹۹ء

بمبئی

''سچی بات تو یہ ہے کہ سوسائٹی کی تعمیر تو پیغمبروں ہی کے اصولوں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ اور خدا کی دی ہوئی طاقتیں اسی کام پر لگا دیتے ہیں اور ان کی نظر کبھی اس مقصد سے نہیں چوکتی، وہ مسائل کو گڈ مڈ نہیں کرتے، وہ سوسائٹی سے انہونی امیدیں قائم کرتے، وہ اس پر وہ بوجھ نہیں ڈالتے جو اس سے اٹھایا نہ جائے، وہ پہلے ایمان اور عقیدہ پیدا کرتے ہیں اس کے اخلاق اور عمل کو سدھارتے ہیں اسی طرح صحیح کیریکٹر پیدا کرتے ہیں، اپنی خواہشات اور فائدوں کے خلاف کام کرنے کی طاقت پیدا کرتے ہیں۔ پھر جس طرح پھل دار اور بے روگ درخت سے پھل پیدا ہوتے ہیں جس طرح آگ کے ساتھ گرمی اور سورج کے ساتھ روشنی ضروری ہے اسی طرح صحیح کریکٹر اور صحیح تربیت سے آزادی، حکومت کی صلاحیت، قربانی و خدمت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے، انسانی فطرت کا ہمیشہ سے یہی راستہ ہے اور ہمیشہ یہی راستہ رہے گا۔''

دو اہم فیصلے

ہمارا دین اسلام، ہمارا وطن ہندوستان

حضرات!

ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلے کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری، یا بے چارگی پر مبنی نہیں ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانون شریعت اور اپنی پوری مذہبی وتہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور وآئین کا بھی

فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اپنی خصوصیات، قانون شریعت، احکام دین، اپنے عقائد وشعائر، اپنی زبان وتہذیب اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں اس ملک میں رہیں، اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک سے تیار ہوا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے اور مسلمان جس ملک میں رہے گا اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و ترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں، اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

زندگی اور موت بھی اسلام پر ہوگی، اللہ تعالی نے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام اور ایمان پر قائم رہنے کی کوشش کریں، اسی پر اپنی زندگی گزاریں اور جب موت آئے تو اسی دین وملت پر آئے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ

(سورہ آل عمران : ۱۳۲)

''تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔

اسی کی وصیت ابراہیم ویعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو کی کہ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

وَوَصّٰی بِھَا اِبْرَاھِیْمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ط یَا بَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ

اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۔

(سورہ البقرہ: ۱۳۲)

اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو کی، انھوں نے کہا تھا، میرے بچو! اللہ نے تمھارے لئے یہی دین پسند کیا ہے لہذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔

شریعت اسلامی کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی

شریعت اسلامی نے ایک مسلمان کے لئے پیدائش سے لے کر موت تک اس کے انتظامات کئے ہیں اور ایسا ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے جس میں مسلمان اس حقیقت کو فراموش نہ کرنے پائے، اس کو ہر وقت یاد رہے کہ اس کا تعلق اس دین وملت سے ہے جس کے داعی ابراہیم اور محمد علیہما السلام تھے جس کی بنیاد توحید پر ہے اور وہ ایک الگ امت ہیں، مسلمان جس وقت بھی پیدا ہوتا ہے، اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اس کا اسلامی نام رکھا جاتا ہے، ناموں میں ان ناموں کو ترجیح دی گئی ہے جن میں عبدیت وحمد کا اظہار ہے، اس سے ابراہیمی سنتیں ادا کرائی جاتی ہیں اور جب مرتا ہے تو سب اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ۔

"اے اللہ ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ رکھیو اور جس کو موت دے تو اس کو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھائیو"

یہاں تک کہ قبر میں اتارتے ہوئے اور آخری ٹھکانے پر پہنچاتے ہوئے بھی یہی لفظ زبان پر ہوتے ہیں۔

بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ ، اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کے دین وملت پر، اس کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے کہ ہم ملت ابراہیمی اور امت محمدی کے فرد اور ایک مخصوص شریعت اور آئین ومسلک زندگی کے پیرو اور خدا کے موحد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین ومسلک کی وفاداری میں گزرے اور ہمیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجودہ نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن رہیں اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراط مستقیم پر چلیں۔

ملت ابراہیمی اور دین محمدی کی اس دعوت کو آج صراحت اور تعین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس تہذیب کی دعوت ہے جس کی بناء ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی ہے اور تکمیل وتجدید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اجتماع واخلاق میں اس کے معین اصول ہیں، یہ فرد کی حریت اور فلاح کی ضامن ہے، چند معین عقائد، معین اصولوں اور معین کرداروں نے اس کو وجود بخشا ہے، یہ ابراہیم علیہ السلام ومحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشترکہ دعوت اور میراث ہے اور اس کے سوا کوئی تیسری چیز خدا کو قبول نہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک ونسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(اقبالؒ)

مسلمانوں کا عائلی قانون خالق کائنات کا بنایا ہوا ہے

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے ایمان وعقیدہ کا جزء ہے کہ ان کا عائلی قانون (Family Law) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد وعبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید ان تصریحات سے بھرا ہوا ہے، مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم وخبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی، وہ فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (الملک:۱۴)

''کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے وہ تو (بڑا ہی) باریک بیں اور (پورا) باخبر ہے۔''

اسی طرح وہ زمانہ کا خالق ہے، ہمارے لحاظ سے ماضی حال ومستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لئے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید امت اور عالمگیر اور دائمی شریعت کے لئے بنایا گیا ہے تو ترمیم وتبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی وعلمی نفاق کے سوا کچھ نہیں، پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں اس قانون کے مکمل متوازن اور عادل ہونے اور زمان ومکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی وعلمی شواہد اور مسلم وغیر مسلم، مشرقی ومغربی فضلاء جری وانصاف پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی ''شپرہ چشم'' ہی ان سے انکار کرسکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے

قلم اٹھایا ہے اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام، ایک خطرہ کا سد باب

ہندوستان میں جب یہ مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں اور یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے کسی وقت ضرور برسے گا تو انھوں نے "مسلم پرسنل لا بورڈ" کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس کے رخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا سامان کیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر یہ یا کوئی دوسرا مسئلہ شب خون نہ مارنے پائے یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا جس کی مثال اپنی وسعت اور عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے، اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رخ معلوم ہو گیا، اور اتنا ثابت ہو گیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فی صد متفق ہیں، اس لئے دانش مندی، حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضا ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے۔

یہ دین ہم تک خدا کے برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچا

حضرات! یہ دین جو ہم تک پہنچا ہے اور جس دولت کے ہم آپ امین اور (محافظ کا لفظ تو بہت بڑا ہے) اس دولت کے حامل ہیں، وہ دین ہمیں دانشوروں، سماجی خدمت گاروں، اصلاحی کام کرنے والوں (ریفارمرس Reformers) یا بانیان سلطنت کے ذریعہ نہیں پہنچا ہے، یہ سارے گروہ قابل احترام ہیں، لیکن کسی دین میں

اور کسی تہذیب، نظام فکر و دبستان خیال (School of thought) اور خالص مطالعہ، غور و فکر اور تجربہ کے نتائج میں ایک حد فاصل ، سرحدی لکیر (Line Of Demarcation) ہوتی ہے جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے، اس خط کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، حد فاصل یہ ہے کہ آسمانی مذاہب (ادیان) ان برگزیدہ افراد کے ذریعہ پہنچے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا تھا، اور جن پر وحی آتی تھی، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے خلط مبحث (Confusion) ہوتا ہے، زیادہ تر لوگ نا دانستہ طریقہ پر ان مذاہب سے توقع اور بعض اوقات آگے بڑھ کر ایسی چیزوں کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں جن کی ان مذاہب میں گنجائش اور ان کا کوئی جواز نہیں وہ بعض اوقات ان کی تشریح کا فرض اپنے ذمہ لے لیتے ہیں، اپنی وسعت مطالعہ اور وسعت اظہار کے لئے وہ مذاہب کی ترجمانی ایسی کرنے لگتے ہیں جیسے کہ یہ نرے فلسفے یا انسانوں کے بنائے ہوئے تہذیب وتمدن کے نظام اور سماجی تجربے اور معاشرتی نظریات ہیں، یہ ہے وہ غلطی جو نادانستہ طریقہ پر بعض بڑے ذمہ دار اور سنجیدہ لوگوں سے ہوتی ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ دین اور غیر دین میں حد فاصل اور امتیازی نشان کیا ہے؟ فلسفہ سماجیات (Social Scince) کا علم تہذیب و تمدن (Civilization) سوسائٹی اور انسانی معاشرہ یہ سب اپنی جگہ حقائق ہیں، ہم ان کا انکار نہیں کرتے، ان کا احترام کرتے ہیں اور اپنے ذمہ ان کے حقوق سمجھتے ہیں، خود مسلم ملت ایک معاشرہ، تہذیب وتمدن اور فکر و دانش کا ایک مستقل مدرسہ (School Of Thought) بھی ہے لیکن اس کی جو اصل حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک "دین" ہے اور اس دین کو دنیا میں پیش کرنے والے اور اس کو بروئے کار لانے والے، اس کو ہماری زندگی میں داخل کرنے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور یہ ان کی زبان اور ان کا طرز فکر نہیں، اس کا بنیادی چشمہ ان کے دماغ میں نہیں تھا بلکہ ان سے باہر

اوران سے بلند تھا اور وہ ان کے لئے اسی درجہ قابل احترام اور قابل اطاعت تھا، جیسے ہمارے آپ کے لئے اور سارے امتیوں کے لئے۔

وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی

(سورۃ النجم : ۳،۴)

''اور وہ خواہش نفس سے منہ سے بات نہیں نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے (اوران کی طرف بھیجا جاتا ہے۔''

مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَ لَا الۡاِیۡمَانُ وَ لٰکِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّکَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (سورہ الشوریٰ : ۵۲)

''آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کا (انتہائی کمال) کیا چیز ہے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اوراس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کررہے ہیں۔''

وحی ونبوت کا فرق اساسی فرق ہے، ہمیں غیر مسلم بھائیوں اور غیر مسلم فضلاء سے زیادہ شکوہ نہیں کہ وہ وحی ونبوت کے عہد سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کے مفہوم سے بہت سے حضرات نا آشنا ہیں، بعثت محمدی سے پہلے خود عربوں کا یہی حال تھا، اس میں نہ کسی ذہانت کا انکار ہے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ ہے، ایک تاریخی یا نفسیاتی تجزیہ ہے کہ جو شخص نبوت اور وحی کی حقیقت سے واقف نہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کا کیا مرتبہ اور حق ہے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ کس چیز کی متقاضی ہے، وہ مسلمانوں کے بارہ میں مشورہ دینے یا فیصلہ کرنے کے اخلاقی یا

قانونی طور پر مجاز نہیں۔

دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لینا ضروری ہے

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ دین اسلام کے دائرہ کو سمجھ لیا جائے ،اس بارہ میں مذاہب میں خود اختلاف ہے اور اس میں درجوں کا فرق ہے، کئی مذاہب ایسے ہیں کہ وحی نبوت سے ان کا آغاز ہونے کے باوجود انھوں نے مذہبی زندگی کو ایک خاص دائرہ میں محدود کرلیا ہے، مثلاً عبادات کے دائرہ میں، لیکن اسلام کا معاملہ یہ نہیں ہے، اسلام میں دین کا دائرہ پوری زندگی پر محیط ہے، یہ ایک اساسی حقیقت ہے جو عبد و معبود کے تعلق کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی، ہر مسلمان حدا کا فرمانبردار بندہ ہے اور اس کا تعلق خدا سے دائمی ہے، عمومی ہے، عمیق بھی ہے اور وسیع بھی ہے، محدود بھی ہے اور جامع بھی، قرآن شریف میں ہے:۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلاَ تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط إِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ہ

(سورۃ البقرۃ : ۲۰۸)

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔“

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل (شرعی، عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفہ اخلاق، فلسفہ نفسیات اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر و محفوظ نہیں رہ سکتا، اس

کا نتیجہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں، اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کرنا چاہئے اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کیے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مارڈالا جاتا ہے(۱) کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارہ ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک، کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے؟ خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونا چاہئے تھی میں نے دہلی کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:۔

---

(۱) روزنامہ ''قومی آواز'' دہلی ۱۰؍جون ۱۹۸۴ء

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ٥ (سورہ الانفال:۳۳)

''اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور وہ انہیں عذاب دے۔''

آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو؟ اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقہ حیات تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے تو جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کر دیں گے۔

''اس ملک کے رہنماؤں اور حکومت کے ذمہ داروں کو خدا نے ایک بہت بڑی قوم کی امانت سپرد کی ہے اور دل و دماغ کی بہت سی صلاحیتیں بخشی ہیں، اگر میری کمزور آواز ان تک پہنچ سکے تو میں ادب سے عرض کروں گا کہ دیکھئے کہیں یہ قوتیں چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں صرف ہو کر نہ رہ جائیں، ایک مرتبہ جرأت و ہمت سے کام لے کر قوم کو انسانی زندگی کی اصل منزل کا راستہ دکھا دیجئے، اس کو وطنیت و قومیت کے قید خانہ اور جسم و مادہ کے اس تنگ آشیانہ سے نکال کر خدا پرستی، انسان دوستی اور اعلیٰ روحانیت کی اس وسیع دنیا میں پہنچا دیجئے جس جغرافیہ میں مشرق و مغرب کی تفریق اور جس کے زمانوں میں ماضی وحال کی تقسیم نہیں۔ جہاں خدائے واحد اس کا معبود، ساری انسانی برادری اس کا کنبہ، ہر سچی اور میٹھی زبان اس کے دل کی ترجمان، ہر صحیح علم وادب اس کا ذخیرہ، حکمت کی ہر بات اس کا گمشدہ مال ہو۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو ہندوستان نہ صرف اپنی آزادی اور عزت ہی برقرار رکھ سکے گا۔ بلکہ قوموں کی سرداری اس کے ہاتھ میں آجائے گی، اور اس کا یہ نیا دور اس کی پرانی تاریخ کے ہر اس دور سے زیادہ باعظمت اور شاندار ہوگا جس کا زندہ کرنا آپ کی زندگی کا خاص مقصد معلوم ہوتا ہے''

مسلمانوں کے مسائل وجذبات (۱)

ڈائلاگ (Dialogue) کی ضرورت وافادیت

دوستو! بھائیو اور بزرگو! میں آپ سب کی تشریف آوری اور تکلیف فرمائی کا اپنی طرف سے اور اپنے سب بُلانے والے ساتھیوں کی طرف سے خلوص دل سے خیر مقدم کرتا ہوں، ہمارے دور اور ہمارے ملک میں سیاسی کانفرنسوں، پارٹیوں کے اجلاس، علمی سیمناروں اور ادبی نشستوں کی کمی نہیں، شاید کوئی دن خالی جاتا ہو کہ کوئی ایسی نشست نہ ہوتی ہو، پریس کانفرنسوں کی بھی کمی نہیں، مگر وہ خاص اغراض کے ماتحت کی جاتی ہیں، اور ان میں بے تکلف تبادلۂ خیال کی نوبت کم آتی ہے، ضرورت

(۱) ''نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد میڈیا اور دانشوران قوم نے جو جذباتی اور جارحانہ رخ اختیار کیا اس نے اس حقیقت کی طرف دوبارہ متوجہ کیا کہ ملک کی اکثریت مسلمانوں کے بنیادی عقائد، ان کے دینی وملی مزاج وفطرت اور ان کے اہم ترین مسائل وجذبات سے ناواقف ہے ۔ مسئلہ کے افہام وتفہیم کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ نے ڈائلاگ (Dialogue) منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۴؍مئی ۱۹۸۶ء یہ ڈائلاگ انٹرنیشنل سنٹر دہلی میں منعقد ہوا۔ یہ مقالہ دانشوروں اور صحافیوں کے ایک چیدہ مجمع میں اس موقع سے پڑھا گیا۔''

ہے کہ رسوم وتکلفات سے آزاد ہوکر جس طرح ایک خاندان یا ایک محلہ کے لوگ کسی جگہ اکٹھے ہوکر بے تکلف بات چیت کرتے ہیں، دوستانہ وعزیزانہ گلہ شکایت ہوتی ہے، غلط فہمیاں رفع کی جاتی ہیں، اپنے خاندان یا محلّہ کے فلاح و بہبود کے لئے مشورے ہوتے ہیں، بچھڑے ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، اس طرح ہم کبھی کبھی کسی مرکزی مقام پر جمع ہوکر دوستانہ و بے تکلفانہ گفتگو وتبادلۂ خیال کریں، اسی خیال و تجربہ کے ماتحت (Dialogue) زیادہ مفید سمجھا گیا ہے، اور اس کے بہتر نتائج نکلے ہیں، اسی خیال کے ماتحت آپ حضرات کو آج تکلیف دی گئی ہے۔

مختلف فرقوں کی ایک دوسرے سے لاعلمی یا ناقص واقفیت، اور اس کے اثرات ونقصانات

حضرات! ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار ۱۰۰۰ برس سے ہندو، مسلمان اکٹھے رہتے ہیں، شہروں، قصبات، دیہاتوں اور محلوں میں ان کی ملی جلی آبادی اور مشترکہ سکونت ہے، بازاروں، منڈیوں، تعلیمی مرکزوں، کچہریوں، دفتروں اور اب سو ۱۰۰ برس سے زیادہ عرصہ ہورہا ہے کہ سیاسی تحریکات، سماجی کاموں، اسٹیشن اور ڈاک خانوں، ریلوں اور بسوں میں ان کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کے مواقع آسانی سے میسر ہیں۔

لیکن یہ دنیا کا حیرت انگیز واقعہ، اور ایک طرح کی پہیلی ہے، جس کا بوجھنا آسان نہیں کہ عام طور پر ایک کو دوسرے کے مذہبی عقائد، تہذیب ومعاشرت، طور طریق اور قومی خصوصیات سے قریب قریب اتنی بیگانگی اور اجنبیت ہے، جیسی پرانے زمانہ میں اکثر دو ملکوں کے باشندوں کے درمیان ہوا کرتی تھی، ہر ایک کی معلومات دوسرے کے متعلق ناقص، سطحی، سرسری اور زیادہ تر سُنی سُنائی باتوں اور

قیاسات وتخیلات پر مبنی ہیں، ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے بارہ میں بہت سی شدید غلط فہمیوں میں مبتلا، اور بعض اوقات منافرت انگیز لٹریچر، سیاسی پروپیگنڈے، زہر آلود اور رنگ آمیز تاریخ، نصاب کی کتابوں اور بے تحقیق داستانوں اور کہانیوں کی بنا پر اپنے ذہن ودماغ میں اس کی ایک غلط اور مکروہ تصویر قائم کئے ہوئے ہے، ایک فرقہ کے کٹر اور متعصب نہیں، نیک دل اور سادہ طبیعت افراد سے اگر دوسرے فرقہ کے بنیادی عقائد، مراسم اور معاشرت کے اصولوں کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ یا تو لاعلمی کا اظہار کریں گے یا ایسے جوابات دیں گے جن سے ایک واقف آدمی کو بے اختیار ہنسی آجائے گی، راقم سطور کو جو بکثرت سفر کرتا ہے اور ریلوں اور بسوں میں ہر طبقہ اور ہر سطح کے لوگوں سے اس کا بکثرت ملنا جلنا ہوتا ہے، بارہا اس کا تجربہ ہوا۔

لیکن یہ ہنسی کی بات نہیں، رونے کا مقام ہے! کہ سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے ناواقف ہیں، اس کی ذمہ داری تنہا ایک فرقہ پر نہیں، سب پر ہے اور خاص طور پر مذہبی، سماجی کام کرنے والوں، اپنے ملک سے سچی محبت رکھنے والوں، اور انسانیت دوستوں پر ہے کہ انہوں نے ایک کو دوسرے سے صحیح طور پر واقف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، یا کی تو ناکافی۔

مُہذّب دنیا میں اب یہ اصول تسلیم کرلیا گیا ہے کہ محبت، احترام واعتماد اور امن وسکون کے ساتھ رہنے اور نیک مقاصد کے لئے ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک عمل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، آبادی کے ہر عنصر، اور ملک کے ہر فرقہ اور ہر گروہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ دوسرا عُنصر، دوسرا فرقہ اور گروہ کن اصولوں پر عقیدہ رکھتا ہے، کن ضابطوں کا اپنے کو پابند اور ان کو اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے، اس کی تہذیب ومعاشرت کا خاص رنگ کیا ہے؟ اس کو زندگی کی کون سی قدریں عزیز ہیں؟ اس کو قلبی سکون اور پر از اعتماد زندگی

گزارنے کے لئے کیا چیزیں درکار ہیں؟ کون سے عقائد و مقاصد اس کو جان سے زیادہ عزیز اور اولاد سے زیادہ پیارے ہیں؟ ہمیں اس سے گفتگو کرنے میں، اس کے ساتھ خوشی اور مسرت کے ساتھ وقت گذارنے میں کن جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا چاہئے، بقائے باہم کے لئے (Co-Existence) (جو شائستہ اور پرسکون زندگی کا مانا ہوا اصول ہے) شرط اولین ہے کہ ضروری حد تک واقفیت حاصل ہو۔

ایک ایسے ملک کے لئے یہ اصول اور بھی ضروری قرار پاتا ہے، جس کو اپنی رنگارنگ تہذیب پر ناز ا اور ''جیو اور جینے دو'' کے زرّیں اصول پر اس کا پرانا عقیدہ ہے، اس وقت ساری دنیا میں دور دراز ملکوں کے مذاہب اور فلسفوں، تہذیبوں اور معاشرتوں، زبانوں اور کلچروں، لہجوں اور محاوروں، یہاں تک کہ عادات و اخلاق، شوق اور لت (Hobby) کھیلوں اور تفریحات، کھانوں اور لباسوں کی باریکیوں سے واقف ہونے کا عام رجحان پایا جاتا ہے، اس کے لئے یونیورسٹیوں میں مستقل مضامیں داخل اور مستقل شعبے قائم ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں وفود جاتے ہیں، پروفیسروں اور طالب علموں کی ٹیمیں روز آتی جاتی ہیں، یہ بڑے غضب کی بات ہے کہ ایک ہی ملک کے باشندے سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے بھی آشنا اور شناسا نہ ہوں، جتنے ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے ہوتے جارہے ہیں۔

اس صورت حال کا نقصان ہندوؤں، مسلمانوں کو یکساں اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان کو، بلکہ بالآخر انسانیت کو پہونچ رہا ہے، ملک کے فرقوں کے درمیان بڑی بڑی خلیجیں قائم ہیں، دلوں میں تلخیاں اور دماغوں میں شکوک ہیں، محبت والفت کے ساتھ رہنے، ہنسنے بولنے، زندگی کا لطف اٹھانے اور ایک دوسرے پر اعتماد اور ایک دوسرے کی تہذیب اور مسلک کے احترام کی دولت سے (جو زندگی کا حسن و رونق اور

خدا کی ایک بے بہا نعمت ہے) مجموعی طور پر یہ ملک محروم ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ بعض فرقوں، اور (اس کے کہنے میں کوئی خوف اور حرج نہیں کہ) خاص طور پر مسلمانوں کی بہترین صلاحیتیں اور توانائی اپنی صفائی اور مدافعت اور اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی حفاظت میں صرف ہو رہی ہے، اور ان کی وہ توانائیاں جو ان کو قدرتی طور پر ورثہ میں ملی ہیں، اور جنھوں نے ماضی میں، زندگی کے مختلف شعبوں میں، اور فلسفہ و تصوف سے لے کر فنِ تعمیر اور فنون لطیفہ تک، اور مملکت کے نظم ونسق سے لے کر خدمتِ خلق کے میدانوں تک، اپنے روشن اور لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ابھی اس ملک کی تعمیر و ترقی میں، اور اس کے استحکام و آراستگی میں اس طرح صرف نہیں ہو رہی ہیں، جیسی صرف ہونی چاہئیں، نفسیاتی طور پر اس کے لئے یہ اطمینان ضروری ہے کہ وہ صحیح طور پر سمجھے جاتے ہیں، ان کو خیالی اور بے جا حد تک نہیں، واقعی اور ضروری حد تک اعتماد اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جانب کے اور دوسرے فرقوں کے درمیان دبیز پردے پڑے ہوئے نہیں ہیں، ان کو شک و حقارت اور بے گانگی و اجنبیت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، ایک ایسی نسل اور فرقہ کی طرح جو ایک ہزار برس سے ہمارے ساتھ دیوار بہ دیوار اور دوش بدوش رہ رہا ہے، ہم اس کے چہرہ کے خط و خال سے واقف، اس کی خوبیوں اور کمزوریوں سے آگاہ اور اس کے ماضی و حال سے آشنا ہیں، ہمیں اس کے مذہبی عقائد کا بھی اتنا علم ہے، جتنا ان لوگوں کو ہوسکتا ہے، جو ساتھ دینے پر نہیں لیکن ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، ان کے رسم و رواج، ان کی تہذیب و معاشرت، ان کے تقریبات و تہواروں اور ان کی خوشی و غمی سے ہماری واقفیت ایک یورپین سے زیادہ اور ایک ہم وطن اور ہم سفر کے شایان شان ہے۔

مسلمانوں کی بنیادی خصوصیتیں

اب میں آپ کی اجازت سے مسلمانوں کی چند بنیادی خصوصیات کا تذکرہ

کروں گا، جن کا جاننا اور ان کا لحاظ رکھنا ان کے ہر مسئلہ کے سمجھنے اور اس کے حل کرنے کے سلسلہ میں ضروری ہے۔

مسلمانوں کی پہلی بنیادی خصوصیت

معیّن عقیدہ اور مستقل دین وشریعت

دنیا کے تمام مسلمانوں (اور ہندوستان کے مسلمان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں) کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ملی وجود کی بنیاد ایک معین عقیدہ اور ایک مستقل دین وشریعت ہے، جس کو اختصاراً مذہب(۱) کہتے ہیں، اگرچہ اس سے اس کا صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا، اور وہ لفظی اشتراک کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں اور التباس پیدا کر دیتا ہے) اسی لئے ان کا ملّی نام، اور عالمگیر لقب کسی نسل، خاندان، دینی پیشوا، بانیٔ مذہب، اور ملک کے بجائے ایک ایسے لفظ سے مشتق ہے، جو ایک معیّن عقیدہ اور رویہّ کو ظاہر کرتا ہے، دنیا کی عام مذہبی قومیں اپنے اپنے دینی پیشواؤں، بانیانِ مذاہب، پیغمبروں، ملکوں یا نسلوں کی طرف منسوب ہیں، اور ان کے نام انہیں

---

(۱) دنیا کے بہت سے مذاہب بالخصوص مسیحی دنیا میں، جو خاص تجربوں اور بحرانوں CRISES سے گزری ہے، اور جہاں ریاست STATE زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور جس کا شروع سے یہ مقولہ رہا ہے کہ ''جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو'' مذہب کا ایک بہت محدود مفہوم اور دائرہ اثر رہ گیا ہے، اور وہاں عام طور پر یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ مذہب انسان کا پرائیوٹ معاملہ ہے۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت جگہ مذہب یا دھرم صرف عادات اور چند مذہبی رسوم RITUALS کی تکمیل کا نام رہ گیا ہے، اسلام میں دین کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے، وہ عقائد وعبادات سے لے کر تمدن ومعاشرت اور عائلی زندگی کے قوانین پر محیط ہے، اسی لئے وہ زیادہ موثر اور متاثر ہونے والا عنصر ہے، عربی اور قرآنی اصطلاح میں اس کو دین کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا دائرہ ''مذہب'' سے زیادہ وسیع ہے۔

شخصیتوں یا انہیں نسلوں اور ملکوں کے نام سے مشتق ہیں، جیسے یہود (JUDAIST) اور بنی اسرائیل (BANI ISRAEL) کہلاتے ہیں، یہودا (JUDAH) حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا نام اور اسرائیل خود حضرت یعقوبؑ کا نام ہے، عیسائی CHIRSTIAN حضرت عیسیٰ (CHRIST) کی طرف منسوب ہیں، یا ان کو "نصاریٰ MAZARENES کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کی نسبت شہر ناصرہ (فلسطین) NAZARETH کی طرف ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا تھا، مجوسیوں کے مذہب کے پیروؤں کا جن کو عام طور پر ہندوستان میں پارسی کے نام سے یاد کرتے ہیں، صحیح نام ZOROASTRIAN یا زرتشتی ہے، جن کی نسبت اس مذہب کے بانی (ZARATHUST) سے ہے، بودھ مذہب ....اور بدھ مت (BUDDHISM) اور اس کے ماننے والے اپنے بانی گوتم بدھ (BUDDHA) کی طرف منسوب ہیں، یہی حال ہندوستان کے بیشتر مذاہب کا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی نسبت جن کو قرآن شریف اور تمام مذہبی کتابوں اور تاریخوں اور ادبیات میں "مسلمون" اور "امتِ مُسلمہ" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، اور اب بھی دنیا کے ہر گوشہ میں وہ "مسلم" کے لقب سے جانے پہچانے جاتے ہیں، لفظ اسلام کی طرف ہے، جس کے معنیٰ خدا کی بادشاہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، سپر ڈال دینا، اور اپنے آپ کو حوالہ (SURRENDER) کر دینا ہے، جو ایک مُستقل فیصلہ، ایک معین رویہ، طرزِ حیات اور مسلکِ زندگی ہے، وہ باوجود اپنے پیغمبروں سے شدید تعلق کے بحیثیت قوم کے محمدی نہیں کہلاتے، ہندوستان میں پہلی مرتبہ انگریزوں نے ان کو (MOHAMMEDANS) اور ان کے قانون کو (MOHAMMEDAN LAW) کے نام سے موسوم کیا، لیکن ان لوگوں نے جو اسلام کی روح سے واقف تھے، اس پر اعتراض کیا، اور اپنے لئے اسی قدیم لقب "مسلم" کو ترجیح دی، اور ان اداروں

کو جن کا نام انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں (MOHAMMEDAN COLLEGE) یا محمڈن کانفرنس پڑ گیا تھا، مسلم سے تبدیل کر دیا۔(۱)

اسی بنا پر ''عقیدہ'' اور ''دین وشریعت'' مسلمانوں کے پورے نظامِ زندگی اوران کی تہذیب ومعاشرت میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اور وہ قدرتی طور پر ان کے معاملہ میں غیر معمولی طریقہ پر ذکی الحس (SENSITIVE) واقع ہوئے ہیں ان کے انفرادی اور قومی مسائل پر غور کرنے، نیز قانون سازی، دستور اور آئین حتی کہ معاشرتی اور اخلاقی امور میں اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

دینی تسلسل اور اپنی اولاد ونسل کی دینی تعلیم کی اہمیت کی وجہ

اس متعین عقیدہ اور دین وشریعت سے وابستگی اور اس کو اپنی اخروی نجات اور دنیوی سعادت کا ذریعہ سمجھنے کا قدرتی وفطری نتیجہ ہے کہ وہ اس کو اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا اور اس اعتقادی ودینی تسلسل کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اور اس بارہ میں (وہ جس تاریخی دور یا جغرافیائی مقام میں ہوں) وہ کسی طرح کی رکاوٹ یا مداخلت پسند نہیں کرتے کہ یہ نہ صرف اس عقیدہ اور دین کی تعلیم کا تقاضہ ہے قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔''یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا (سورۃ التحریم:۶) (اپنی جانوروں اور افراد خاندان کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اور حدیث میں ہے کہ ''تم میں سے ہر ایک اپنے زیر دستوں اور زیر تربیت

(۱) مثلاً سر سید احمد خاں مرحوم کے قائم کئے ہوئے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا نام پہلے انگلو محمڈن کالج (ANGLO-ORIENTAL MOHAMMEDAN COLLEGE) تھا لیکن جب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کا نام مسلم یونیورسٹی رکھا گیا، اس طرح علی گڑھ کی مشہور تعلیمی کانفرنس کا نام ابتداء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (MOHAMMEDAN EDUCATIONAL CONFERENCE) تھا بعد میں اس کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے لکھا اور یاد کیا جانے لگا۔

وزیر اثر لوگوں کا ذمہ دار ہے۔'' بلکہ یہ اولاد اور اپنے وارثوں سے بھی سچی محبت کا تقاضا ہے، اور ہر قوم کا فطری حق ہے کہ آدمی جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، وہ اپنی عزیز اولاد و افراد خاندان کے لئے بھی پسند کرے۔

اس بنا پر مسلمان جس ملک جس ماحول میں رہیں وہ اپنی آئندہ نسل تک اپنے عقائد و خصائص منتقل کر سکنے اور بقدر ضرورت اس کا انتظام و تحفظ کر سکنے کی آزادی کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کی عدم موجودگی اور اس کی ضمانت و آزادی نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے کو حقیقی طور پر ملک کا آزاد باعزّت شہری سمجھنے سے قاصر ہیں اس دینی تعلیم کی آزادی اور بنیادی عقائد کے تحفظ کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ایسی ہی بے چینی محسوس ہوتی ہے، جیسی مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دینے یا انسان کو سانس لینے کے لئے ہوا سے محروم کر دینے سے ہوتی ہے، میں اس موقع پر بے تکلف یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لئے دین و مذہب سے محرومی یا اس کی تبدیلی کا مفہوم ایسا وحشت ناک تصور رہے جو میرے محدود علم میں کسی مذہب یا تہذیب میں نہیں ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان نہ صرف سیکولر (SECULAR) حکومت کا مفہوم اور اس کے فرائض اور دائرہ کار سے واقف ہیں، بلکہ اس کی قدر اور تائید بھی کرتے ہیں، اور اس کو ہندوستان جیسے کثیر المذاہب اور رنگارنگ تہذیب و ثقافت رکھنے والے ملک کے لئے موزوں ترین طریق حکومت اور پالیسی سمجھتے ہیں، اس لئے وہ یہ ذمہ داری حکومت پر عائد نہیں کرتے کہ وہ ان کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے، وہ صرف دو چیزیں چاہتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو اس مذہبی تعلیم کا رضا کارانہ نظام قائم کرنے سے روکا نہ جائے اور اس میں قانونی و انتظامی دقّتیں نہ پیدا کی جائیں، دوسرے سرکاری مدارس میں ایسی تعلیم مذہبی عقائد و رسوم اور روایات کی شکل

میں نہ دی جائے جس سے کسی ایک مذہب، عقائد و مسلمات کی تبلیغ ہوتی ہو، یا ان کے بنیادی عقیدۂ توحید و رسالت کی تردید اور بیخ کنی ہوتی ہو۔

دوسرے درجہ میں ان کو اپنی وہ زبان بھی عزیز ہے اور اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، جس میں ان کا سب سے بڑا مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ ہے، میری مراد اُردو سے ہے، جس سے رشتہ منقطع ہو جانے سے وہ نسلی خلا (Generation Gap) پیدا ہو جاتا ہے جس کی کوئی باشعور قوم اجازت نہیں دے سکتی، یہ حقیقت ہے کہ اب کسی کتب خانہ یا کتابی ذخیرہ کو نذر آتش کر دینے اور برباد کر دینے کی ضرورت نہیں، صرف رسم الخط (Script) بدل دینا کافی ہے، اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے، اپنی تہذیب سے اور اگر اس میں مذہبی سرمایہ ہے تو مذہب سے خود بخود منقطع ہو جائے گا، اس لئے مسلمان اپنے ملی وجود اور تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے اردو زبان کی بقا اور اس کے پڑھنے اور سیکھنے کے مواقع کے باقی رہنے اور (حکومت کی سطح پر) اس کی تعلیم کی سہولت کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، اور حکومت اور سرکاری نظام تعلیم سے اس بارہ میں ضروری حد تک تعاون و امداد کا مطالبہ کرے ہیں، اس موقعہ پر اس سے زیادہ تفصیل سے عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اور اس پر پورا لٹریچر اور تحریک موجود ہے۔

مسلم پرسنل لا کی اہمیت کی وجہ

اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ان چند قوانین کو مستثنیٰ کر کے جو مقامی رواج، عرف (Convention) یا جاگیردارانہ نظام کے اثر سے مسلمانوں نے اختیار کئے اور ان کو انگریزی دور میں محمڈن لا میں شامل کر دیا گیا، ان کا شخصی اور عائلی قانون (Personal Law) کا اصل اور بنیادی حصہ قرآن شریف سے ماخوذ ہے، اور اس کی تفصیلات و جزئیات اور تشریحات حدیث و فقہ پر مبنی ہیں۔

ان میں کچھ حصہ ایسی وضاحت وقطعیت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے، یا وہ ایسے تواتر کے ساتھ ثابت اور ایسے تسلسل کے ساتھ اس پر عمل رہا ہے، یا اس پر علماء کا ایسا اجماع ہو چکا ہے کہ اس کا انکار کرنے والا اب اصولی وقانونی لحاظ سے دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا، اور خواہ اس کی تشریح اور عملی تطبیق (Application) میں کتنا ہی زمانہ کا لحاظ کیا جائے، اس میں تغیر وتبدّل اور ترمیم کا کوئی سوال نہیں، اس معاملہ میں کسی مسلم اکثریت کے ملک کی نمائندہ حکومت اور مجلس قانون ساز کو بھی کسی تبدیلی کا اختیار نہیں اور بالفرض اگر ایسا کیا گیا یا کرنے کا ارادہ ہے تو یہ ایک تحریف کا عمل اور مداخلت فی الدین کے مرادف ہے، البتہ جو تمدّنی مسائل اجتہادی ہیں، ان کے بارے میں کوئی نص قرآنی (قرآن کا صریح حکم) یا قطعی حدیث نہیں ہے، مسلم دانشوروں اور ماہرین فقہ (جو مسائل کے استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں) ضروری بحث ونظر کے بعد مقاصد واصولِ دین اور جدید حالات وتغیرات کی رعایت کرتے ہوئے ان کو وقت اور عملی زندگی سے ہم آہنگ بنا سکتے ہیں، اور یہ عمل (Process) تاریخ اسلام کے ہر دور میں جاری رہا ہے، اور اس کا اتنا بڑا ذخیرہ مسلمانوں کے پاس (فقہ وفتاوی کی شکل میں) موجود ہیں، جس کی نظیر کسی دوسری ملّت کے پاس ہمارے علم میں نہیں ہے۔

مسلمانوں کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق

ان کی دوسری خصوصیت ان کا اپنے پیغمبر سے گہرا تعلق ہے، ان کے یہاں پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت محض ایک بڑے انسان، قابلِ تعظیم شخصیت اور مذہبی پیشوا کی نہیں، ان کا تعلق آپ کی ذات کے ساتھ اس سے کچھ زیادہ، اور اس سے کچھ مختلف ہے، جہاں تک آپ کی عظمت کا تعلق ہے، اس کو اس مشہور مصرعہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر ادا نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ؎

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ان کو آپ کے بارہ میں تمام مشرکانہ خیالات اور اس غلو و مبالغہ سے بھی روکا گیا ہے، جو بعض پیغمبروں کی امتوں نے اپنے پیغمبر کے متعلق روا رکھا ہے، ایک صحیح حدیث میں صاف طریقہ پر آیا ہے کہ "مجھے میری حد سے نہ بڑھانا، اور میرے بارہ میں اس مبالغہ سے کام نہ لینا جو عیسائیوں نے اپنے پیغمبروں کے بارے میں روا رکھا ہے، کہنا ہو تو یوں کہنا کہ "خدا کا بندہ اور خدا کا رسول"۔

لیکن اس معتدل عقیدہ اور تعظیم کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ وہ جذباتی لگاؤ، وہ قلبی ربط و تعلق ہے، جو ہمارے محدود علم و مطالعہ میں کسی قوم و ملت میں اپنے پیغمبر کے ساتھ نہیں پایا جاتا، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں اکثر افراد آپ کو اپنے والدین، اولاد اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اور آپ کے ناموس مبارک کی حفاظت اپنا فریضہ جانتے ہیں، وہ کسی وقت بھی ناموس مبارک پر آنچ آنے تک کو برداشت نہیں کر سکتے، وہ اس معاملہ میں اتنے جذباتی اور حساس واقع ہوئے ہیں کہ ایسے نامبارک موقعہ پر وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اپنی زندگیوں کو قربان کر دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے، ہر دور میں اس بیان کی صداقت کے لئے واقعات اور دلائل ملیں گے، آج بھی آپؐ کا نام، آپؐ کا ناموس، آپؐ کا شہر، آپؐ کا کلام، آپؐ سے نسبت رکھنے والی چیزیں مسلمانوں کے لئے محبوب ترین اشیاء ہیں، اور وہ ان کے خون اور اعصاب میں حرکت و حرارت پیدا کرتی رہتی ہیں۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بارہ میں صدیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو دنیائے اسلام میں ایک امتیاز حاصل رہا ہے، اس کے متعدد تاریخی، علمی و جغرافی، نسلی اور نفسیاتی اسباب ہیں جن کا تجزیہ و تشریح ادب و شاعری، مذہب و تصوف، اور نفسیات پر بحث و تحقیق کرنے والے مصنفین کا کام ہے، یہاں اتنا کہنا

کافی ہے کہ آخری صدیوں میں بہترین نعت گو شاعر اس ملک میں پیدا ہوئے، اور سیرت نبویؐ پر بہترین کتابیں (جن کا لوہا عرب و مسلم ممالک میں بھی مانا گیا، اوران سے فائدہ اٹھانے اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی) آخری دور میں ہندوستانی مصنّفین کے قلم سے اردو زبان میں نکلیں۔

قرآن مجید سے تعلق

یہی معاملہ ان کا قرآن مجید کے ساتھ ہے، کہ وہ اس کو محض دانشمندی، اخلاقی نصائح اور معاشرتی قوانین کا کوئی مجموعہ نہیں سمجھتے، جو کسی درجہ میں قابل احترام ہیں، اور جب سہولت سے ممکن ہو اس پر عمل کرلیا جائے، بلکہ وہ اس کو اوّل سے لے کر آخر تک لفظاً و معنیً خدا کا کلام اور وحی الٰہی سمجھتے ہیں، جس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے، اور اس میں کسی شوشہ کی تبدیلی بھی نہیں ہوسکتی، وہ اس کو ہمیشہ باوضو پڑھتے اور اونچی جگہ رکھتے ہیں، اُن میں اس کے مکمل طور پر حفظ کرنے اور اچھے سے اچھے طریقہ پر پڑھنے کا بھی خاص اہتمام و رواج ہے، خود ہندوستان میں قرآن مجید کے حُفاظ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے، رمضان المبارک میں تراویح کی نماز میں (جو دن کی آخری نماز عشاء کے بعد ہوتی ہے) مساجد میں کم سے کم ایک بار پورے قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے کا عام رواج ہے، اور مشکل سے کوئی آباد مسجد اس سے خالی ہوتی ہے۔

ان دونوں (پیغمبر اور قرآن) کے بعد ان کا دینی و جذباتی تعلق مسجدوں، مرکز اسلام (مکہ مدینہ) اور مقامات مُقدّسہ سے بھی ہے، ان کے عقیدہ میں مسجد ایک مرتبہ بن کر مسجد رہتی ہے، اس پر نہ کسی کا قبضہ ہوسکتا ہے، نہ وہ فروخت ہوسکتی ہے، یہ تعلق عقلی اور عملی طور پر ان کی سچی حُبّ الوطنی، اور ملک کے ساتھ وفاداری کے کسی طرح منافی اور اس پر اثر انداز نہیں کہ ان دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں، یہ

ان کے عقیدہ، جذبۂ احسان مندی کا نتیجہ ہے کہ (جس سے آدمی کوئی نعمت پاتا ہے، یا اس کو اس کی وجہ سے سیدھا راستہ ملتا ہے، اور روشنی حاصل ہوتی ہے، اس کا شکر گزار اور احسان مند ہوتا ہے) اور یہ ان کے مطالعہ تاریخ کا بھی نتیجہ ہے، اور اس سے کسی حساس، باضمیر، اور شریف فرد اور قوم کو روکا نہیں جا سکتا۔

صرف مسلمانوں ہی نہیں کسی فرقہ، قوم یا آبادی کے متمیّز عنصر کے قوتِ عمل، توانائی اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کے تعاون سے ملک کی تعمیر و ترقی میں فائدہ اٹھانے اور ملک میں اتحاد و اعتماد، خوش دلی اور گرم جوشی کی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس ملّت یا فرقہ کے بنیادی عقائد، اس کے مذہبی جذبات اس کے نازک شعور اور ''حساسیت'' (Sensitivity) کا لحاظ رکھا جائے، اور ان شخصیتوں یا حقیقتوں کا احترام ملحوظ رہے جن کے عظمت و عقیدت یا محبت صدیوں سے اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے، اور جن کی اہانت سے (جو اکثر اوقات بے ضرورت ہوتی ہے) بڑے بڑے قومی و ملکی مفادات کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ بالغ نظری، حق پسندی، سچی حُبّ الوطنی اور حق ہمسائگی کا تقاضا ہے کہ اگر اس قوم یا فرقہ کا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے، جو حق و انصاف پر مبنی ہے، اور اس بارہ میں وہ قوم یا فرقہ کسی ظلم و زیادتی کا نشانہ یا نشۂ قوت کا شکار ہے، تو اس میں اس کی حمایت و تائید کی جائے، اور اس مسئلہ میں اس قوم یا فرقہ کے شانہ بشانہ حق کی حمایت کی جائے اور مظلوم کا ساتھ دیا جائے۔

گاندھی جی کی بالغ نظری، حق پسندی اور اس کا فائدہ

اس بالغ نظری، حق پسندی، اور اپنے ہم وطنوں کی ایک صحیح مسئلہ اور موقف میں نہ صرف تائید و حمایت بلکہ قیادت کی درخشاں مثال گاندھی جی کے اس تاریخ ساز

طرزِ عمل میں ملتی ہے، جو انہوں نے ۲۰-۱۹۱۹ء کی شہرۂ آفاق خلافت تحریک کی تائید کر کے پیش کی، اور جس سے ہندوستان کے اتحاد اور جنگ آزادی کو وہ بیش بہا فائدہ پہنچا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے، نہ اس کے بعد، ہم یہاں پہلے ان کی کتاب (Serach For Truth) (تلاش حق) کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، پھر تحریک آزادی کی تاریخ سے اس کے فوائد و اثرات کا جائزہ لیں گے۔

گاندھی جی لکھتے ہیں:-

''کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائرشاہی کی تحقیقات ابھی شروع ہی ہوئی تھی، میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی، جو مسئلہ خلافت پرغور کرنے کے لئے دہلی میں ہو رہی تھی، اس دعوت نامہ پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں سوامی شردھا نند جی بھی شریک ہوں گے، جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے، اور اس کا اجلاس نومبر میں قرار پایا تھا، اس کانفرنس کا مقصد اس صورتِ حال پر غور کرنا تھا، جو خلافت کے معاملہ میں حکومت کی بدعہدی سے پیدا ہوگئی تھی، اور یہ طے کرنا تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئو رکشا کے مسئلہ پر بھی بحث ہوگی اور یہ اس کے طے کرنے کا بہترین موقعہ ہے، مجھے گئو رکشا کا ذکر اس سلسلہ میں پسند نہیں آیا، میں نے اس دعوت نامہ کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں

کو گڈ مڈ نہیں کرنا چاہئے، اگر ان دونوں کے متعلق بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجئے جیسے سودا چُکایا جاتا ہے بلکہ دونوں کے حُسن و قبح پر الگ الگ غور کیجئے۔

یہ خیالات دل میں لئے ہوئے کانفرنس میں گیا، اس میں مجمع بہت کافی تھا، مگر اتنا نہیں جتنا اس کے بعد کے جلسوں میں ہوا، میں نے اس مسئلہ پر جس کا ذکر آچکا ہے سوامی شردھانند جی آنجہانی سے گفتگو کی، انہوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجئے، میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کرلیا، کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے، اور اگر حکومت نے اس معاملہ میں صریح بے انصافی کی ہے، تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں، ان کے لئے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقعہ پر گئو رکشا کا مسئلہ بیچ میں لائیں اور صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں، اور مسلمانوں کے لئے بھی اس شرط پر گاؤکشی بند کرنا نامناسب ہے، کہ ہندو خلافت کے معاملہ میں اُن کا ساتھ دیں، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤکشی ترک کردیں۔

(تلاش حق ص ۳۰۸-۳۰۹ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین)

مسٹر اندولال کے یاگنک (Indulal K. Yajnic) اپنی انگریزی کتاب

(GANDHI AS I KNOW HIM) میں گاندھی جی کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مختصر دعویٰ یہ ہے کہ سلطنت ترکیہ میں جتنی غیر مسلم نسلیں آباد ہیں، ان کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لے کر پوری ترکی کو ترکی کے قبضہ میں رہنا چاہئے، مُقدس مقامات اور جزیرۂ عرب یعنی ملک عرب حسب تعریف علمائے اسلام پر سلطان کا اقتدار بدستور قائم رہے، البتہ اگر اہلِ عرب چاہیں تو وہ خود اختیاری حکومت کے حقوق ہر وقت حاصل کر سکتے ہیں۔

مجھے مسئلہ خلافت کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، میرے اطمینان کے لئے یہی کافی تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات میں کوئی چیز ناجائز اور غیر معقول نہ تھی .... مجھے محسوس ہوا کہ خلافت کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ نہ صرف مبنی برانصاف تھا، بلکہ برطانیہ کے وزیر اعظم نے بھی ان کے مطالبہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے جو کچھ بھی میرے امکان میں ہے دریغ نہ کروں۔

یہ تھی وہ نازک دلیل جس کی بنا پر قبل اس کے کہ تحریک خلافت کو وہ اہمیت حاصل ہو جو اسے بعد میں ملے گی، گاندھی جی نے مطالبۂ خلافت کی تائید اپنے لئے لازمی قرار دے دی۔"

(ص ۳۷-۳۸ ترجمہ مولانا ظفر احمد انصاری)

مشہور نیشنلسٹ مسلمان دانشور اور تحریک خلافت کے ایک باوثوق مورخ

قاضی محمد عدیل عباسی صاحب اپنی کتاب ''تحریک خلافت'' میں گاندھی جی کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''گاندھی جی زمین کا گز بنے ہوئے چاروں طرف دوڑ رہے تھے، خلافتِ اسلامیہ سے جو ہمدردی انہوں نے ظاہر کی اور جس خلوص سے وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان میں آگئے اس کا اثر ہر کہہ ومہہ پر تھا، اور بہت جلد وہ مسلمانانِ ہند کے مسلّمہ لیڈر بن گئے۔

دوسری خلافت کانفرنس (دہلی) زیر صدارت مولوی فضل الحق کے سلسلہ میں ۲۴ر نومبر ۱۹۱۹ء کے متحدہ اجلاس کا حال اخبارات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اس کے بعد گاندھی جی نے تقریر فرمائی جس میں آپ نے خلافت کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے، ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کے دل رنجیدہ ہیں تو ہندوان کے ساتھ شریک ہیں .... اس کے بعد گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کے لئے چندہ کی اپیل کی اور بذاتِ خود ایک پیسہ تبرکاً عنایت کیا، بس کیا تھا، یہ پیسہ نیلام ہوا اور اسے ۱۰۱ روپیہ میں سیٹھ چھوٹانی نے خریدا، ایک ہزار نقد چندہ وصول ہوا، اور ڈیڑھ ہزار کا وعدہ ہوا۔'' (تحریک خلافت ۱۴۴۔۱۴۶ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم)

اپریل ۱۹۲۴ء کے ''ینگ انڈیا'' میں گاندھی جی نے خود لکھا:-

''خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی، اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔''

(تحریک خلافت ۱۴۴۔۱۴۶ قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم)

قاضی محمد عدیل عباسی لکھتے ہیں:-

''جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانہ میں آنکھوں کے سامنے آیا، اس کو پھر دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس گئیں، تحریک آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا، اب صرف ایک جذبہ کارفرما تھا، کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے، اور اس لئے سارا ہندوستان پھٹے کپڑوں، ننگے سر اور ننگے پیر والے رضا کاروں سے بھر گیا، لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرے ہندو مسلمان مل کر لگاتے تھے، ''اللہ اکبر'' مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے، کالجوں اور اسکولوں سے ہندو اور مسلمان لڑکے نکل پڑے اور دوش بدوش کام شروع کردیا، ایک لہر تھی جو موج دریا کی طرح رواں دواں تھی، کہیں اختلاف یا نفرت کا ایک دوسرے سے نام و نشان نہ تھا۔''

(تحریک خلافت ۲۷۱۔۲۷۲ قاضی محمد عدیل عباسی، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی۔)

گاندھی جی کی یہی بالغ نظری، حقیقت پسندی اور وسیع القلبی تھی جس کے نتیجہ میں ہمارے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نظارہ دیکھنے میں آیا جو نہ اس سے پہلے نظر آیا تھا، نہ اس کے بعد، اور جس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ سارا ملک غیر ملکی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اور بالآخر اس کو اس ملک کی حکومت سے دستبردار ہو کر اس کو اہل ملک کے حوالہ کرنا پڑا۔

برعکس اور ناقابل فہم طرز عمل

اس کے بالکل برعکس ذہنیت اور طرز عمل کی میں ایک ایسی مثال پیش کرتا

ہوں جو ان سطور کے لکھنے کے وقت تک قائم ہے، اور جو اس وقت مجلسوں کانفرسوں سیمنار، اخبارات ورسائل کا موضوع بنی ہوئی ہے، بلکہ گھر گھر، مجلس اس کا تذکرہ ہے، یہ وہ صورتِ حال ہے جو سپریم کورٹ کے ۲۳/اپریل ۱۹۸۵ء کے شاہ بانو کیس کے فیصلہ نے پیدا کر دی ہے، سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس چندر چوڑ نے یہ فیصلہ دیا کہ مسلمانوں مُطلّقہ خاتون کو اس وقت تک جب تک وہ دوسری شادی کرے، اور شادی نہ کرنے کی صورت میں حین حیات طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے گزارہ (نان نفقہ) (MANTENANCE) دیا جانا ضروری ہے، جس کے لئے دلیل اور جواز قرآن مجید کے لفظ ''متاع'' سے فراہم کیا گیا، جس کا ترجمہ انگریزی کے ان بعض مترجمین نے تفسیر اور عربی زبان سے گہری اور تفصیلی واقفیت نہ ہونے اور سیاق وسباق کا لحاظ کئے بغیر (MAINTENANCE) سے کیا ہے، فیصلہ کی تمہید میں اس کا دعویٰ کیا گیا کہ اسلام میں عورت کو اس کا جائز اور فطری مقام نہیں دیا گیا، اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، اور اس طرح اس نئے فیصلہ اور قانون کے ذریعہ اس کے حقوق کا تحفظ کیا جانا ضروری ہے۔

اس فیصلہ کے انداز تحریر اور اس سے جو وسیع اور عمیق اثرت مرتّب ہوتے ہیں، اس کے خلاف مسلمانوں میں ایک ایسا شدید ردِعمل اور بے چینی کی ملک گیر لہر پیدا ہوئی جس کی مثال (اگر مؤرّخانہ احتیاط سے کام لیا جائے) تو تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، اس نے مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) اور فقہی مسلکوں کو اس طرح متحد کر دیا، اور اس کے خلاف یک آواز بنا دیا، جس کی مثال عرصۂ دراز سے کم سے کم اس ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی، سری نگر سے لے کر کنیا کماری تک، اور خلیج بنگال سے لے کر بحر عرب کے کنارہ تک اتنے عظیم جلسے ہوئے، جن کی نظیر دور دور اور دیر دیر تک نظر آنی مشکل ہے، جن میں

ہزاروں انسانوں سے لے کر لاکھوں تک حاضرین کی تعداد پہنچتی ہے، جو اس جذبہ، ذوق وشوق، اور جوش وخروش کیساتھ شریک ہوئے، جو صرف ایمان وعقیدۂ حق و صداقت پر یقین اور اپنی جان سے زیادہ عزیز مذہب کیلئے خطرہ کا احساس ہی مذہب کو ماننے والی کسی قوم کو جمع کر سکتا ہے۔

میں صرف اپنے وطن رائے بریلی کی مثال دیتا ہوں جو نسبتاً ایک چھوٹا شہر ہے، جس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں، ۹ر فروری ۱۹۸۶ء کو وہاں جو جلسہ تحفظ شریعت کے نام سے چند نوجوان کارکنوں کی طرف سے منعقد کیا گیا (جو کوئی سیاسی یا دینی وعلمی شہرت نہیں رکھتے تھے) اس میں حاضرین کی تعداد کا محتاط اندازہ ایک لاکھ سے زائد کا تھا، لوگ اپنے جذبہ اور شوق سے مختلف اضلاع سے مستقل بسیں اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کر کے آئے تھے، بڑے اور مرکزی شہروں کے جلسوں کی وسعت اور کامیابی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے بارہ میں مسلمانوں کی اس بے چینی کے تین اسباب تھے۔

ا۔ پہلا یہ کہ اس سے ان کے آئینی قانون پرسنل لا میں مداخلت کا دروازہ کھلتا ہے اگر وہ اس پر خاموش رہتے ہیں، تو ان کے اس عائلی قانون کے (جس کو وہ اپنے مذہب کا جزء اور قرآن وسنت کے صریح احکام پر مبنی سمجھتے ہیں) سارے اجزاء خطرہ میں پڑ جاتے ہیں، اور ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے کہیں رکنے کی کہیں کوئی ضمانت نہیں، اور اس سے ان کا اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے اور ہندوستان میں اپنے ملّی تشخص کو قائم رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ زندگی کے دریا میں مچھلیوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جن کی کوئی شناخت نہیں، اور جب مچھلیوں کا ذکر آ گیا تو میں کہتا چلوں کہ جہاں تک مسلمانوں

کے بنیادی عقائد کا تعلق ہے، وہ اپنی شریعت کے بغیر اسی طرح معنوی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے جیسے جسمانی طور پر مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی۔

۲۔ ان کی بے چینی اور اس فیصلہ سے بے اطمینانی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ان کی شریعت مطلقہ خاتون کو اس سے زیادہ تحفظ فراہم کرتی اور باعزت زندگی کے وسائل و مواقع مہیا کرتی ہے جتنا سپریم کورٹ کے فیصلہ نے اس کا انتظام تجویز کیا ہے، اور یہ اس سے کم وقت میں اور زیادہ سہولت و عزت کے ساتھ ہو سکتا ہے، جتنا عدالت اور انتظامیہ کے ذریعہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی بنا پر ممکن ہے۔

معترضین کا کہنا ہے کہ اگر طلاق کے بعد سابق شوہر سے سابق بیوی کو نان نفقہ نہ دلوایا گیا تو وہ بے سہارا رہ جائیگی، مگر نان نفقہ کے متعلق شریعت کا بندوبست جو زیر بحث بل میں شامل کر لیا گیا ہے، اس بندوبست سے کہیں بہتر ہے، جس کی وکالت شاہ بانو والے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے حمایتی کر رہے ہیں، اس فیصلہ کے تحت ایسی مطلقہ عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری جو اپنی گذر بسر خود نہ کر سکے اور جس نے طلاق کے بعد شادی نہ کی ہو، صرف ایک شخص یعنی اس کے سابق شوہر پر ڈالی گئی ہے، اور اگر یہ شخص نادار ہو یا اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی سابق بیوی کے لئے کوئی سہارا نہیں رہ جائے گا جبکہ بل کے تحت ایسی عورت کی کفالت اس کے بہت سے رشتہ داروں پر اور اگر وہ سب نادار ہوں تو وقف بورڈ پر عائد ہوگی۔

اس موقع پر اس اخلاقی اور نفسیاتی فرق اور نتائج کو بھی خیال میں رکھنا چاہئے جو ایک ایسے مرد سے گذارہ (نان نفقہ) حاصل کرنے میں اور اس کے برخلاف اپنے قریبی عزیزوں سے جو اس کی وارثت پانے کے مستحق ہیں، اور جن کا رشتہ ازدواجی تعلق پر منحصر نہیں خون اور نسل و نسب کا رشتہ ہے ایک شریف و خود دار عورت پر مرتب ہوتے ہیں، کیا ایک شریف اور خود دار عورت کے لئے یہ زیادہ

موزوں و مناسب ہے کہ وہ اس مرد سے آذوقۂ حیات حاصل کرے جس نے طلاق دے کر اس کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے، یا اپنے ان خونی رشتہ داروں سے جواب بھی اس سے محبت اور اس کا احترام کرتے ہیں، اس کا جواب ضمیر و عقل سلیم رکھنے والا ہر فرد آسانی کے ساتھ دے سکتا ہے۔

میں یہاں پر اس سے زیادہ اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، تقریروں اور ان مضامین میں جو ماہرین دینیات و قانون نے اس موضوع پر لکھے ہیں، اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور ہمارے حقیقت پسند، صاف ذہن اور جرأت مند وزیر اعظم نے بھی اپنی ۲۷ر فروری ۱۹۸۶ء کی تقریر میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، اور اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی بے چینی اور اختلاف کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جو خالص اصولی علمی، عقلی و انسانی اہمیت کی حامل ہے اور جس میں وہ حقیقتاً اپنے ہی دین و شریعت کے دفاع اور اس کی حفاظت کی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں، بلکہ وہ دوسرے مذاہب، فرقوں اور تمام علوم و فنون (SCEINCES) اور پورے نظام علم و فکر کے حصار بندی (PROTECTION) کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ یہ کہ کسی علم و فن میں مہارت خصوصی اور اس کی نمائندگی کا حق کس کو حاصل ہے، اور اس میں کس کا قول سند (AUTHORTIY) سمجھا جائے گا؟ یہ ایک بین الاقوامی، بلکہ عالمی و دوامی حقیقت کو تسلیم کرانے کی مقدس جدو جہد کے مرادف ہے، اور جو ہمارے پورے نظامِ فکر و نظامِ تعلیم کو انتشار و بحران (ANARCHY) اور (CRISES) سے بچاتا ہے ....قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح، اور سنت اور فقہ کے احکام کی ترجمانی کا حق اس مذہب کے ماہرین فن (SPECIALIST SCHOLERS) اور (EXPERTS) کو حاصل ہے، یا ان کتابوں کے ترجمہ کی مدد سے عدالت کے فاضل ججوں اور ایسے

دانشوروں کو حاصل ہے، جو نہ اس مذہب کی اصل زبان سے واقف ہیں، نہ انہوں نے اس کے مطالعہ میں کافی وقت اور ضروری محنت وتوجہ صرف کی ہے مسلمان علماء اور عامۃ المسلمین کی اس فکرمندی اور جدوجہد کا محرک فوری طور پر فاضل جج کے قرآنی اصطلاحات ''متاع'' اور ''متعہ'' اور ''نفقہ'' وغیرہ کی وہ تشریح ہے، جو انہوں نے جیسا کہ میں نے اوپر کہا، قرآن مجید کے ایک دو انگریزی ترجموں اور قانونی کتابوں سے سرسری مطالعہ کی بنا پر کی ہے، لیکن حقیقت میں اس سے ہر مذہب وفرقہ کا مذہبی نظام، عائلی قانون اور عقائد وعبادات تک خطرہ میں پڑ جاتے ہیں، اور جیسا کہ میں نے سلطان پور میں ہونے والے ایک عظیم جلسہ کی تقریر میں کہا تھا کہ ہندوستان کے ہر مذہب وفرقہ اور کمیونیٹی کو اگر خطرہ کا احساس ہو جائے، اور ان کی دور بینی اور ذہانت اس حقیقت کو بھانپ لے کہ بقول شاعر ع

آج تم کل ہماری باری ہے

تو وہ مسلمانوں کے شکر گزار ہوں گے کہ انہوں نے اپنی آواز بلند کرکے اس خطرے کے سدباب کا انتظام کیا، میں نے اس سلسلہ میں قرآن مجید کی بعض آیات کا بھی حوالہ دیا، میں نے یہ بھی کہا کہ میں متعدد عرب ممالک کی علمی مجلسوں (ACADEMIES)... اور ماہرین قانون کمیٹیوں کا ممبر ہوں، میں اگر کسی عرب فاضل کو بھی وید، یا ہندو مذہب کے کسی مذہبی اصطلاح کی من مانی تعبیر، اس کی زبان، سیاق و سباق سمجھے بغیر اور اس کے ماہرین فن کی مدد لئے بغیر کرتے ہوئے سنوں گا، تو میں پہلا شخص ہوں گا، جو اس پر سختی سے اعتراض کریگا، اور اس کے اس طرز عمل کو غلط کہے گا۔

اس سب کے علاوہ یہ مسلم کمیونیٹی کے ایک مخصوص ومحدود طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، طلاق کی شرح اور مُطلقہ عورتوں کی تعداد کے بارے میں عام طور پر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے، پھر عرصۂ دراز سے یہ سلسلہ جاری

تھا، اور یہ مسئلہ کبھی کسی عوامی و قومی سطح پر نہیں آیا تھا، مطلقہ خواتین اپنے اپنے خاندانوں اور خونی رشتہ داروں، ماں باپ، بھائی بہن اور اگر اولاد ہے تو اولاد کے ساتھ سیکڑوں برس سے زندگی گزار رہی ہیں، میں نے مدراس کی ایک پریس کانفرنس میں جو ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء کو ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے چوٹی کے انگریزی اخبارات کے نمائندے بھی شامل تھے، بے ساختہ سوال کیا کہ آپ میں سے کون ہے جس نے چند مسلمان عورتوں کو سڑک پر کھڑا ہوا بھیک مانگتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم بھوکوں مر رہے ہیں اور ہمارا کوئی خبر لینے والا نہیں! کسی طرف سے جواب نہیں آیا کہ ہم نے دیکھا ہے۔

اس سب کے بعد پھر یہ قانون مسلمانوں کے لئے بنایا گیا ہے، اس کا نفاذ واطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے، اس کے لئے ہمارے دوسرے عزیز و معزز ہم وطنوں کو جن کی خواتین پر یہ قانون لاگو نہیں بے چین اور مضطرب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن مسلمانوں کے اختلاف اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا تو سارے ملک میں اور خصوصیت کے ساتھ پریس میں اور خاص طور پر انگریزی ہندی پریس میں ناگواری طنز و تعریض و تضحیک کی ایک لہر دوڑ گئی، پھر جب ۲۱ر فروری ۱۹۸۶ء کو یہ بل پارلیمنٹ کے نئے سشن میں ٹیبل پر رکھ دیا گیا، اور ان مسائل کی فہرست میں آ گیا جن پر پارلیمنٹ کو غور کرنا اور فیصلہ دینا ہے، تو ایسا معلوم ہوا کہ سارے ہندوستان میں خطرہ کی ایسی گھنٹی بج گئی جیسی (خدا محفوظ رکھے) ملک پر کسی بیرونی حملہ، یا ملک کے اندر کسی شدید وبا، یا کوہ آتش فشاں پھٹنے کے موقعہ پر بجنی چاہئے، یہ اس احساس تناسب SENSE OF PROPORTION کے بھی خلاف ہے، جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ فکر و پریشانی کا مستحق ہے، اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ

عقلِ سلیم کا تقاضا ہے، نہ عقلِ عملی (PRACTICAL WISDOM) کا'' گاندھی جی کے اس اعلیٰ اخلاقی واصولی موقف اور اس عاقلانہ قیادت کو سامنے رکھتے ہوئے جس نے ایک ایسے مسئلہ میں جس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے اندرونی حالات سے براہ راست نہ تھا، ہندوستان سے ہزاروں میل دور، اور سمندروں پار خلافت کے مسئلہ سے تھا، جس کا مرکز ترکی تھا، ہمارے ہم وطنوں اور اکثریت کے دانشوروں اور اخبار نویسوں اور مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کا موقف یہ ہونا چاہئے تھا، کہ اگر وہ مسلمانوں کے موقف کی تائید نہ کریں تو کم سے کم غیر جانبدار اور خاموش رہیں کہ اس سے ان کے عائلی قانون، پرسنل لا، ان کی قومی زندگی اور ان کے طبقہ خواتین کے حقوق وتحفظ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس سے ملک میں ایک خوشگوار فضا اور باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی، اس سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق خود ان کے فرقہ اور طبقۂ نسواں کی سیکڑوں، ہزاروں نئی بیاہی ہوئی دلہنوں کے جلائے جانے یا غیر طبعی طور پر ان کو ہلاک کردینے کے واقعات ہیں جن سے شاید اس لمبے چوڑے ملک میں کوئی دن خالی جاتا ہو، نیشنل پریس کی اطلاع کے مطابق صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹہ پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے۔ TIMES OF INDIA لکھنؤ کی اشاعت ۶/اپریل ۱۹۸۶ء میں ایک خاتون کا بیان شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں غیر قانونی طور پر اسقاط حمل سے چھیاسٹھ لاکھ (۶۶۰۰۰۰۰) اموات ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کو خطرہ اور قریب قریب یقین ہے کہ اگر اس جبری گذارہ کا قانون پاس ہوگیا، اور طلاق دینے والے سابق شوہر کو دوسری شادی تک (جس کا ہونا ضروری نہیں) اور اس کے نہ ہونے کی شکل میں مدت العمر گذارہ دینا (جس کی مقدار اندازہ ہے کہ مسلسل طریقہ پر گرانی اور معیار زندگی بڑھتے رہنے کی وجہ سے

برابر بڑھائی جاتی رہے گی) ضروری ہوگا طلاق سے بچتے ہوئے (جو بعض اوقات اندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے، اور جس کا اعتراف مغربی دانشوروں اور ہمارے ملک کے قانون سازوں نے بھی کیا ہے) اپنی ناپسندیدہ رفیقہ حیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے مسلمان بھی ایسے ہی عمل اختیار کریں گے جیسے نہات سفاکانہ طریقہ پر بیوی کو رخصت کرانے کے بعد ہندوستان کے معاشرہ میں کثرت سے پیش آرہے ہیں، اگر خدانخواستہ یہ قانون پاس ہوگیا تو جو لوگ زندہ رہیں گے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یا اپنے کانوں سے سنیں گے۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ ایسے دوستانہ، خوشگوار اور پراز اعتماد مجلس میں جو ملک کے اصولی اور بنیادی مسائل پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئی ہے، میں نے ایک ایسے مسئلہ کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن اس کا ذکر کئے بغیر حالات کا صحیح جائزہ اور ملک کو صحیح رُخ پر لگانے اور اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو ملک وانسانیت کی خدمت پر صرف کرنے کا کام نہیں کیا جاسکتا۔

ملک کے لئے صحیح اور محفوظ راستہ

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بقاء، ترقی، عزت واستحکام اور اس کا معاصر دنیا اور اس خطرناک و پیچیدہ عالمی صورت حال میں اپنا شایان شان کردار ادا کرنے کے لئے صحیح محفوظ، باعزت اور بے خطر راستہ وہی ہے جو تحریک آزادی کے مخلص دانشور اور بلند قامت و قیمت رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا اور وہ سچے سیکولرزم، صحیح جمہوریت اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے خواہ وہ کتنا طویل اور مشکل ہو، اس کے علاوہ جو راستہ تجویز کیا جائے گا، اس سے خواہ عارضی ووقتی طور پر کامیابی حاصل ہو ملک کے لئے تباہ کن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے، جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں، اور ملک کو

ایسی مشکلات ومسائل سے دوچار کرنے والا ہے، جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

ملک کے لئے تین بڑے خطرے

اب میں مذہب، انسانی تاریخ، فلسفہ اور اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناتہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں (اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرزفکر غالب ہے نہ کہے گا) کہ اس ملک کے لئے دو خطرے بڑے تشویشناک ہیں، اور آپ کی پہلی توجہ کے مستحق، ایک ظلم وتشدد کا رجحان، انسانی جان ومال اور عزت و آبرو کی بے قیمتی (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اور اونچ نیچ کی بناء پر پورے پورے خاندانوں اور محلوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدہ کے لئے انسان کی جان لے لینا، سفاکانہ جرائم، اور مظالم کی کثرت اور سب کے آخر میں (لیکن سب سے زیادہ شرمناک حقیقت) مطلوب ومتوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کو جلا دینا، یا زہر دے کر مار دینا اور ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔

جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت کرنے والا اور مہربان ہے، اس عمل سے خوش نہیں ہوسکتا اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا، اور اس کے نتیجہ میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا، اور وہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا، لیکن جو لوگ مذہب پر اعتقاد نہیں رکھتے وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اور سفاکی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور وہ تہذیبیں جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ وادب کے صفحات پر ان کے روشن نقوش ہیں، زوال کا شکار ہوگئیں، اور داستان پارینہ بن کر رہ گئیں، اس صورت حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل اور انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت

ہے، اس کے لئے گاؤں گاؤں، محلہ محلہ جانے کی ضرورت ہے، سخت قوانین، عبرت ناک سزاؤں، ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ کو سخت سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے ورنہ نہ بانس رہے گی نہ بانسری۔

دوسرا خطرہ فرقہ پرستی، جارحیت وتشدد کے کھلے رجحانات ہیں جن کے سلسلہ میں ادنیٰ سی رعایت، لچک اور نرمی سے وقتی طور پر خواہ کچھ فائدہ پہنچ جائے یا پریشانی سے بچا جا سکے، ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا ہے، جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی، گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدد اور جارحیت، پہلے ملک کی آبادی کے دو اہم عنصروں (ہندو و مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر یہی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اور نسلی، لسانی، صوبائی وعلاقائی تعصبات کی شکل میں ظاہر ہوگی اور جب یہ کام بھی ختم ہو جائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لئے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنا لے گی، اور یہ ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

اس لئے اس جارحانہ احیائیت (AGRESSIVE REVIVALISN) تشدد، ایک ہی فرقہ سے مطالبات اور اس پر تنقید کا سلسلہ، اپنے کو بالکل بدل دینے اور اپنے ملی وتہذیبی ومذہبی تشخصات سے دست بردار ہو جانے کا مسلسل مطالبہ، سینکڑوں اور ہزاروں برس کی سوئی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا اور زندہ کرنا، (۱) جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بری) ہوئیں اور ان کو اس ملک کے حقیقت پسند،

---

(۱) جس کا مظاہرہ کسی شہرت یا کہانیوں اور روایتوں کی بنیاد پر مسجد کو مندر میں تبدیل کرنا اس میں مورتیاں رکھنے کا دہ عمل ہے جس کی سب سے زیادہ انتشار انگیز اور سنگین مثال اجودھیا کا واقعہ ہے، متعدد مسلم وغیر مسلم مؤرخین اور تحقیقی کام کرنے والوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کا کوئی تاریخی وعلمی ثبوت نہیں کہ بابر نے کسی مندر یا رام جنم بھومی کو مسجد میں تبدیل کیا، یہ شروع سے مسجد ہے۔

فراخ دل اور غیرت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا، ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش اس ملک کو ان نئے مسائل و مشکلات سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ ضرورت، اور اس طرح حکومت، انتظامیہ اور دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی، جس کی ملک کو اپنے تعمیری کاموں، سالمیت و استحکام میں ضرورت ہے، اس لئے اس شگاف کو جبکہ وہ معمولی توجہ اور مسالہ سے بند ہوسکتا ہے، اس سے پیشتر بند کردیا جائے، جب وہ ہاتھیوں سے بھی بند نہیں ہوسکے گا، ملک کے اس عمومی و بنیادی مفاد کی خاطر کسی کی ناراضگی یا الیکشن کے نتائج پر اثر پڑنے یا کسی ریاستی و مقامی انتظامیہ کی ناگواری کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ملک ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور اصول و مصالح و فوائد پر مقدم ہے۔

اصول پسندی کی ایک روشن مثال

میں اس اصول پسندی کی ایک مثال پیش کرتا ہوں، جو ملک کے عظیم رہنما اور پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کی۔

۱۹۵۰ء میں جب کانگریس پر بابو پرشوتم داس ٹنڈن جی کی قیادت میں (جو کانگریس کے صدر ہوگئے تھے) فرقہ پرست عنصر غالب آرہا تھا، اور وہ کانگریس کو سیکولرزم اور ہندو مسلم اتحاد کے بجائے جس کی بنیاد گاندھی جی، جواہر لال جی اور مولانا آزاد نے ڈالی تھی، فرقہ پرستی اور ہندو احیائیت HINDU REVIVIOLISM کی طرف پھیرنا چاہتے تھے، اور جمہوریت و اکثریت کے احترام اور اس کی پیروی میں جواہر لال جی سے بھی اس کی توقع کر رہے تھے وہ اپنے عمر بھر کے خیالات اور سوچنے کے طرز کو چھوڑ کر کانگریس میں اپنے کے لئے اس کو اختیار کریں گے، جواہر لال جی نے اس سے انکار کردیا، اس موقعہ پر انہوں نے جو تقریر کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل

کی حیثیت رکھتی ہے، گاندھی نگر ناسک میں ۲۱ ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو انہوں نے فرمایا:

"میں جمہوریت پسند نہیں ہوں، اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہو کہ میں کسی ہجوم کی رائے کے سامنے جھکوں، میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا جس کے غلط ہونے کا مجھے یقین ہو، اور عوام (ہجوم) چاہتے ہوں کہ اس غلط بات کو میں مانوں ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ اگر کانگریس چاہے تو میں کانگریس سے باہر نکل کر انفرادی طریقہ پر اپنے خیالات کے لئے لڑوں۔"

"کچھ لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ مجمع فلاں بات نہیں مانتا اور جمہوریت کی آواز آگے بڑھ رہی ہے، دراصل یہ بزدلوں کی دلیل ہے، اگر جمہوریت کا مطلب ہجوم کے آگے جھکنا ہے تو ایسی جمہوریت کو جہنم واصل ہونا چاہئے اس قسم کی ذہنیت جہاں بھی سر اٹھائے گی میں اس کے خلاف لڑوں گا، ہاں جمہوریت مجھ سے وزارت چھوڑنے کو کہہ سکتی ہے، میں اس کا حکم مانوں گا، اگر کانگریسی یہ چاہتے ہیں کہ وہ آنے والے انتخابات میں چند ووٹ حاصل کرنے کے لئے اپنے اصول و نظریات چھوڑ بیٹھیں تو کانگریس مردہ ہو جائے گی، مجھے ایسی لاش کی ضرورت نہیں ہے"

(قومی آواز لکھنؤ ۲۲ ر ستمبر ۱۹۵۰ء)

تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے، وہ اخلاقی و انتظامی انتشار CORRUPTION ہے، جو اس حد تک پہونچ گیا ہے جس کی نظیر کم سے کم مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی، آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپوٹوں اور ملک کے نظم و نسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھئے، عام شہریوں،

متوسط درجہ کے آدمیوں اور ان لوگوں سے پوچھئے جن کا عدالتوں، دفاتر، ریلوے، ہوائی سروس، پولیس، تھانوں، ٹیلی فون، ہسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے، رشوت کے بغیر ادنیٰ درجہ کا کام نہیں ہوسکتا، پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جاسکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جاسکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں، دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ ہو رہی ہے، طبّی امداد ملنی مشکل ہورہی ہے، مریضوں کے لئے جو انتظامات ہیں وہ بیکار جارہے ہیں، سنگدلی اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے، ریلوے ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کو روزانہ لاکھوں، کروڑوں روپئے کا نقصان ہورہا ہے۔

ان سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، خدا کا خوف دل سے نکل جانا اور انسان سے ہمدردی، ملک سے وفاداری اور اس کے مفاد کو ترجیح دینے اور اس کے نقصان کا خیال رکھنے کا جذبہ ختم ہو جانا ہے، ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر، سیاسی طور پر، خارجی تعلقات کی بنیاد پر ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں، اور آخری شرم و ناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دور غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں، جب انتظامیہ چوکس تھا، ریلیں وقت پر چلتی اور پہونچتی تھیں، ہسپتال اطمینان اور خوشی اور خدمت و راحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت و لیاقت سے پاس ہوتے تھے، تقرریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق کی بنا پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب و خیال ہوگئیں۔

ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں سے شکایت

حضرات! چونکہ آپ کو کسی روایتی سیاسی کانفرنس میں نہیں بلکہ ایک ایسے

بے تکلف مجلس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے، جس میں ہم کو ایک ایسی جماعت کی طرح جو ایک کشتی پر سوار ہے، یا ایک ایسے افراد خاندان کی طرح جو کسی تقریب میں جمع ہیں، ایک دوسرے سے بے تکلف اپنے دل کی بات کہنے اور شکوہ وشکایت کا حق ہے، میں اپنے ملک کے انگریزی، ہندی اور اُردو اخبار نویسوں اور صحافیوں سے کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہے کہ یگانگت اور محبت بڑھانے اس کے بالمقابل دو فرقوں اور خود ایک فرقہ کے افراد میں تلخی وبدگمانی اور نفرت و کراہت پیدا کرنے میں پریس کو جو دخل ہے، وہ کسی دوسرے ادارہ کو نہیں، میں نے ایک مرتبہ اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کی ایک کانفرنس کے نمائندوں کو جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی، خطاب کرتے ہوئے فارسی کا ایک مصرعہ ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ پڑھا تھا، شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے۔ ع

زیر قدمت ہزار جان است

''تمہارے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں''

میں نے صرف ایک حرف بدل کر کہا۔ ع

زیر قلمت ہزار جان است

آپ کے قلم کے نیچے ہزار جانیں ہیں، میں یہی نہیں کہوں گا کہ آہستہ چلیں یا بالکل نہ چلیں، میں کہوں گا کہ احتیاط سے چلیں، میں نے ۱۰/ نومبر ۱۹۸۵ء میں مدراس کی پریس کانفرنس میں جو مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی، کہا تھا کہ میں اخبار کو ایک سچا اور ایمان دار کیمرہ سمجھتا ہوں، جس کا کام یہ ہے کہ وہ تصویر کو (اس سے قطع نظر کہ وہ حسین ہے یا بھدّی) اپنے اصلی رنگ روپ میں پیش کردے، ملک میں پیش آنے والے واقعات، مختلف فرقوں کے جذبات وشکایات

منعقد ہونے والے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کو اپنے صحیح حجم (Bulk) حاضرین کی تعداد کے صحیح اندازہ، اور مقررین وسامعین کے اصلی جذبات وکیفیات کے ساتھ پیش کردے تاکہ حکومت، ملک اور پبلک کو صورت حال کا صحیح اندازہ ہوسکے، اور وہ اپنے انتظامی، اخلاقی فرائض اور ذمہ داریاں محسوس کریں، میں اس حد تک اس کو ضروری سمجھتا ہوں، اگر ہپیز (Hippies) یا (ہم سے آپ سے دور) کوڑھیوں یا متعدی امراض رکھنے والوں کی کوئی کانفرنس ہو، تب بھی ہم کو اس کے حجم سے ساتھ پیش کرنا چاہئے، تاکہ ملک کے اصلاحی، تربیتی ادارے، حفظان صحت کا نظام اور سماجی سدھار کا کام کرنے والے (Social Workers) اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں، اور وقت اور کام کی وسعت وضرورت کے مطابق تیار ہو کر میدان میں آئیں، ملک میں کسی مریضانہ علامت کے ظاہر ہونے یا کسی غلط اور تخریبی رجحان کو پورے طور پر نمایاں نہ کرنے سے ملک ومعاشرہ سخت خطرہ سے دوچار ہوسکتا ہے، اور اقوام وملل کی قدیم تاریخ میں اس کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ایک وسیع ملک، ایک ترقی یافتہ وطاقتور حکومت، ایک مہذب وتعلیم یافتہ معاشرہ، بروقت خطرہ اور غیر صحت مندانہ رجحانات اور کوششوں کو روکنے سے غفلت برتنے کے نتیجہ یں بارہا دائمی زوال کا شکار ہو گیا، اور دنیا کی تاریخ میں داستان پارینہ بن کر رہ گیا ہے، ہمارے معزز وعزیز اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کو اپنے ایڈیٹوریلیز اور اپنے اظہار رائے کے کالموں میں اپنے نقطۂ نظر اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اظہار کا پورا حق ہے اور ان کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا، لیکن واقعات کی رپورٹنگ اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کے جذبات، شکایات، اور مطالبات کے روئیداد پیش کرنے میں ان کو کسی طرح کی رنگ آمیزی اور جانب داری سے کام نہیں لینا چاہئے۔

ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ (مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان

کے جلسے وجلوسوں، احتجاج اور مظاہروں، اور یہاں تک کہ ان کی ملّی تقریبات اور مجلسوں کی صحیح تصویر ہندوستانی پریس میں آنے نہیں پاتی، اور محض اخبارات پڑھ کر کسی کو ان کے احساس کی شدّت، ان کی بے چینی، بے اطمینانی اور ان کی اکثریت کے جائز آئینی مطالبے کا اندازہ نہیں ہوسکتا، یہ نہ صرف اس مخصوص اقلیت اور فرقہ کے لئے مُضر اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے، بلکہ ملک وحکومت دونوں کے لئے نقصان رساں اور ان کے حق میں بدخواہی اور بداندیشی ہے کہ ان کو واقعہ کی سنگینی کا علم نہ ہونے پائے، اور وہ تھوڑی کوشش سے اس کا تدارک وعلاج نہ کرسکیں، جو بڑھ جانے کے بعد بڑی کوشش سے بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا ہے۔

میں آپ کی اجازت سے بطور نمونہ اس سلسلہ میں اپنے چند مشاہدات پیش کرنا چاہتا ہوں، ۲۷،۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں ممبئی میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اور Y.M.C.A. مدن پورہ کے میدان میں ایک پبلک جلسہ ہوا، جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا، اسی دن آنجہانی عبدالحمید صاحب دلوائی کی قیادت میں ایک مظاہرہ ہوا، جس میں چند درجن سے زیادہ آدمی نہیں تھے، مسلمانوں نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، پولیس نے مظاہرین کو اپنے گھیرے میں لے لیا، ورنہ ان کو سخت حالات سے دوچار ہونا پڑتا، میں نے خود اگلے روز ممبئی کے انگریزی اخبارات پڑھے، اس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلہ کے جلسہ کا بہت معمولی طور پر تذکرہ تھا، لیکن دلوائی صاحب کے مظاہرہ کو بہت نمایاں طریقہ پر دکھایا گیا تھا، جس سے ناواقف آدمی سمجھتا کہ اس میں ہزاروں آدمی شریک تھے، مسلمانوں کی نمائندگی یہی جلوس کرتا تھا، اس عدم توازن اور حقائق کو نمایاں نہ کرنے کا جو اثر انتظامیہ، ملک کے دانشور طبقہ اور برادران وطن پر ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

دوسری مثال قریبی زمانہ کی ہے، ۶؍۷؍اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہوا، ۷؍اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں شام کو پبلک جلسہ ہوا جس میں اچھے تجربہ کاروں کا اندازہ ہے کہ پانچ لاکھ آدمی شریک تھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، انسانوں کا جنگل نظر آتا تھا، میں بورڈ کا صدر ہوں اور اس جلسہ میں بطور خود موجود تھا، اور تقریر بھی کی، اگلے دن میں آسنسول کے لئے روانہ ہورہا تھا، میں نے ہوڑہ اسٹیشن پر جتنے انگریزی اخبارات مل سکے حاصل کئے، جو اخبارات مجھے ملے ان میں کہیں اس جلسہ کا تذکرہ نہ تھا، ایک انگریزی اخبار میں ان الفاظ میں خبر دی گئی تھی:۔ (Hundreds of Muslims Attended) اب آپ ہی فرمائیے، نہ صرف باہر کے لوگوں کو بلکہ کولکاتہ کے ان باشندوں کو بھی جن کو اس جلسہ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، صحیح صورتِ حال اور اپنے اہم وطن بھائیوں کے جذبات کی شدت کا اندازہ کیسے ہوسکتا ہے، اور خود حکومت کی مشینری، عدلیہ، اور انتظامیہ اور ملک کا حقیقت پسند طبقہ اس کا مداوا کیسے کرسکتا ہے؟ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ سیکڑوں مثالوں میں سے یہ دو مثالیں ہیں جو میں نے پیش کیں۔

موجودہ مسئلہ مسلم پرسنل لا بل کے سلسلہ میں بھی یہی تلخ تجربہ ہوا کہ ہمارے انگریزی و ہندی اخبارات نے (بہت خفیف استثناء کے ساتھ) خبریں دینے، تبصرہ کرنے، تردیدی و مخالفانہ مضامین و مراسلات شائع کرنے میں میونسپلٹی اور کارپوریشن کے شہری قانون (One way traffic) کا مظاہرہ کیا ڈھونڈنے پر بھی مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے زیر بحث بل کے حامیوں یا اس کی وضاحت کرنے والوں کا کوئی مضمون یا مراسلہ دیکھنے میں نہ آیا، اس طرح یہ اخبارات ورسائل (مجھے معاف کیا جائے) ایک ہی نقطۂ نظر کے ترجمان اور پرجوش حامی تھے، جو اکثریتی فرقہ کی اکثریت اور مسلم فرقہ کے انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد کا نقطۂ

نظر اور طرز فکر تھا، اور اس سے ملک و بیرون ملک کا کوئی اخبار میں (جس کی معلومات وخیالات کا انحصار اخبارات کے مطالعہ پر ہو) اس بے چینی، جوش وخروش اور بے نظیر وحدت، فکر وخیال کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، جو ہندوستان کے دس یا پندرہ کرور مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اور جس سے واقف ہونا ہر حقیقت پسند، جمہوریت اور آزادی رائے کا احترام کرنے والے محب وطن اور ذمہ دار انسان کا فرض ہے۔

آخر میں دہلی ہی کے (جہاں ہم جمع ہیں) نامور اردو شاعر مرزا غالبؔ کا ایک شعر پڑھتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

مسلمانوں کا دس انعام برادرانِ وطن کے نام

مشہور ہندوستانی مؤرخ سر جادو ناتھ سرکار نے (Jadu Nath Sarkar) جن کی متعدد تصانیف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں اپنے ایک مضمون میں جو کلکتہ کے مشہور انگریزی رسالہ ''پرابدھا بھارت'' (بیدار ہند) میں شائع ہوا تھا، مسلمانوں کے ان دس عطیات کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے ہندوستان کو بخشے ہیں، ان دس چیزوں میں متعدد چیزیں ہم اس مقالے میں پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں، باقی چیزیں یہ ہیں۔

۱۔ ہندوستان کا رابطہ خارجی دنیا سے۔

۲۔ سیاسی اتحاد اور لباس وتمدن کی یکسانی خصوصاً اونچے طبقوں میں۔

۳۔ ایک مشترک سرکاری زبان اور نثر نگاری کا سادہ اسلوب جس کی ترقی وتہذیب میں ہندو مسلم دونوں نے حصہ لیا۔

۴۔ مرکزی حکومت کے تحت علاقائی زبانوں کی ترقی تا کہ امن وخوشحالی عام ہو اور ادبی وثقافتی ترقی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

۵۔ سمندری راستوں سے بین مملکتی تجارت کی تجدید جو پہلے جنوبی ہند کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی، اور عرصہ دراز سے معطل پڑی ہوئی تھی۔

۶۔ ہندوستان کے بحری بیڑہ کی تشکیل۔

تحفظ شریعت کیلئے مسلمانوں کا اتحاد ان کی

بیداری کا پیش خیمہ

سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں کی بے صبری اور بے اعتمادی

(مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر سے ایک انٹرویو)

۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء

’’مجھے سب سے بڑا خطرہ (جواب خطرہ نہیں رہا بلکہ مشاہدہ بنتا جا رہا ہے) مسلمانوں کی ان دو کمزوریوں یا بیماریوں سے ہے، جو دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حد تک ملی مزاج بنتا جارہا ہے، ایک عجلت و بے صبری، وہ یہ کہ مسئلہ کتنا ہی طویل المیعاد، صبر آزما اور پیچیدہ ہو، یہاں کے مسلمان ہتھیلی پر سرسوں اگانے کے قائل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جو مہم صبح شروع ہوئی ہے، وہ سورج غروب ہونے سے پہلے کامیاب ہونی چاہئے اور بیل منڈھے چڑھ جانی چاہئے، مسائل کو کامیابی سے حل کرنے میں ایک بڑا فیکٹر (Factor) صبر وتحمل، قوت برداشت اور بلند حوصلگی ہے، مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں، تمام زندہ و فاتح قوموں کی تاریخ (خود سیرت نبوی جس سے بڑھ کر ہمارے لئے کوئی اسوہ ونمونہ نہیں) تلخ و شیریں، سرد وگرم، نشیب و فراز کے مناظر کا مجموعہ اور ایک طویل، صبر آزما، زہرہ گداز جد وجہد کی روداد ہے، تحریکات اور مہمات کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برخلاف معرکہ کو چٹکیوں میں فتح کر لینے کا قائل ہے۔‘‘

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش خیمہ (۱)

سوال:- آپ نے اپنے سیاسی خیالات، علمی و دینی مشاغل کی سرگذشت اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق بعض ایسے اہم انٹرویو دیئے ہیں، جو اس ملک

(۱) تحفظ شریعت کا مسئلہ اس وقت ہندستانی مسلمانوں کا اہم ترین مسئلہ ہے، سیاسی و معاشی پس ماندگی، سرکاری ملازمتوں سے محرومی، فرقہ وارانہ فسادات، تعلیم میں مشرکانہ عقائد کے بعد اب نکاح طلاق جیسے خالص خانگی امور میں بھی اسلامی شریعت پر عمل کو ختم کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں مسلم پرسنل لا پر ہر طرف سے ہونے والے جارحانہ حملوں نے مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو مجروح کر رکھا ہے، حکومت کے مبہم و مشکوک رویہ نے اس ملک میں اسلام کے مستقبل کو مخدوش بنادیا ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ مسلمان بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر حالات کو مزید خراب کرنے پر تلے نظر آرہے ہیں، اور کچھ لوگ مسلسل نیش زنی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں، ان حالات نے ذہن کو اس طرف متوجہ کیا کہ حالات کی نزاکت، مسئلہ کی اہمیت اور وقت کی اہم ترین ضرورت کے بارہ میں تحفظ شریعت مہم کے سربراہ کے افکار و خیالات سے براہ راست روشنی حاصل کی جائے، اسی خیال سے ادارہ صحافت اسلامیہ کی جانب سے جناب نذر الحفیظ صاحب ندوی کچھ سوالات لے کر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمت میں حاضر ہوئے، سوالات کے جوابات تفصیل سے دیئے جنھیں انھیں کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں ملّی اور دعوتی جدوجہد کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر قلم اٹھانے والا کوئی مؤرخ ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا، مثال کے طور پر فروری ۱۹۷۱ء میں ''ندائے ملّت'' کے لئے آپ نے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، اس کے بعد تحریک ''پیام انسانیت'' کے متعلق تفصیلی انٹرویو دیئے جن سے بہت سے حقائق آشکارا ہوئے، اب ہم پھر آنجناب کو ایک ایسے مسئلہ پر بعض وضاحتوں کی زحمت دینا چاہتے ہیں، جس نے کچھ عرصہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، ہماری مراد مسلم پرسنل لا سے ہے، لیکن مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض اہم مسائل پر گفتگو سے قبل ہم اس بورڈ کی صدارت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ آپ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت اپنے مخصوص مزاج اور غیر معمولی علمی ودعوتی مصروفیات، نیز سابقہ روایات کے خلاف کیوں قبول کی جب کہ اس سے پہلے (جہاں تک ہمیں یاد ہے) مسلم مجلس مشاورت کی صدارت آپ نے ڈاکٹر سید محمود صاحب جیسی محترم شخصیت کے اصرار پر بھی قبول نہیں فرمائی، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟

جواب:۔ آپ نے ایک اچھی تمہید کے بعد جس نے مجھے واقعات کی بعض بھولی ہوئی کڑیاں یاد دلا دیں اور ایک مناسب انداز کے ساتھ مجھ سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا ہے، واقعہ ہے کہ میری اُفتادِ طبع، خاندانی روایات اور مشاغل کی نوعیت سے جو لوگ واقف ہیں، ان کو اس بارے میں ضرور ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے۔

جن لوگوں کو میرے مضامین ورسائل اور کم سے کم سرگذشتِ حیات ''کاروان زندگی'' پڑھنے کا موقع ملا ہے، وہ جانتے ہیں کہ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اجتماعی اور تنظیمی کاموں میں سے دو کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس کی ہے، اور یہ

ملت اسلامیہ کی روح، مزاج، اس کے مقاصد و پیغام سے کسی حد تک واقفیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

(۱) ایک ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت اوران کے معنوی اور روحانی تسلسل کو برقرار رکھنے اور نہ صرف ذہنی اورتہذیبی بلکہ (خاکم بدہن) اعتقادی ارتداد سے بچانے کے لئے مسلمان بچوں کی تعلیم کا انتظام اوران کی طرف اسلامی ورثہ کی منتقلی اوران کواس کا حامل ومحافظ بنانے کی جدوجہد۔

(۲) دوسرے اس ملت کو ہندوستان جیسے ملک میں (جو مذاہب، تہذیبوں اورقومیتوں کا گہوارہ ہے) اپنے ملی تشخص کے ساتھ اور ایک ایسی صاحبِ شریعت ملت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی جدوجہد، جس کا رشتہ آسمانی تعلیمات اور الٰہی قانون کے ساتھ اُستوار ہے، اور جس کے یہاں دین کا مفہوم عقائد وعبادات کے دائرہ میں محدود نہیں، پوری زندگی پر حاوی ہے، اور جو اپنا مستقل عائلی (خاندانی) نظام وقانون رکھتی ہے، جواس کے دین کا جزء اور کتاب وسنت کے صریح احکام وہدایات پر مبنی ہے، اور ایک مسلمان کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اس احساس وشعور اور فکر ومطالعہ کا نتیجہ ہے کہ جب ۱۹۵۹ء کی آخری اور ۱۹۶۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت پر بستی میں صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی اور اجلاس کی صدارت کا قرعۂ فال میرے نام نکلا تو میں نے بلا تکلف اس کو قبول کیا، پھر جب اس کی مستقل صدارت کے لئے میرا انتخاب ہوا، تو میں نے ادائے فرض کے اس احساس سے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اور ابھی تک ایک سعادت وعبادت سمجھ کر اور کم سے کم ہندوستان میں اس کو ایک اہم خدمت باور کر کے اس ذمہ داری کو نباہ رہا ہوں۔

یہی حال مسلم پرسنل لا بورڈ کے مسئلہ کا ہے، ملک کی آزادی کے بعد ہندوستانی

مسلمانوں کے لئے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، وہ حکومت کا یہ رجحان اور پھر مسلمانوں کے ایک تجدّد پسند اور آزاد خیال گروہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) ہو کہ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہوسکتی، یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعہ کی شکل میں سامنے آنے لگا، خود حکومت کے بعض محتاط لیکن معنی خیز بیانات وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہنچاتے تھے، خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا تھا جو ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی اور معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور "ومن لم یحکم بما انزل الله فأولئك هم الكافرون" (اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا فتنہ تھا۔

اس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہوا، واقعہ یہ ہے کہ ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ پیش پیش تھے، انھوں نے بروقت رہنمائی کی اور اس کے خلاف ایک منظم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، طے ہوا کہ ۲۷/۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن بلایا جائے، میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی اس سال رابطۂ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لئے (جو ماہ ذیقعدہ میں ہوا کرتا تھا) حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرۃً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، لیکن مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم لوگوں نے ایسے وقت ہندوستان آنے کا فیصلہ کیا جب حج میں صرف پندرہ بیس دن باقی تھے، اور بمبئی کنونشن میں شرکت کی، یہاں اس ادارہ کے قیام کی تاریخ اور تفصیلات کا بیان کرنا مقصود نہیں، صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی جیسی اس کنونشن کے موقع پر نظر آئی، دوسرے یہ کہ اس اجلاس کے نتیجہ میں ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔

قاری صاحب مرحوم (جن کو اللہ تعالیٰ نے ایک دلآویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی) کی صدارت کی موزونیت پر تقریباً سب کا اتفاق تھا، رانچی کا سالانہ اجلاس ۱۹۷۷ء کے موقع پر صدارت میں تبدیلی کا مسئلہ زور شور سے اٹھا، بعض حلقوں کی طرف سے میرا نام پیش کیا گیا، لیکن میرے یہ کہنے پر سب خاموش ہو گئے کہ "طوفان میں کشتی نہیں بدلی جاتی" میرے لئے اس کا ایک بڑا محرک یہ بات بھی تھی کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسا باوقار اور ہر دلعزیز صدر ملنا مشکل ہے، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے مشترک ادارہ کی صدارت کے لئے وہی موزوں ہیں، لیکن ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے دارِ فانی سے رحلت کی اور ان کی جگہ خالی ہوگئی، اس سال ۲۸-۲۹؍دسمبر ۱۹۸۳ء میں مدراس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ اجلاس کا ہونا طے پایا، میں اپنے بعض بیرونی پروگراموں اور خرابیٔ صحت کی بنا پر اس سے پہلے کے عاملہ کے بعض اجلاسوں میں شرکت نہیں کر سکا تھا، اس اجلاس میں شرکت کا عزم مصمم تھا، اور سفر کے سب انتظامات کر لئے گئے تھے کہ عین موقع پر مجھ پر نقرس (Gout) کی بیماری (جس کا میں پرانا مریض ہوں) کا شدید حملہ ہوا اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں ایسی شدید تکلیف میں مبتلا ہوا کہ چارپائی سے اترنا مشکل تھا، مجبوراً سفر کے التواء کا فیصلہ کرنا پڑا، اجلاس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام صدر کی جگہ کے لئے پیش کیا گیا، جو لوگ

میری طبیعت سے واقف ہیں، انہوں نے یہ کہا کہ وہ صرف اس صورت میں منظور کر سکتے ہیں کہ متفقہ طور پر ان کا انتخاب عمل میں آئے، مجھے معلوم ہوا کہ بغیر کسی اختلاف کے میرا نام منظور ہوا، جب مجھے اس کی اطلاع ہوئی تو ''سنگ آمد وسخت آمد'' کا مضمون تھا یہ فیصلہ میری اُفتادِ طبع، صحت جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں اور مشغولیتوں سے میل نہیں رکھتا تھا، اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعث افتخار واعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کر دیتا، لیکن ایک تو مسئلہ کی نوعیت واہمیت کی وجہ سے جس کو میں اپنے عقیدہ کا جزء اور مسلمانوں کی ملّی زندگی کے لئے شہ رگ کا درجہ دیتا ہوں، دوسرے مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کے احترام کی بنا پر جن کا بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ لحاظ کرتا رہا ہوں، چاروناچار قبول کرنا پڑا، دوستوں کی اس بات کو بھی اس میں دخل تھا کہ اس وقت بورڈ کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے، چنانچہ فارسی کے اس پرانے شعر پر عمل کرنا ہی پڑا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے جو شاید اس سے پہلے پیش نہیں آئے اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم وعزم، ملت کے نظم وضبط، علمائے دین وماہرین قانون کے علم ومطالعہ، ذہانت و تدبّر اور عوام کے انقیاد واطاعت، صبر وتحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض وتسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، میرا اشارہ خاص طور پر نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کے اس ہنگامے خیز فیصلہ

کی طرف ہے، جو ۲۳/ اپریل ۱۹۸۵ء میں دیا گیا، اور جس نے ملّت کو اپنے دین و شریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور غیرت و خودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلے پر لا کھڑا کیا، تدبیر الٰہی کی کارفرمائی تھی (جس کی حکمتوں کو کوئی نہیں جانتا) کہ یہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ (جو اگر کامیابی کے ساتھ گذار لیا گیا اور ملّت نے اس میں فتح حاصل کرلی تو عرصۂ دراز تک کے لئے انشاء اللہ مسلمانوں کا عائلی قانون عدالتوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائے گا) مجھ ناتواں کے دورِ صدارت میں پیش آیا، جو سخت جسمانی جدّ وجہد، قوتِ برداشت اور فرصت و فراغت کا طالب ہے، شاید یہ بات غیرت الٰہی اور رحمتِ الٰہی دونوں کو حرکت میں لانے کا باعث بن جائے جن کے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے قائدین اور اولوالعزم مصلحین بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" (نصرت تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے)۔

سوال:۔ کیا آپ مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے بورڈ کی اب تک کی کارگزاری پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب:۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس اس سال اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں ہوا تھا، بورڈ کے اس جلسہ میں اس کی سابقہ روایات کے مطابق مسلمانوں کے مختلف حلقوں کی نمائندگی تھی، اور تقریباً تمام مسلم جماعتیں اور تنظیمیں اور مکاتب فکر اور مذہبی فرقے شامل تھے، میرا خطبہ زبانی تھا جو اردو اور انگریزی میں چھپ گیا ہے، اور جس میں مسئلہ کی اہمیت اور نوعیت پر اصولی اور علمی اور حقیقت پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، آخری اجلاس شہید مینار چوک میں ہوا، جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ۵ لاکھ انسان تھے، میں نے ضرورت سمجھی کہ اس میں خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کیا جائے اور خود ان کا دینی اور عملی احتساب کیا جائے کہ وہ خود

قانون خداوندی پر کتنا عمل کرتے ہیں، انھوں نے اس کے بارے میں جو رویہ اختیار کررکھا ہے، اس کا غیبی اور اخلاقی اثر کیا پڑ رہا ہے، یہ خطبہ بھی چھپ گیا ہے۔

اس کے بعد دہلی میں عاملہ کے دو اجلاس ہوئے، پہلا اجلاس ۱۴ر مئی اور دوسرا اجلاس ۱۰ر جولائی کو دہلی میں ہوا جس میں وزیر اعظم راجیو جی سے بورڈ کے ایک نمائندہ وفد کا ملنا طے ہوا............................ ۳۰ر جولائی ۱۹۸۵ء کو وفد نے وزیر اعظم کو یادداشت پیش کی اور اس کے بعد ایک مفصل نوٹ جو بہت غور و فکر اور مشورہ اور تبادلۂ خیال کے بعد مرتب ہوا تھا، پیش کیا گیا، جس میں ان کے لئے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پورا مواد اور ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں، اور یہ کہ اب ان کے لئے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے کون سا دستور اور عملی آسان راستہ ہوسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا اور کہتا چلوں کہ میں نے بحیثیت صدر کے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ راجیو جی میری عمر اب ۷۲-۷۳ سال کی ہورہی ہے، میں نے آپ کے نانا موتی لال جی کو بھی دیکھا ہے، اور ان کی تقریر امین آباد پارک لکھنؤ میں سنی ہے، اور جواہر لال اور اندرا جی کو تو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کا اچھا زمانہ پایا ہے، لکھنؤ میں رہنے اور خاص طرح کے خاندانی اور تعلیمی ماحول کی وجہ سے تحریک خلافت اور تحریک آزادی سے لے کر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی، جس کا میں نے قریب سے مطالعہ نہ کیا ہو، اور اس کے اثرات نہ دیکھے ہوں، میں اپنی اس طویل واقفیت کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی مسئلہ پر کم سے کم مسلمانوں کے ہر مکتب خیال سیاسی جماعتوں، پارٹیوں اور تنظیموں اور افراد کا ایسا مکمل اتحاد و اتفاق دیکھنے میں نہیں آیا، جیسا کہ مسلم پرسنل لا کے تحفظ پر عمومیت کے ساتھ اور سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے خلاف خصوصیت کے ساتھ دیکھنے میں آرہا ہے، راجیو جی نے یہ باتیں غور سے سنیں،

اوران پر کوئی جرح نہیں کی، پھر دوسرے معزز ارکان وفد نے (جن میں جناب غلام محمود بنات والا، سید شہاب الدین اور الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ زیادہ نمایاں تھے) مسئلہ پر روشنی ڈالی اور پر مغز طریقہ پر اس کی وکالت کی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے جب رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کو یوم تحفظ شریعت منانے کا فیصلہ کیا تو پورے ملک میں بڑے وقار واحترام اور کسی نعرہ بازی اور ہنگامے کے بغیر یہ دن منایا گیا، مساجد میں تقریریں کی گئیں، اور وزیر اعظم اور وزیر قانون کو احتجاجی ٹیلی گرام اس کثرت سے روانہ کیے گئے کہ اس سے پہلے شاید ایسا ہوا ہو، اسی طرح جب تحفظ شریعت کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا گیا تو مسلمانوں کے مختلف مسلک رکھنے والی جماعتوں اور مکاتب فکر نے تحفظ شریعت کا ہفتہ منانے میں کسی جماعتی عصبیت کا مظاہرہ نہیں کیا، انہوں نے اس موقع پر مکمل ہم آہنگی، اتحاد، جذبۂ تعاون اور ملی غیرت وحمیت کا ایسا ثبوت دیا ہے اور دے رہے ہیں، جس کی تمنا عرصہ سے تھی، اور اگر یہ کہوں تو بے جا بات نہ ہوگی کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ نے مسلمانوں کے اندر اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کا ایسا کام کیا جو شاید بڑی جدوجہد کے بعد بھی اس طرح انجام نہ پایا ہوتا، تحفظ شریعت کا ہفتہ بہار واڑیسہ اور یوپی میں منایا جا چکا ہے، دوسری ریاستوں میں باقی ہے[1] ہر جگہ جلسے غیر معمولی طور پر کامیاب رہے، اور سالہا سال کے بعد مسلمانوں میں وہ جوش وخروش جلسوں میں حاضرین کی تعداد اور کام کرنے والوں میں ہم آہنگی دیکھنے میں آئی جس کا مشاہدہ برسوں سے نہیں ہوا، کانپور کے جلسہ میں لوگوں کا اندازہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک کے درمیان تھا، مراد آباد میں بھی ہزاروں کی تعداد تھی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ اپنے مخصوص موضوع ومقصد (تحفظ شریعت) اور مشترک عائلی قانون کی مخالفت کے علاوہ مسلمانوں میں عام بیداری کا سبب بن

جائے گا اور ان کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کسی مسئلہ پر متفق ہو کر اپنی زندگی کا ثبوت دے کر کتنے بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں اور کتنے بڑے خطرات سے اپنے کو بچا سکتے ہیں۔

سوال:- مسئلہ کے اس روشن پہلو اور افادیت کے ساتھ جو ہر مسلمان بلکہ ہر محبّ وطن کے لئے تسلی بخش ہے، آپ کو اس سلسلہ میں سب سے بڑا خطرہ کیا محسوس ہوتا ہے، آپ نے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ امت اسلامیہ کی علمی، فکری، اصلاحی اور تجدیدی تاریخ لکھی ہے، اور آپ نے عالم اسلام کا رباط و مراکش سے لے کر سری لنکا و بنگلہ دیش تک کا سفر کیا ہے، اور ان ملکوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ اور خطرات سے ہوشیار کیا ہے، ہم آپ سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس سفر میں (جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے) سب سے زیادہ دشوار گزار گھاٹی کون سی ہے، جس سے آپ سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہوں۔

جواب:- آپ نے یہ سوال کر کے میرے دل و دماغ کے داغ کہن تازہ کر دئے اور "ناگفتنی" کو "گفتنی" بنا دیا، مجھے یہ ناخوشگوار فرض انجام دینا ہی پڑے گا، بقول اقبال۔

چمن میں تلخ نوائی میری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

مجھے سب سے بڑا خطرہ (جواب خطرہ نہیں رہا بلکہ مشاہدہ بنتا جا رہا ہے) مسلمانوں کی ان دو کمزوریوں یا بیماریوں سے ہے، جو دل پر پتھر رکھ کر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حد تک ملی مزاج بنتا جا رہا ہے، ایک عجلت و بے صبری، وہ یہ کہ مسئلہ کتنا ہی طویل المیعاد، صبر آزما اور پیچیدہ ہو، یہاں کے مسلمان ہتھیلی پر سرسوں اگانے کے قائل ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جو مہم صبح شروع ہوئی ہے، وہ سورج غروب ہونے سے

پہلے کامیاب ہونی چاہئے اور بیل منڈھے چڑھ جانی چاہئے، مسائل کو کامیابی سے حل کرنے میں ایک بڑا فیکٹر (Factor) صبر وتحمل، قوت برداشت اور بلند حوصلگی ہے، مسلمانوں ہی کی تاریخ نہیں، تمام زندہ و فاتح قوموں کی تاریخ (خود سیرت نبوی جس سے بڑھ کر ہمارے لئے کوئی اسوہ ونمونہ نہیں) تلخ وشیریں، سرد وگرم، نشیب و فراز کے مناظر کا مجموعہ اور ایک طویل، صبر آزما، زہرہ گداز جدوجہد کی روداد ہے، تحریکات اور مہمات کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے، لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا مزاج اس کے برخلاف معرکہ کو چٹکیوں میں فتح کر لینے کا قائل ہے۔

ابھی ستمبر کے دوسرے ہفتہ میں بھی ممبئی میں تھا، وہاں مہاراشٹرا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایکشن کمیٹی کا جلسہ تھا، مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا، سنجیدہ اور تعمیری انداز میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، اور ہفتۂ تحفظ شریعت منانے کے لئے ضروری اقدامات پر غور کیا جا رہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک مضمون پڑھنا شروع کیا کہ زندہ قوموں اور ملکوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی جماعت کسی مسئلہ کے حل کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتی ہے اور دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے، اتنی طویل مدت ہوگئی اور مسلم پرسنل لا بورڈ مسئلہ کو حل نہیں کر سکا، اس لئے اس کو اب اپنی ناکامی کا اقرار کر لینا چاہئے، اور دوسروں کو کام کا موقع دینا چاہئے، یہ سن کر اپنی افتاد مزاج کے برخلاف میرے اندر سخت تأثر پیدا ہوا، اور میں نے کہا کہ یہ ایک مریضانہ ذہنیت کی علامت ہے، آپ نے برادرانِ وطن کے کردار کا بھی مطالعہ کیا ہے؟ انہوں نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں، نیز اپنے تعمیری منصوبوں کی تکمیل میں کتنے صبر وتحمل سے کام لیا، اور اپنے رہنماؤں کو کام کرنے کا کتنا طویل موقع دیا، گاندھی جی ہوں یا مالوی جی یا دوسرے ہندو سیاسی لیڈر اور قومی معمار، انہوں نے کتنے سکون واطمینان قلب کے ساتھ کام

کیا، دو ہی دن بعد قوم نے ان کا دامن جھٹکنا اور گریبان پکڑنا نہیں شروع کیا، مسلمانوں کو تو صبر وتحمل کا زیادہ عادی ہونا چاہئے کہ ان کا صحیفہ اور ان کے نبی کا اسوہ اور خدا کی قدرتِ کاملہ پر یقین ان کو زیادہ وسیع القلب اور وسیع النظر بنا دیتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔

مسلمانوں کی دوسری کمزوری جواب ایک نیشنل کیرکٹر کا رنگ اختیار کر گئی ہے، وہ ان کی اپنے قائدین کے بارے میں بے اعتمادی، بدگمانی، شدید احتساب، بے ضرورت تنقید اور کردار کشی ہے پھر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ برادرانِ وطن کا اپنے سیاسی تعلیمی تعمیری رہنماؤں اور سماجی کام کرنے والوں کے بارے میں رویہ بالکل مختلف ہے، اپنے رہنماؤں سے بلند اخلاقی معیار، ہر شک وشبہ سے بالا تر دیانت کی توقع، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تصورات کے عین مطابق ہے، لیکن اس میں اس حد تک افراط وغلو کہ ہر کام بدگمانی سے شروع کیا جائے اور ہر قائد وخادم ملت بے اعتمادی اور بے توقیری کی نظر سے دیکھا جائے اور اس پر بڑے سے بڑا الزام لگانے میں پس وپیش نہ کیا جائے اس کے بارے میں بعید از قیاس سے بعید از قیاس بات کو فوراً باور کر لیا جائے، افواہ پھیلانے اور ان کو مان لینے میں ذرا بھی احتیاط وتأمل سے کام نہ لیا جائے، ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو پورے شیرازۂ ملت کو درہم برہم کرنے کے لئے کافی ہے، اور اور بڑے سے بڑے شیر دل، کوہ وقار اور پاک باز وپارسا خادم دین اور بڑے بڑے طوفانوں میں کشتیٔ ملت کے سر پھرے ملاّح کا دل توڑ دینے اور اس کی ہمت پست کر دینے کے لئے کافی ہے، وہ دشمنوں کی اذیتوں، قید وبند کی سزاؤں، بچوں اور افرادِ خاندان کے فاقے کو برداشت کر سکتا ہے، اور اس کی پیشانی پر شکن نہیں آسکتی ہے، لیکن اتّہام اور الزام، کردار کشی اور ملت کا غدّار بنائے جانے سے اس کا دل چور چور ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ

جاتے ہیں، کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک بڑھیا کو حضرت عمرؓ کے ٹوکنے، ایک اعرابی کو سوال پوچھ لینے کی روایات کو ہمارے قومی جلسوں اور مجالس وعظ میں ایسے مبالغہ اور بے اعتدالی سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص نے اس کی تقلید شروع کردی ہے، چاہے امیر المؤمنین فاروق اعظم کے مقام کا آدمی نہ ہو لیکن پوری قوم بڑھیا اور اعرابی کا کردار ادا کرنا چاہتی ہے، اکثریتی فرقے کا اپنے رہنماؤں اور کارکنوں کے بارے میں رویہ واضح طور پر اس کے برعکس ہے، اپنی دوسری کمزرویوں کے باوجود وہ نمایاں طور پر اس سلسلہ میں محتاط، فراخ دل اور وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔

سوال: مسلمانوں میں سے بعض ''معروف'' اشخاص نے ''تجاہل عارفانہ'' سے کام لیا ہے، اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے اس جزء کی حمایت کی ہے کہ مطلقہ کو سابق شوہر کی طرف سے جب تک وہ دوسری شادی نہ کرلے، حین حیات گذارا دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے، اور اس کا اگر حق شریعت میں نہیں ہے، تب بھی اس کو مان لیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے، کہ قانونِ شریعت کوئی چھوئی موئی نہیں ہے کہ ایسی چیزوں سے ٹوٹ جائے، اور اگر اس میں تھوڑی سی ترمیم بھی ہو جاتی ہے تو بھی کوئی بڑی مصیبت نہیں۔ آتی، یہ ائمہ کے اجتہادات ہیں جو وہ ہر زمانہ میں کرتے آئے ہیں، اور ائمہ کو بُت نہیں بنانا چاہئے، نیز انھوں نے قرآن مجید میں ''متاع'' کے لفظ کی تشریح میں اور مطلقہٗ بائنہ کو عدّت کے بعد بھی گذارا دینے کو قرآنی سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے، ان کے بارے میں ہمارے علمائے دین اور خاص طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مقتدر اراکین جو ہندوستان کے عظیم ترین مذہبی اور تعلیمی اداروں کے سربراہ وذمہ دار ہیں، فتویٰ کی زبان کیوں نہیں استعمال کرتے اور ان پر فقہی حکم لگا کر مسلم معاشرہ سے خارج کیوں نہیں کرتے تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی جرأت سے کام نہ لیں؟

جواب:- آپ نے ایک معقول بات پوچھی ہے، بورڈ کے دوسرے اہل علم ارکان اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہیں، لیکن میرا ذاتی رجحان اور مشورہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اور ہمارے مذہبی اداروں کو اس عہد اور ملک میں مسیحی یورپ کے قرون وسطی (جن کو قرون مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی طرح اعتقادات کی تحقیق کی عدالتوں (Courts of Enquisation) جن کو عربی کتابوں میں ''محاکم التفتیش'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کا کردار ادا کرنا مناسب نہیں جو اپنے نزدیک بداعتقاد عیسائیوں کو دائرۂ اعتقاد سے سے خارج کیا کرتی تھیں، اور ان کو لرزہ خیز سزائیں دیتی تھیں، جس کی وجہ سے یورپ میں ایک طبقہ کلیسا سے بیزار اور عیسائیت سے متنفر ہو گیا، میرے خیال میں اس کے مقابلہ میں ہمیں مسلم معاشرہ میں وہ دینی شعور پیدا کرنا چاہئے جو خود ان تجدّد پسندوں یا برخود غلط فقیہوں اور مفسّروں کا محاسبہ کرے اور ان کو محسوس کرائے کہ انہوں نے اپنے کو مسلم معاشرہ سے خود کاٹ لیا ہے، اور فتنہ کا ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا ہے، معاشرہ کا یہ طرز عمل ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے اور (اگر اُن میں ذرا بھی ملی غیرت ہے تو) اپنی روش اور طرز عمل کی غلطی محسوس کرا دینے کے لئے کافی ہے، وہ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس معاشرہ میں ایک فردِ معاشرہ کی طرح رہنا اچھا ہوگا، جس کے ساتھ مرنا اور جینا ہے، اور جو دکھ سکھ میں کام آتا ہے، یا اس عارضی عزّت تعریف کا خیال کرنا جو ڈھلتی چھاؤں اور بے وفا ساتھی ہے۔

سوال:- ایک آخری سوال کی اور اجازت چاہتا ہوں جو اپنی اہمیت و افادیت میں پچھلے سوال سے کم نہیں، اور میرے خیال میں بہت سے حسّاس اور حقیقت پسند مسلمانوں اور دانشور طبقہ کے ذہن میں یہ سوال گشت کرتا ہے۔

جواب:- وہ سوال بھی ضرور کر لیجئے تا کہ مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

سوال :- آپ کے نزدیک اس مسئلہ اور اس اہم دینی وملّی مہم کے سلسلہ میں اب کرنے کے کیا کام ہیں، اور آئندہ کا نظام عمل کیا ہوگا؟

جواب :- آپ نے بہت ضروری اور برمحل سوال کیا ہے، اس انٹرویو میں بہت کمی رہ جاتی اگر یہ گوشہ سامنے نہ آتا، میرے نزدیک اوّلین اور اہم کام خود مسلمانوں میں شرعی، عائلی قانون پر عمل کرنے کی دعوت وتبلیغ ہے، جس کے اہم اور مرکزی اجزاء حقوق الزوجین، اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی کے مطابق ازدواجی زندگی گزارنا، شفقت ومحبت اور قرآنی الفاظ میں "وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً" کے اصول پر ایسی ازدواجی وعائلی زندگی گذارنا جس میں محبت ومودّت اور رحمت کا عنصر غالب ہو، صلہ رحمی، ترکہ کی شرعی تقسیم، طلاق کے حق کا نہ صرف شرعی بلکہ مسنون طریقہ پر استعمال ہو، اور "وَاتقُو اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَام" (اور اللہ سے تقوی اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو) کی اس ہدایت قرآنی پر عمل جو تمام انسانی، اسلامی و اخلاقی پہلوؤں اور گوشوں پر حاوی ہے، اس کے لئے ایک طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، جس کے اثر سے شہر تو شہر کوئی قصبہ اور گاؤں اور اور مسلمانوں کا کوئی محلّہ اور خاندان بھی بے خبر اور بے اثر نہ رہے، اس کے لئے مساجد کے منبر ومحراب، مجالس وعظ، اسلامی اجتماعات وتقریبات، اخبارات ورسائل اور ابلاغ عامّہ کے تمام ذرائع پوری سرگرمی سے استعمال ہونے چاہئیں، میرے نزدیک یہ بنیادی کام ہے اور ان میں ان مشکلات اور خرابیوں کا اصل علاج ہے، جنھوں نے اس وقت نازک مسئلہ کی صورت اختیار کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ" (الانفال) اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوگے تو وہ تمہیں ایک فیصلہ کی چیز دے دیگا، اور تم سے تمہارے گناہ دور کر

دے گا) میں نے کلکتہ کے آخری اجلاس میں جس میں حاضرین کی تعداد کا اندازہ پانچ لاکھ کیا گیا ہے، صفائی سے اس معاملہ میں مسلمانوں کا احتساب کیا تھا، اور ان سے کہا تھا کہ وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں اور اپنے گھروں کا جائزہ لیں کہ وہ اس شرعی قانون و تعلیم (جو دین کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہے) پر کس قدر عمل کرتے ہیں؟ ضرورت ہے کہ اس خطبہ و مقالہ کی اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

۲۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اور ملک کے دانشور اور حقیقت پسند غیر مسلموں کو اسلام کے عائلی نظام کی برتری، اس کے منصفانہ، عقل سلیم اور فطرت انسانی کے مطابق ہونے کو (جو خدائے حکیم و دانا، رؤوف و رحیم اور خالقِ کائنات اور مربی نوع انسانی کا بنایا ہوا ہے) علمی انداز، نا قابلِ تردید دلائل اور مذاہب اور عائلی قوانین اور نظاموں کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ انگریزی، اردو، ہندی اور علاقائی زبانوں میں پیش کیا جائے، یوں تو ''مجلس تحقیقات و نشریات اسلام'' ندوۃ العلماء (لکھنؤ) مرکزی مسلم پرسنل لا آفس (مونگیر) مکتبہ جماعت اسلامی ہند (دہلی) اور بعض دوسرے تصنیفی و تحقیقی اداروں کی طرف سے متعدد و قیع چیزیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس میں وسعت و ترقی اور اضافہ کی ضرورت ہے، اس موضوع پر صاحب نظر، صاحب ایمان ماہرین قانون اور اہل قلم سے کتابیں لکھوائی جائیں، سیمنار، سمپوزیم منعقد کئے جائیں، جن میں ممالک عربیہ کے چوٹی کے فضلاء، ماہرین فقہ اسلامی کو دعوت دی جا سکتی ہے اور میں بھی رابطۂ عالم اسلامی کی بین الاقوامی المجمع الفقھی (مسائل و تحقیقات کی اکیڈمی) کا بنیادی رکن ہونے کی بناء پر اس کی ذمہ داری لے سکتا ہوں کہ وہ اس دعوت کو لبیک کہیں گے، اور شوق سے شرکت کریں گے، اس سلسلہ میں اس موضوع پر نیز دوسرے ملّی مسائل پر ڈائیلاگ

(Dialogue) کا انتظام کرنا بھی مفید ہوگا، اور بعض اہلِ علم اس پر سنجیدگی سے غور بھی کر رہے ہیں۔

۳- تیسری اور ایک بنیادی ضرورت اس بات کی یہ ہے کہ اگرچہ بائنہ کو عدّت کے بعد سابق شوہر سے قانونی طور پر مستقل گزارہ دینا جس کو MENTEANCE کیا جاتا ہے، شرعاً، عقلاً کسی طرح درست نہیں، شرعاً تو اس لئے نہیں کہ قرآنی نصوص واحکام اور امت کے تعامل کے مطابق اس کی گنجائش نہیں، انتظاماً اس لئے کہ پھر اس کے بعد مسلم معاشرہ میں بھی سفاکی اور بے دردی کے وہ واقعات رونما ہوں گے جو ملک کے ایک وسیع معاشرہ میں پیش آرہے ہیں اور نئی بیاہی ہوئی عورتیں مطلوبہ جہیز نہ لانے پر جلائی جارہی ہیں اور ان سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جارہا ہے، میں نے وزیر اعظم صاحب سے اپنی ایک نجی گفتگو میں صفائی سے کہا تھا کہ راجیو جی! اگر یہ قانون بن گیا تو یہ لکھ رکھئے کہ بجائے طلاق کے ذریعہ پیچھا چھڑانے کے ایسی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات کو زہر دے کر یا جلا کر ختم کیا جائے گا، جیسا کہ آج ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔

نفقۂ مطلقہ کی اس مستقل قانونی شکل (گذارے کو چھوڑ کر) شریعت کے بتائے ہوئے ان متبادل انتظامات کو زندہ اور قائم کرنا پڑے گا جن کی شریعت نے ترغیب دی ہے، اور جو شریعت اسلامی کے برکات میں سے ہیں، مثلاً عورت کو والدین اور دوسرے مورثین کے ترکہ سے شرعی حصہ دلانا، جو بعض شکلوں میں واجب ہے اور بہت سے خاندانوں اور معاشروں میں عرصہ سے متروک ہے، مطلقہ کے قریبی رشتہ داروں (ذوی الارحام) اولاد، بھائیوں اور اگر والدین زندہ ہوں تو ان کو اس کے ساتھ اعانت و مواسات (ہمدردی و غمخواری) اور صلہ رحمی کی ترغیب دینا، اس کی کفالت کا مناسب بندوبست کروانا، اگر نکاح ثانی کی عمر اور حالات ہیں

تو اس کی ترغیب و تحریض، نیز اسلامی بیت المال کا قیام جس سے نادار اور ضرورت مند افراد کو ضروریاتِ زندگی اور قوتِ مالا یموت فراہم کیا جائے۔

اس سے بڑھ کر پورے مسلم معاشرہ میں ہمدردی، سلوک، ایثار و فیاضی کا جذبہ پیدا کرنا، جو ہزار بیماریوں کا علاج ہے، اور ہزار مشکلات و مسائل کا حل، اور جو مسلم معاشرہ کو وضعی قوانین سے مستغنی کرتا ہے، اور صدر اوّل اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اس کی تابناک مثالیں ہیں، اور اس کا زندہ ثبوت ملتا ہے، یہ ہیں کرنے کے وہ کام جن کو جلد سے جلد شروع ہو جانا چاہئے، اور جو اسلام کی روح، مزاج اور شریعت الٰہی اور تعلیمات آسمانی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں، اور انہیں میں شریعت کا اصل تحفظ اور اس ملک و عہد میں مسلمانوں کے ایک صاحب شریعت، صاحب کردار، اور صاحبِ مقام مستحکم و باعزت، خوددار اور غیور ملّت کی حیثیت سے باقی رکھنے کی ضمانت ہے۔(۱)

---

(۱) اس انٹرویو کے بعد کشمیر، پنجاب، آندھرا پردیش، ٹامل ناڈو اور کرناٹک میں بھی وفد کا دورہ ہوا اور عظیم اجتماعات اور جلسے منعقد ہوئے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

(اقبالؒ)

”مذہب اصول دیتا ہے، تہذیب بنے بنائے سانچے، مذہب زندگی کو وسیع اور لچکدار بناتا ہے، تہذیب تنگ اور بے لچک بناتی ہے، مذہب تمام انسانوں کو ایک طرح کے اصول زندگی، ایک مقصد زندگی، ایک روح زندگی اور پیغام زندگی دیتا ہے اور تہذیب چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے درمیان رسوم وعادات کی دیواریں کھڑی کر دیتی ہے۔“

مذہب یا تہذیب

کس کی دعوت صحیح ہے؟

(۱) آج کل پرانی تہذیبوں کے زندہ کرنے کا شوق ہر ملک اور ہر قوم میں عام ہے کوئی دو ہزار برس پہلے کی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔کوئی چار ہزار برس قبل مسیح کے دور کو واپس لانا چاہتا ہے، جن ملکوں کو نئی آزادی ملی ہے وہاں ہر طرف یہی نعرہ بلند ہے کہ اپنے ملک کی ہزاروں سال کی پرانی تہذیب کو زندہ کرنے میں اب کیا رکاوٹ ہے، کہیں اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہماری تہذیب دنیا کی سب سے پرانی تہذیب ہے، کہیں کہا جا رہا ہے کہ ہماری زبان اور تہذیب کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے ہزاروں سال تک بیرونی اثرات قبول نہیں کئے اور وہ ہزاروں سال پہلے کی شکل وصورت پر قائم ہیں۔

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس جذبہ اور مطالبہ کا محرک اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ کیا کسی بہتر نئی زندگی کی تلاش، مٹی ہوئی اور کھوئی ہوئی اخلاقی خوبیوں کی بازیافت، ایک صالح تر نظام زندگی اور ایک بہتر معاشرہ کا احیاء جس میں زیادہ روحانیت ومعنویت

امن واطمینان، سکون قلب، خلوص ومحبت، حقوق باہمی کی ادائیگی، خداترسی اوراحساس ذمہ داری تھا، اورکم سے کم نفسانیت وخودغرضی، مادیت وبداخلاقی، خدافراموشی ونفس پرستی تھی، ہم جب پرانی تہذیب کوزندہ کرنے کی دعوت ومطالبہ کی علمی تنقید وتحلیل کرتے ہیں اوراس دعوت کے علمبرداروں اور پرجوش وکیلوں کی زندگی اوراخلاق کا ان کی دعوت سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ان کی تقریروں اور تحریروں میں اخلاق اوراس کی بنیادوں، روحانیت اورایمان واعتقاد کا سرے سے تذکرہ اوراہمیت نہیں، محض تمدن کے سطحی مظاہراورفنون لطیفہ زبان وکلچر کا تذکرہ ہے جن کواخلاق ومعاشرت سے زیادہ سروکار نہیں، ان کے ادب میں ہمیں موجودہ مادہ پرست نظام زندگی پرکوئی گہری تنقیداوراس سے بیزاری نظرنہیں آتی، اورنہ زندگی کی ان گہری بنیادوں سے دلچسپی جن پرزندگی کی عمارت تعمیرہوتی ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پرانی تہذیب کے احیاء کی دعوت کے ساتھ ساتھ اس غلط نظام زندگی کے ساتھ جگہ جگہ سازباز کئے ہوئے ہیں، جابجااس کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، اورکہیں اس سے انحراف یابغاوت کرتے نظرنہیں آتے، انہوں نے اسی ڈھنگ پر آئین سازی کا کام جاری رکھا، نظام تعلیم کواس کی لادینی اور غیراخلاقی روح کے ساتھ قبول کیا، غیرمذہبی ریاست کا اعلان کیا، مملکت کی ساری تنظیم غیردینی اورغیراخلاقی بنیادوں پرکی، مسائل زندگی اوران کے حل کی کوشش میں بےنظمیوں، بدعنوانیوں، رشوت، چوربازاری اورنفع خوری اوردوسری خرابیوں کے دورکرنے میں ان کا ذہن بیسویں صدی کے مادہ پرست مغربی ذہن سے کسی طرح مختلف اوربہترطریقہ پر سوچنے والانہیں اورکہیں بھی اس گہرے تفکرکا ثبوت نہیں دیتا جومشرق کی قدیم مذہبی قوموں کی خصوصیت ہے، مشکلات اورنئی نئی الجھنوں کی وہی تعبیراوران کودورکرنے اورسلجھانے کی وہی اوچھی تدابیرجویورپ وامریکہ میں سوچی اورآزمائی جاتی ہیں، نئی

کمیٹیوں کی ترتیب، تحقیقاتی کمیشنوں، انسداد رشورت ستانی کے لئے افسروں کا تقرر، غلہ کی نایابی کے لئے راشننگ، قیمتوں کی افزونی کا علاج قیمتوں کا کنٹرول وغیرہ وغیرہ ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ پرانی تہذیبوں کے قدردانوں اور ویدک تہذیب اور پراچین ہندوستان کے داعیوں کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہو کہ عوام میں اخلاقی احساس اور مذہبی روح کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، اور ان میں پرانے زمانے کا ایمان واعتقاد پیدا کیا جائے۔ جزاء وسزا کے مذہبی عقیدہ اور یقین کو دوبارہ زندہ کیا جائے جس کے بغیر آدمی جرائم اور بداخلاقیوں سے اجتناب نہیں کرسکتا، یورپ کے مادی فلسفہ کی تردید کی جائے، دولت پرستی کی بحرانی کیفیت کو جو ساری قوم پر طاری ہوگئی ہے کم کرنے کی کوشش کی جائے، اخلاق وروحانیت کی منظم وموثر طریقہ پر تلقین کی جائے، ہم کہیں اس کا کوئی ذکر وفکر نہیں پاتے، ہر طرف پرانی تہذیب کے ایک مبہم لفظ اور زبان وکلچر کی صدا بلند ہے جس کے پیچھے نہ کوئی روحانی خواہش ہے نہ کوئی اخلاقی جذبہ۔

تعمیر کے لئے صرف مذہب کی بنیادیں ہیں

اس بنا پر ہم جب تہذیب قدیم کے احیاء کی دعوت کو جانچتے ہیں اور اس کے ذہنی وقلبی محرکات کو تلاش کرتے ہیں تو ہم کو ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی تہ میں صرف قوم پرستی اور نسلی غرور کا جذبہ کام کر رہا ہے یا اس تہذیب کے خلاف ردعمل کا جذبہ جو اس پچھلے ہزار برس میں ہندوستان میں برسرعروج رہی ہے اور اس کا جرم یہ ہے کہ اس کا بہت سا حصہ ہمالیہ کی دیواروں کے مغربی یا شمالی جانب سے آیا ہے، درحقیقت ان میں سے کوئی چیز بھی کوئی سنجیدگی اور گہرائی نہیں رکھتی اور محض طفلانہ احساسات اور عامیانہ جذبات پر مبنی ہے، قوم پرستی اور نسلی غرور وتکبر دنیا کے سب سے بڑے تخریبی عناصر رہے ہیں جنھوں نے بار بار سکندر وچنگیز کے لباس میں دنیا کو تہ وبالا کیا ہے،

کسی قدیم تہذیب کے مٹے ہوئے نشانات سے کسی ملک وقوم کی تعمیر نہیں ہوسکتی تعمیر کے لئے صرف صحیح مذہب کی بنیادیں ہیں جو زندگی کے حدود متعین کرکے زندگی کی پوری وسعت میں اس کی لچک اور اس کی ترقی کو تسلیم کرتا ہے، اور ان حدود کے اندر زندگی کو پورے طور پر پھلنے پھولنے اور دوڑنے بھاگنے کا حق دیتا ہے، خواہ دس ہزار برس کی مقدس تہذیب ہو یا دو ہزار برس کا تمدن وہ ایک خاص قطع کا لباس ہے جو عصر جدید اور ایک نوخیز قوم کے جسم پر سلامت نہیں رہ سکتا۔ پرانی تہذیب ہمیں ایک سلا ہوا لباس دیتی ہے دو ہزار برس قبل مسیح یا چار سو برس بعد مسیح کا لباس بیسویں صدی عیسوی کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے۔ مذہب ہمیں لباس کے اصول وحدود عطا کرتا ہے۔ اور زندگی کی اشیاء خام سے ہمیں سامان تیار کرنے کے اخلاقی ضوابط بخشتا ہے، وہ ایک خاص طرح کی آستین، خاص شکل کا دامن، خاص نمونہ کی کلی خاص طرز کے تکمے نہیں دیتا، وہ یہ کہتا ہے کہ لباس ساتر ہو، پردہ پوش ہو غرور پیدا کرنے والا نہ ہو، اسراف سے محفوظ ہو، تنعم وراحت پسندی کا پیدا کرنے والا نہ ہو، حتی الامکان اس میں سادگی واعتدال کا لحاظ رکھا گیا ہو، ان حدود کے اندر آپ کو ہر زمانہ ہر ملک ہر موسم اور ہر طرح کے حالات وضروریات کے لئے لباس تیار کرنے کی پوری آزادی ہے، تہذیب قدیم اصرار کرتی ہے کہ کرتہ فلاں نمونہ کا ہو جو دو ہزار برس پہلے فلاں دور میں استعمال ہوتا تھا، پیجامہ کی جگہ دھوتی یا لنگوٹ ہو کہ وہ ہمارے پرکھوں کا شعار ہے جاڑوں میں کمبل یا روئی کی رضائی کے علاوہ کچھ استعمال نہ کیا جائے کہ یہ سب چیزیں باہر سے آئی ہیں۔ مذہب کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں، اندرون ملک و بیرون ملک دیس پردیس، قدیم وجدید کی تقسیم اس کے یہاں بے معنی اور فضول ہے اس کے نزدیک زندگی کے کچھ ہمہ گیر اصول ہیں جو ہر ملک وقوم اور ہر زمانہ کے لئے عام ہیں، وہ انسانوں سے یہ نہیں کہتا کہ یہ لباس تمہارے دیس کا ہے یہ پردیس کا

تمہارے باپ دادا پہنتے تھے یہ نہیں پہنتے تھے، وہ عام انسانوں سے کہتا ہے۔

یَابَنِیٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ط وَ لِبَاسُ التَّقْوٰی ذَالِکَ خَیْرٌ ط

(سورہ اعراف : ۲۶)

"اے آدم کی اولاد ہم نے تمہارے لئے وہ لباس پیدا کیا ہے جو تم کو برہنگی سے بچائے اور آرائش کے کپڑے اور پرہیزگاری کا لباس وہ سب سے بہتر ہے۔"

اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ فلاں کھانا فلاں ملک کا ہے اور فلاں پھل کو فلاں قوم نے ترقی دی، فلاں کھانے کی اس لئے سرپرستی کی جائے کہ وہ ہمارے ملک کا قدیم ترین کھانا ہے اور فلاں قسم کے آداب طعام کا اس لئے مقاطعہ کیا جائے کہ ایک حملہ آور قوم ان کو اپنے ساتھ لائی تھی، وہ صرف یہ کہتا ہے۔

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ط اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ہ

(سورہ اعراف :۱۳)

"کھاؤ پیو اور بیجا خرچ نہ کرو اس کو بیجا خرچ کرنے والے پسند نہیں آتے"

ساری زندگی میں مذہب و تہذیب کا یہی اصولی فرق نظر آئے گا۔

مذہب اصول عطا کرتا ہے، تہذیب بنے بنائے سانچے دیتی ہے وہ بھی سیکڑوں ہزاروں برس پہلے کے جو اپنی زندگی کھو چکے ہیں، اور جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے ہیں، مذہب زندگی کو وسیع اور لچکدار بناتا ہے تہذیب اس کو تنگ اور بے لچک بناتی ہے، مذہب کی وجہ سے اللہ تعالی کی ہر طرح کی نعمتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

قدیم تہذیب صدہا چیزوں سے محروم کرتی ہے۔ مذہب کہتا ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ

مِنَ الرِّزْقِ ط (اعراف : ۳۲)

''پوچھئے کس نے اللہ کی پیدا کی ہوئی وہ زینت حرام کی جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور کھانے کی صاف ستھری چیزیں''

اور قدیم تہذیب ہر چیز میں اپنا نشان ڈھونڈھتی ہے جہاں اس کو اپنا نشان نہیں ملتا اس کو رد کرتی ہے یا اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے۔

(۲) قدیم تہذیبیں انسانوں کو چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم کرتی ہیں اور انسانوں اور انسانوں کے درمیان ملکوں اور ملکوں کے درمیان قوموں اور قوموں کے درمیان بلکہ صوبوں اور صوبوں کے درمیان رسوم و عادات کی دیواریں کھڑی کرتی ہیں، مذہب تمام انسانوں کو ایک طرح کے اصول زندگی، ایک مقصد زندگی، ایک روح زندگی اور پیغام زندگی عطا کرتا ہے، قدیم تہذیبوں کے مطالعہ اور قدیم تاریخ کے اثر سے جو ذہنیت تیار ہوتی ہے وہ قومی عروج اور دور قدیم کے بازگشت کے لئے ناانصافی، تنگ نظری اور ظلم سکھاتی ہے، اس لئے کہ بعض وقت اس کے بغیر اس تہذیبی دور کی واپسی مشکل ہوتی ہے، اس لئے یورپ کی جن قوموں کا ذہنی وسیاسی نشو ونما قدیم تہذیب اور قدیم تاریخ کی بنیاد پر ہوا وہ بڑی ظالم و مغرور اور بے رحم ثابت ہوئیں۔ مذہب کی تعلیم ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَّا تَعْدِلُوا ط اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

(سورہ المائدہ : ۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے واسطے کھڑے ہونے والے انصاف

کی گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، انصاف کرو یہی بات خدا کے خوف ولحاظ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تمہارے اعمال سے خوب خبردار ہے۔"

قدیم تہذیبیں کہتی ہیں آؤ اس دور کی طرف جب ایسے رسم ورواج تھے، کھانے پینے کا یہ طریقہ تھا، لباس کا یہ طرز تھا، کھانے کے یہ برتن تھے یا فلاں درخت کے پتے تھے، سواری کے لئے رتھ تھے، بیل گاڑیاں تھیں یا اونٹ تھے، آؤ شدھ سنسکرت کی طرف یا خالص عربی کی طرف یا زبان پہلوی کی طرف۔

مذہب کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں، اس کی نظر میں وسائل اہم نہیں مقاصد اہم ہیں اور وہ روح اور ذہنیت اہم ہے جس کے ساتھ یہ وسائل استعمال کئے جاتے ہیں، رتھ، بیل گاڑی، اونٹ کی سواری یا ریل موٹر ہوائی جہاز ان وسائل سفر میں جب جس چیز کی ضرورت ہو اور مقصد سفر کے لئے زیادہ مفید ہو اس کو اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی نگاہ میں ضروری یہ ہے کہ:

لِتَسۡتَوُوا عَلٰى ظُهُوۡرِهٖ ثُمَّ تَذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ رَبِّكُمۡ اِذَا اسۡتَوَيۡتُمۡ عَلَيۡهِ وَتَقُوۡلُوۡا سُبۡحٰنَ الَّذِىۡ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقۡرِنِيۡنَ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ۔

"تم ان سواریوں پر سوار ہو پھر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم ان پر بیٹھ جاؤ اور کہو کہ پاک ہے اس کی ذات جس نے ہمارے قابو میں ان سواریوں کو کر دیا اور یہ ہمارے بس کی تو نہ تھیں، اور ہم اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔"

مذہب کی دعوت یہ نہیں کہ آؤ عبرانی زبان کی طرف یا عربی یا سنسکرت یا

فارسی کی طرف، مذہب کی صاف دعوت سب کے لئے وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اہل مذہب کو دی۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ط

(آل عمران : ۶۴)

"اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہرائیں اس کا کسی کو اور ہم میں سے ایک دوسرے کو اللہ کے علاوہ رب نہ بنائے۔"

اس لئے قدیم تہذیبوں کا احیاء انسانیت کے لئے ایک مصیبت اور ایک فتنہ ہے جو نئی نئی جنگیں اور نئے نئے اختلافات اور نئے مشکلات پیدا کرے گا، صحیح مذہب کی دعوت، پیام رحمت اور انسانیت عامہ کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

اگر قدیم تہذیبیں زندہ ہو جائیں

پھر فرض کیجئے کہ خدانخواستہ سب قدیم تہذیبیں اپنے حامیوں کی خواہش کے مطابق زندہ ہو جائیں، ہندوستان، یونان، روم، ایران، عرب کی قدیم تہذیبیں دوبارہ واپس آجائیں تو دنیا میں کیسا فتنہ برپا ہو اور کیا تماشہ دیکھنے میں آئے، ظاہر ہے کہ یہ تہذیبیں زندہ ہوں گی تو اپنے تمام خصوصیات اور محاسن و معائب کے ساتھ زندہ ہوں گی، آپ کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ فلاں قدیم تہذیب ضرور زندہ ہو مگر فلاں معائب اور نقائص جو اس کی پوری زندگی میں قائم رہے زندہ نہ ہوں، اور اس کا آپ کو اختیار ہی کب ہے، ہر تہذیب اپنے تمام مزاجی خصوصیات اور امتیازی صفات کے

ساتھ زندہ ہوگی، اب دنیا کا نقشہ کیا ہوگا، ہندوستان میں شہوانیت کا دور دورہ ہے، سخت طبقاتی ناانصافی اور چھوت چھات پایا جاتا ہے، عورتیں ستی ہورہی ہیں، یونان میں دیویوں کی قربان گاہوں پر حیاسوز افعال کئے جارہے ہیں، عصمت فروشی ایک معزز اور پسندیدہ پیشہ ہے۔ روم میں غلاموں پر تیل چھڑک کر آگ لگا کر دعوتوں میں روشنی کا انتظام کیا جارہا ہے، اور اس انسانیت سوز روشنی میں پر تکلف دعوتوں اور شاہانہ ضیافتوں کا انتظام کیا جارہا ہے، سیانی کے دنگل گرم ہیں، جہاں ایک انسان دوسرے انسان پر محض لوگوں کی شوق تماش بینی کی تسکین کے لئے تلوار سے حملہ آور ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ایک انسان خاک وخون میں لوٹتا نظر آتا ہے، مجمع اس کی آخری کراہ سننے کے لئے اور نزع کی کیفیت دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتا ہے اور پولیس کو انتظام مشکل ہو جاتا ہے ایران میں آتش پرستی ہورہی ہے، امراء ایک ایک لاکھ روپئے کی صرف ٹوپی پہنے ہوئے ہیں اور غرباء سردی میں ٹھٹھر کر مر رہے ہیں، حقیقی بہن سے نکاح کا دستور ہے۔ اور ایک طبقہ عورت کو سوسائٹی کی ملکیت عامہ بنانے کا طلبگار ہے۔ عرب میں معصوم بچیاں دفن کی جارہی ہیں، قافلے لٹ رہے ہیں، بے بات کی بات پر چالیس چالیس برس تک جنگیں جاری رہتی ہیں، شراب، جوئے اور بداخلاقی کے عریاں قصوں کو فخریہ اشعار میں بیان کیا جارہا ہے اور ان اشعار کو کعبہ میں آویزاں کر کے شاعری کی قدردانی کا ثبوت دیا جارہا ہے، کیا یہ دنیا کا کچھ اچھا نقشہ ہوگا اور کیا اس بات کے لئے کوئی قانونی و اخلاقی جواز ہے کہ ہندوستان کی چار ہزار برس پہلے کی تہذیب تو ضرور زندہ ہو لیکن ایران و عرب کی ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی تہذیبیں زندہ نہ ہوں، اگر ہر ملک میں اس کی قدیم تہذیب کو زندہ ہونے کا حق ہے تو دنیا کا ہر ملک اس حق کا طلب گار ہے اور ہمیں استثناء کا کوئی حق نہیں۔

قدیم تہذیبوں کے مٹ جانے میں اللہ کا فضل شامل ہے

دراصل ان تہذیبوں کے مٹ جانے میں اللہ کا بڑا فضل شامل تھا ان کے ساتھ ان کی بہت سی بے اعتدالیاں اور ناانصافیاں بھی مٹ گئیں، اور انسانوں کی ایک بڑی جماعت کو ان سے نجات ملی، قومی تعصبات سے اگر آزاد ہو کر ہم تاریخ و فلسفہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم کو نظر آئے گا کہ دنیا میں جو چیز مٹی اس کو مٹ ہی جانا چاہیئے تھا، اس کا مٹ جانا اس کی علامت ہے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنی عمر پوری کر چکی تھی، کسی دوسرے نظام زندگی کا اس پر غالب آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ غالب آنے والا نظام زندگی اس سے فائق و برتر تھا اور زندگی کا زیادہ استحقاق اور استعداد رکھتا تھا اب ان مٹی ہوئی تہذیبوں کا دوبارہ زندہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے فراعنہ مصر کی مسالہ لگی ہوئی لاشوں، (ممی) کو ان کے مقبروں سے نکال کر دوبارہ مصر کے تخت پر بٹھانا اور حکومت کے اختیارات کو ان کے حوالہ کرنا ہے، دنیا میں کوئی فلسفہ اور نظام زندگی بغیر روح اور اپنے مخصوص پیغام کے زندہ نہیں رہ سکتا، ان تہذیبوں کی روح نکل چکی، وہ اپنا پیغام اپنے زمانہ کی محدود دنیا کو سنا چکیں اب نہ ان میں عصر حاضر کی روح ہے نہ دنیا کے لئے کوئی پیغام، نہ ان کے پاس انسانیت کے مسائل و مشکلات کا کوئی حل ہے، نہ سرگشتہ و حیران قوموں کے لئے راہ عمل، اس لئے اب ان مردہ تہذیبوں کا زندہ کرنا طاقت اور وقت کا ضیاع اور ایک لاحاصل کام ہے۔

اصل تہذیب "مذہب اسلام" جس کو آخری پیغمبر ﷺ لے کر آئے

دعوت و جد و جہد کی چیز دراصل صحیح اور غیر فانی مذہب ہے جس کو اللہ کے

پیغمبر ہر ملک اور ہر دور میں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری اور دائمی طور پر لے کر آئے، انہوں نے اس کے ذریعہ سے انسانوں کو دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دیا، خالق سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا، توحید خالص کا سبق پڑھایا، حساب کتاب کی اخروی زندگی کا منتظر بنایا، نیکی اور بدی کے معین حدود بتلائے اور اخلاق و معاشرت و حقوق باہمی کے وہ بے خطا اصول و ضوابط عطا کئے جن پر ہر دور میں حیات انسانی کی تنظیم ہو سکتی ہے اور مدنیت صالحہ وجود میں آتی ہے، ان کے احکام پر عمل کرنے سے خود بخود ایک زندگی پیدا ہوتی ہے جو افراط و تفریط اور ہر طرح کی بے اعتدالیوں سے پاک ہوتی ہے، ایک معاشرہ قائم ہوتا ہے جو امن و سکون، اطمینان قلب، اشتراک و تعاون اور اعتدال و توازن کا بہترین نمونہ ہوتا ہے اس کی بنیادیں ٹھوس لیکن اس کی فضا وسیع ہے۔ اس میں فولاد کی طرح بیک وقت صلابت اور لچک دونوں موجود ہیں یہ وہ زندگی اور معاشرہ ہے جس پر کسی قوم و نسل کی چھاپ اور کسی قومیت اور وطنیت کا ٹھپہ نہیں۔ یہ انسانیت کی دولت مشترکہ ہے جس میں کسی قوم اور ملک کی اجارہ داری نہیں، اس سے نہ چین کو انکار ہو سکتا ہے نہ ہندوستان کو عار، نہ ایران کے لئے وحشت کی کوئی وجہ ہے نہ یورپ کے لئے گریز کی کوئی راہ، پر امن اور کامل زندگی کے لئے اس کے سوا کوئی نمونہ ہی نہیں۔

آپ کا جی چاہے تو آپ اس زندگی کو بھی تہذیب کہہ سکتے ہیں جو ان عقائد و احکام سے وجود میں آئی ہے لیکن آپ اس کو عربی تہذیب یا ایرانی تمدن نہیں کہہ سکتے اس کو کسی ملک اور قوم اور اس کے طرز تعمیر اور فنون لطیفہ سے دلچسپی نہیں اور وہ کسی قومی تمدن یا ملکی تہذیب کی نمائندہ اور وکیل نہیں، ہر ملک میں اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے اور ہر قوم اس کو اپنا سکتی ہے مٹ جانے والے تمدنوں پر اس کی بنیاد نہیں، ایمانیات و عقائد اور غیر متبدل حقائق پر اس کی بنیاد ہے جو نبی دنیا میں لے کر آئے،

اس لئے اس کے مٹنے اور دوبارہ زندہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ؎

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطون

اس کے لئے علیحدہ دعوت واحیاء کی ضرورت نہیں اسلام کی دعوت اس کی دعوت ہے

اور یہ دعوت ہر وقت زندہ اور تابندہ ہے ؎

طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثال زمانہ گوناگوں

’’ضرورت ملک وقوم کی سطح پر ایک اسلامی معاشرہ کی ہے جو دنیا کے لئے نمونہ بن سکے اور لوگوں کو دعوت فکر اور دعوت انقلاب دے، اسی لئے نبی کی بعثت کے ساتھ......ایک پوری امت کی بعثت عمل میں آئی......اس دعوت اور اس امت نے ایک ایسے آزاد، معیاری ومثالی اسلامی معاشرہ کا نمونہ پیش کیا جس کے نمائندے کسی پہاڑ کی چوٹی یا کسی جزیرہ میں الگ تھلگ زندگی نہیں گذار رہے تھے، ان کے ساتھ حکومت کی ذمہ داریاں بھی تھیں، دولت بھی تھی، طاقت بھی تھی، تجارت اور ذرائع معاش بھی تھے، اور باہر کی دنیا سے تعلقات بھی، انھوں نے زندگی کا ایک نیا نقشہ کامیاب بنا کر پیش کیا۔ دنیا اسی وقت توجہ اور غور کرنے پر مجبور ہوتی ہے جب پورے معاشرہ کی سطح پر، پورے تمدن کی سطح پر، عالمگیر اسٹیج پر (جس پر تمام دنیا کی نگاہیں پڑتی ہیں) صحیح اور مکمل اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کیا جائے، اور قوموں اور ملکوں کی نگاہیں یہ اندازہ لگا سکیں کہ اسلام کا عقیدہ انسان کی زندگی میں یہ تبدیلی پیدا کرتا ہے، اور اللہ کے یہاں سے آئی ہوئی روشنی اور ہدایت کا نور اس اس کی زندگی کو اس طرح چمکاتا اور سنوارتا ہے، شریعت کی تعلیمات کس طرح کا معاشرہ پیدا کرتی ہیں، کس طرح کے اخلاق پیدا کرتی ہیں، جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک انسانیت کیا، انسانیت کا کوئی چھوٹا سا کنبہ اور عالم انسانی کا ایک چھوٹا سا گوشہ بھی توجہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔‘‘

اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب

دو نظام عقائد اور دو تہذیبیں

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لئے، اور اپنی ذات کی معرفت عطا کرنے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کے لئے، جو عقل و قیاس سے ماوراء ہے، اور جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیا میں موجود نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو منتخب فرمایا، اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو، پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات وصفات کا صحیح اور مُستند علم عطا فرمایا، اور اپنے منشاء اور احکام، اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقہ سے آشنا کیا، اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (سورہ آل عمران : ۱۷۹)

''اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے، غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا

ہے، منتخب کر لیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، اس کی بندگی کے صحیح قاعدے، اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقے کو معلوم کرنے کا اُن پیغمبروں کی اطلاعات اور تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں، یہ عقل و ذہانت، قیاس آرائی، وطبع آزمائی، خواہشات اور قومی رسم و رواج کا میدان نہیں، اس کے لئے اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا خود اس کی خبر دے، اور وہ اس کی خبر پیغمبروں ہی کے ذریعہ دیتا ہے، اس لئے اس علم و ہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت، طریقۂ زندگی کی صحت، اعمال کی قبولیت، اور انسانوں کی مقبولیت، اسی گروہ انبیاء کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے، انہیں کے تعلیم کئے ہوئے عقائد، انہیں کی عطا کی ہوئی معرفتِ الٰہی، انہیں کے لائے ہوئے حقائق اور علوم، اور انہیں کا طریقۂ زندگی، انہیں کی معاشرت اور اخلاق، اللہ تعالیٰ کو محبوب اور مقبول ہیں، اور سارے انسانوں کو ان کی اقتدار اور تقلید کرنے، اور ان کو اپنے لئے نمونہ اور امام بنانے کی ہدایت اور تاکید ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ اپنے ان محبوب بندوں، اور عالی مرتبہ پیغمبروں میں سے ایک بڑے گروہ کا نام بنام ذکر کرتا، اور ان پر اپنے انعامات گناتا ہے:-

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ
دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ
اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ
مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝
وَزَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ

الصّٰلِحِیۡنَ ۔ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَالۡیَسَعَ وَیُوۡنُسَ وَلُوۡطًا ؕ وَکُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۔ وَمِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَذُرِّیّٰتِہِمۡ وَاِخۡوَانِہِمۡ وَاجۡتَبَیۡنٰہُمۡ وَہَدَیۡنٰہُمۡ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۔ ذٰلِکَ ہُدَی اللّٰہِ یَہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَلَوۡ اَشۡرَکُوۡا لَحَبِطَ عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ ۚ فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِہَا ہٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِہَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِہَا بِکٰفِرِیۡنَ ۔ (سورہ الانعام:۸۴-۹۰)

”یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی، ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ تمہارا رب نہایت دانا اور علیم ہے پھر ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب جیسی اولا دوی، اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی (وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوحؑ کو دکھائی تھی، اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤدؑ، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (ہدایت بخشی) اس طرح ہم نیکو کاروں کو اُن کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں، (اسی کی اولاد سے) زکریا، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو (راہ یاب کیا) ہر ایک ان میں سے صالح تھا، (اسی کے خاندان سے) اسمٰعیلؑ الیسعؑ، اور یونسؑ اور لوطؑ کو (راستہ دکھایا) ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی نیز ان کے آباء واجداد، اور ان کی اولاد، اور اُن کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا، انہیں اپنی خدمت کے لئے چن لیا،

اور سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہنمائی کی، یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے، رہنمائی کرتا ہے، لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی، اب اگر یہ لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، تو (پروانہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے، جو اس سے منکر نہیں ہیں۔"

اس شیریں اور دل آویز تذکرہ کے بعد جس کے لفظ لفظ سے محبت اور حلاوت ٹپکتی ہے، اپنے رسول کو مخاطب بناتے ہوئے دنیا کے ہر انسان کو خطاب ہے:-

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ط قُلْ لَّآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ط إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ .

(سورہ الانعام:۹۱)

"اے محمدؐ، وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انہیں کے راستہ پر تم چلو، اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے، تمام دنیا والوں کے لئے۔"

یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کا وہ محبوب گروہ ہے، جس کی ہر بات اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے، عقائد والٰہیات سے لے کے عادات و مرغوبات، اخلاق و معاشرت، اور ان کو حمیتِ اسلامی کے جوہر سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بے چین روح اور ایک مضطرب دل عطا فرمایا تھا، وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان جس پر ہمارے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں، اور جس نے اسلام کی

خدمت اور دینی علوم کے میدان میں وہ کارنمایاں انجام دیئے جن کی نظیر بڑے بڑے اسلامی ملک نہیں پیش کر سکتے تاریخ کے پچھلے دور میں وہ مسلمانوں کی ذہانت، ان کی قوتِ اجتہادی، ان کی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے اظہار کا سب سے بڑا میدان رہا ہے، اس نے علوم اسلامیہ کی خدمت میں حصہ ہی نہیں لیا، بلکہ ان میں اضافہ کیا ہے، اس نے اسلامی کتب خانوں کو بعض وہ کتابیں دیں، جن کی مثال اسلام کی پوری علمی تاریخ میں نہیں ملتی، کیا اس وسیع ملک کو اس آسانی کے ساتھ مغربی تہذیب کی تحویل، اور اس کے علم برداروں کے چارج میں دے دیا جائے؟ کیا ہم اپنی ان آنکھوں سے دیکھیں کہ مسلمان خاندانوں کے نونہال، صدیقی، فاروقی، علوی، عثمانی، اور سادات وشیوخ کے گھرانوں کے چشم وچراغ جن کے اسلاف کرام کی کوششوں کی بدولت لاکھوں انسانوں کو اسلام کی ہدایت، اور علم کی دولت نصیب ہوئی، جنھوں نے اسلام کے چراغ کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اور بڑی بڑی آندھیوں اور طوفانوں میں بھی اس کو گل ہونے نہ دیا اسلامی تہذیب ومعاشرت، اور سنت وشریعت سے رشتہ توڑ کر خالص مادہ پرست انگریزوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور وہ ان کو اپنی نئی تہذیب وتعلیم کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمانوں، یا صحیح الفاظ میں دنیاداروں کی ایک نئی نسل تیار کردیں، جس کو نام اور قومیت کے سوا کسی چیز میں سابق نسل سے کوئی مناسبت اور مشابہت نہ ہو؟

یہ سوال تھا جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سامنے ایک مسئلہ بن کر کھڑا ہوگیا، یہ مسئلہ محض ایک مدرسہ، اور تعلیم گاہ کے قیام کا نہیں تھا، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم دیوبند کے حق میں ''ازالۂ حیثیت عرفی'' کا جُرم ہوگا، اگر کہا جائے کہ دارالعلوم چند مخصوص کتابوں کے پڑھنے پڑھانے، اور درس وتدریس کے ایک مرکز کی حیثیت سے قائم ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے بانیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی

نہیں ہو سکتی، ایسا کہنے والوں کو ان بزرگوں کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا، جس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ یہ محض ایک مدرسہ ہے، تو حضرت شیخ الہند تڑپ اٹھتے تھے، ان کے نزدیک یہ اسلام کا ایک قلعہ اس کے داعیوں اور مجاہدوں کی تربیت کی ایک چھاؤنی، اور سلطنتِ مغلیہ کے گل ہونے والے چراغ کا بدل، بلکہ نعم البدل تھا۔

بس مولانا محمد قاسمؒ کے سامنے اصل مسئلہ یہی تھا کہ کیا ہندوستان کو ان مغربی غارتگروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیں کہ ہمارے جگر کے ٹکڑے، جنھوں نے ہمارے خونِ جگر سے پرورش پائی، جن کی رگوں میں علماء اور اولیاء کا خون دوڑ رہا ہے، ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قبضے میں چلے جائیں، اور مغربی تہذیب اور تعلیم کے سائے میں پروان چڑھ کر، اور ہم سے مکمل طور پر بیگانہ، و نا آشنا ہو کر نکلیں؟ انہوں نے انگریزی حکومت کے اس چیلنج کو قبول کیا، اور بالکل اپنے جدِّ امجد صدیق اکبرؓ کی زبان میں یہ کہا کہ:۔

"أينقص الدّين و أنا حيٌّ"

''کیا خدا کے دین میں میرے جیتے جی کتر بیونت کی جا سکتی ہے۔''

ان کی صحیح ترجمانی یہی فقرہ کرتا ہے، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے نکلا تھا، اس فقرہ نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، اور زمانہ کی کلائی موڑ دی تھی، یہ ایک مختصر سا فقرہ نہیں، ایک دور کا عنوان، اور ایک تاریخ کا خلاصہ ہے، اگر صدیق اکبرؓ کی کوئی سیرت و سوانح نہ لکھی جاتی، تو یہی ایک فقرہ ان کی مکمل سیرت و سوانح بن سکتا تھا، یہ ایک الہامی فقرہ تھا، جو ان کی زبان سے نکلا، ایک شیر تڑپ کر جست لگا کر دھاڑتا ہے، جس سے سارا جنگل کانپ جاتا ہے، اس سے زیادہ جلال و صولت اور اس سے زیادہ شجاعت و غیرت اس فقرہ میں ہے، میں

سمجھتا ہوں کہ دار العلوم دیو بند اور ندوۃ العلماء کے بانیوں کی جو چیز رہنمائی کر رہی تھی، وہ یہی احساس تھا، ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ صرف ونحو کی تعلیم اور علوم عالیہ وآلیہ کی مجرد تدریس کے لئے مرکز قائم کریں، اس کے لئے مصر کا جامع ازہر، تیونس کا جامع زیتونہ، مراکش کا جامع القرویین اور ہندوستان کے کئی بڑے بڑے مدارس موجود تھے، ان کی ٹکر کا کوئی مدرسہ قائم کرنا اس بے سروسامانی کی حالت میں محض تعلیم وتعلّم کے لئے کوئی دانشمندانہ فعل اور کوئی جرأت مندانہ اقدام نہ تھا۔

غیر منقطع رشتہ اور ناقابل شکست عہد

یہی دینی حمیّت تھی، جس نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بے چین بنا رکھا تھا، اور انہوں نے مدرسہ قائم کیا، اس مدرسہ نے ایک بہت محدود اور غیر محسوس طریقہ پر کام کا آغاز کیا، جس کا احساس اس زمانہ کے اچھے اچھے صاحبِ نظر لوگوں کو بھی شاید نہ ہوا ہو لیکن اس کا مقصد بہت عظیم تھا، وہ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت، علومِ دینیہ اور شریعتِ اسلامیہ کے لئے ایک قلعہ تعمیر کریں، اور اس دعوت کو متعدّی بنائیں۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

(سورہ الزخرف : ۲۸)

''اور یہی بات اپنی اولاد میں پیچھے چھوڑ گئے تا کہ (خدا کی طرف) رجوع کریں۔''

ان کی ان تمام کوششوں کا ماحصل اور مطمح نظر صرف یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمان جب تک زندہ رہیں، ان کا رشتہ ملّتِ ابراہیمی، اور شریعتِ محمدی سے اُستوار رہے، وہ اسی دین وآئین کے پابند ہوں جو خاتم النبین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ان کو ملا ہے، اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوں تو وہ اسی دین

کے وفادار اور حلقہ بگوش ہوں، یہ گویا اسی وصیت اور عہد نامہ کی تعمیل تھی، جس کا قرآن شریف میں تذکرہ ہے:۔

وَوَصّٰی بِھَا اِبْرَاھِمُ بَنِیْہِ وَیَعْقُوْبُ ط یَا بُنَیَّ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔

(سورۃ البقرۃ : ۱۳۲)

''اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بچو! خدا نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند فرمایا ہے تم مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔''

نیا زمانہ، نئے فتنے

عزیزان گرامی! آپ کی درس گاہ کی بنیاد حمیت اسلامی پر پڑی، آپ کی درسگاہ کی بنیاد زمانہ کے چیلنج کے قبول کر لینے پر پڑی، اب زمانہ کے نئے چیلنج کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے، کم سے کم دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے لئے اس چیلنج کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز نہیں، اس لئے کہ ان کی بنیاد ہی زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے پر پڑی تھی، مغربی تہذیب اور معاشرت، اور انگریزی تعلیم جس کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی رہنمائی، اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں تھا، اس زمانہ کا فتنہ تھا۔

لیکن فتنے کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، اور ایک ہی فتنہ ہمیشہ نہیں ہوتا، نئے نئے فتنے سر اٹھاتے ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے نئے نئے خطرے سامنے آتے ہیں، جاہلیت نئے نئے روپ میں سامنے آتی ہے، اور بڑے دم خم کے ساتھ میدان میں اترتی ہے، اقبال نے غلط نہیں کہا تھا: ع

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات و منات

بڑی خطرناک بات ہے کہ لات و منات یعنی باطل طاقتیں، اور جاہلیت

قدیم تو زندگی اور جوش وخروش سے بھرپور ہوں، اور مومن میں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وارث اور نائب ہے کہنگی اور فرسودگی، پستی اور افسردگی، کنارہ کشی اور پسپائی کی ذہنیت پیدا ہو جائے، لات ومنات نئے دم خم کے ساتھ، نئی اُمنگوں اور ولولوں کے ساتھ نئی تیاریوں اور نئے طریقوں کے ساتھ، نئے نعروں اور نئی نئی للکاروں کے ساتھ میدان میں آئیں اور مومن پر موت کی نیند طاری ہو جائے، اس کے قویٰ میں افسُردگی، اور اضمحلال پیدا ہو جائے، وہ زندگی کے میدان سے فرار اختیار کر کے یا کنارہ کش ہو کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کر لے، جہاں وہ اپنی زندگی کے دن گذار سکے، اور لات ومنات خم ٹھونک کر میدان میں کھڑے ہوں، اور دعوت مبارزت دے رہے ہوں۔

عہد جدید کا فتنۂ کبریٰ

حضرات! اس زمانہ کا فتنہ اور چیلنج کیا ہے؟ اس زماہ کا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جُداگانہ تہذیب، اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے نظامِ تعلیم، اس کے زبان وادب، اور رسم الخط، اور اس کے پورے ورثہ سے الگ کر دیا جائے، اور اسلام چند عبادات، اور چند رسوم وتقریبات کا (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ، اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) مثلاً شادی اور غمی میں کیا ہونا چاہیے، مُردے کو کس طرح آخری مرحلہ سے گذارا جائے، وغیرہ وغیرہ بس اسلام انھیں مذہبی ومعاشرتی رسوم (RITES) کا مجموعہ بن کر رہ جائے، میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہو، لیکن پھر بھی اندازہ ہے، کہ شاید ابھی یہ مرحلہ دور ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا جائے کہ آپ کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، آپ کو کوئی خاص عقیدہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں، آپ روزہ نہیں رکھ سکتے، آپ زکوٰۃ نہیں دے سکتے، لیکن وہ مرحلہ ضرور آ گیا ہے کہ مسلمانوں سے اشارہ اور کنایہ سے، اور کبھی کبھی صاف کہا جاتا

ہے، کہ مسلمان اپنی رضا و رغبت سے اپنی جُداگانہ تہذیب، اور ہر اس چیز سے بے تعلقی اختیار کرلیں جو ان میں ایک الگ ملّت، اور ایک مستقل تہذیب کا وارث ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے، وہ خود ہی اعلان کردیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں ہیں، وہ خود اپنے عائلی قانون (پرسنل لا) میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کریں، اور اپنے لئے وہی یکساں قانون پسند کریں جو سارے ملک کے لئے نافذ ہو، وہ اپنے تمام تعلیمی مرکزوں کو جو انھوں نے اپنی پسند و ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے، حکومت کی تحویل اور انتظام میں دے دیں، اور ان کے نظم و نسق سے خود دست بردار ہو جائیں، تاکہ ان سے ایک ہی طرح کے ماڈل تیار کئے جائیں، جو اس سیکولر اور اشتمالیت پسند ملک سے ہم آہنگ ہو، حکومت اسلام کی مخالف نہیں، اور اس کو اسلام کے ختم کرنے کے کام سے کوئی دل چسپی نہیں، اس کو تو اس پر فخر ہے کہ عالم اسلام کی سب بڑی مسلم برادری یہاں آباد ہے، اس کو آباد رہنا، اور پھلنا پھولنا چاہئے، اس سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں، اور بین الاقوامی اور سیاسی موقعوں پر اس کو ایک دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، آج صاف صاف کہا جارہا ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں رہنا ہے، تو ان کو قومی دھارے میں بہنا چاہئے، اور قومی دھارے کے معنی یہ ہیں کہ آپ تمام تشخصات سے دستبردار ہو جائیں، آج کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان رہو، تمہیں کوئی نہیں ٹوکتا، یہ فرقہ وارانہ فسادات تو ایک مریض کی ہذیانی کیفیت، اور ہسٹریا کا ایک دورہ ہے، جو ہمیشہ نہیں رہے گا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ بہت کم ہوگئے ہیں، اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ اور بھی کم ہو جائیں گے، میرے نزدیک یہ اصل خطرہ نہیں، اصل خطرہ نسل کشی کا نہیں، معنوی ارتداد کا ہے، ذہنی و تہذیبی ارتداد، اس خطرہ کو دیکھنے اور اس کو محسوس کرنے کے لئے کسی بڑی فراست، اور دُور بینی کی ضرورت نہیں، یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے جس کو ہر ایک پڑھ سکتا

ہے، اللہ تعالیٰ نے جن کو آنکھیں دی ہیں، وہ صاف دیکھ رہے ہیں کہ آج علی گڑھ کا معاملہ ہے، کل دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی باری آسکتی ہے، وقت اور حالات کا مسئلہ ہے، اواس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم علی گڑھ کے مسئلہ پر کتنی زندگی، اور بیداری، اور کتنی غیرت، اور خودداری کا ثبوت دیتے ہیں۔

دینی بدعات، اور منکرات سے نبرد آزما ہونے والوں کے اخلاف کی ذمہ داری

عزیز طلبہ! آپ کے اسلاف وہ تھے، جنھوں نے بدعات کے ساتھ ادنیٰ مصالحت گوارہ نہیں کی، آپ کے اسلاف نے آج تک مولود کے قیام کی اجازت نہیں دی، کتنے رسوم اور طریقے ہیں، جو مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں، اور انہوں نے مذہبی فرائض، اور دینی شعائر کی حیثیت اختیار کر لی ہے، لیکن آپ کا جس مکتبِ خیال اور مسلک سے تعلق ہے، اس کے علماء نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی، اور ان کو بدعت اور بے اصل بتایا، اس کی ان کو معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں بہت بڑی قیمت ادا کرنے پڑی، ان کا مقاطعہ کیا گیا، ان کو مسجدوں سے نکالا گیا، ان پر کفر وضلالت کے فتوے لگائے گئے، وہ بہت سے دنیوی مفادات، اور لذتوں سے محروم رہے، لیکن انھوں نے ان چیزوں کے ساتھ ذرا بھی رواداری نہیں برتی، اور کسی مداہنت و مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا، میرا خود اسی کیمپ سے تعلق ہے، جو شرک و بدعات کے مقابلہ میں سر بکف رہا ہے، بلکہ میرا تعلق اس خاندان سے ہے، جو اس سلسلہ میں بہت آگے رہا ہے، اور جو شرک و بدعت کے معاملہ میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے، میرا نسبی و روحانی اور ذہنی تعلق حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے ہے، جنھوں نے اس ملک میں احیاءِ توحید اور سنت کی دعوت کا

دعوت کا علم بلند کیا، اور اس کے لئے جان کی بازی لگادی اگر میری جرائت معاف کی جائے تو میں کہوں کہ آپ کے کیمپ میں بھی یہ خیال، اور یہ دعوت وحمیت اسی کیمپ سے آئی ہے، اس لئے مجھے یہ پوری تاریخ عزیز ہے، میں اس پورے ورثہ کو سینہ سے، بلکہ آنکھوں سے لگاتا ہوں، نہ اس پر شرمسار ہوں، اور نہ اس سے دست بردار، میری تمام تحریریں، میری حقیر کاوشیں، اور کوششیں سب اسی ورثہ کی حفاظت اس کی تبلیغ واشاعت، اور اس کی بازیافت میں صرف ہوئی ہیں ۔

میں کہ میری نوا میں ہے آتش رفتہ سراغ

میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

میرے کوتاہ قلم نے ''دعوت وعزیمت'' کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے، اور اس موضوع پر ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں، مجھ پر ان کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی ذمہ داری ہے کہ میں آپ کا احتساب کروں۔

آپ ان اسلاف کے نام لیوا ہیں جنھوں نے دین میں ادنیٰ تحریف اور مسلمانوں کے ادنیٰ انحراف کو برداشت نہیں کیا، آج معاملہ بدعات کا نہیں، آج معاملہ انگریزی تعلیم کا نہیں ہے، آج معاملہ ایک طرف شرک جلی، اصنام پرستی، اور دیومالائی عقائد (میتھالوجی) کا ہے، آج معاملہ برہمنی تہذیب اور ہندو معاشرت کے قبول کرنے کا ہے، دوسری طرف آج معاملہ مکمل لادینیت اور کمیونزم کے قبول یارد کرنے کا ہے، آج معاملہ ایک ایسی قوم کی حیثیت اختیار کرنے کا ہے، جس کی ساری وفاداریاں ووابستگیاں اس خاک کے ساتھ ہوں، جن سے ہمارے ظاہری جسم کا خمیر اٹھا ہے، اسی کے لئے جینا اور مرنا ہو، آج کا چیلنج اور آج کا خطرہ پچھلے تمام چیلنجوں، اور خطرات سے زیادہ سنگین ہے، اور اس کے قبول کرنے کے لئے کہیں زیادہ جرأت، کہیں زیادہ ایمان اور استقامت، اور کہیں ایثار وقربانی کی ضرورت ہے۔

موجودہ انقلاب کی برق رفتاری و ہمہ گیری

پہلے انقلاب بڑی سست رفتاری، اور آہستہ خرامی کے ساتھ آتا تھا، جیسا زمانہ تھا، ویسا ہی انقلاب بھی، وہ بیل گاڑیوں، ہاتھیوں اور اونٹوں، اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار گھوڑوں کا زمانہ تھا، اس وقت انقلاب انہیں سواریوں کی رفتار سے آتا تھا، پھر ریل چلی، انقلاب ریل پر سفر کر کے آنے لگا، ہوائی جہاز چلے انقلاب کی رفتار تیز ہوئی، اب انقلاب ایٹمی انرجی استعمال کرتا ہے، آواز سے زیادہ تیز جہازوں، اور ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ دم کے دم میں گھر گھر پہنچ جاتا ہے۔

جمہوریت وحکومت کے دائرہ کی وسعت

آج ''سلطانی جمہور'' کا زمانہ ہے، ہمارے اوپر پارلیمنٹ کی حکومت ہے، اور اس کو آئین سازی کا پورا اختیار، پھر حکومت کا دائرہ پہلے کی طرح دفاع، امن قائم کرنے، اور ٹیکس وصول کرنے تک محدود نہیں، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے، اور گھر اور باہر کی کوئی چیز اس کے دائرۂ اختیار سے خارج نہیں، رات پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس ہو جاتا ہے، اور آج سارے ملک میں اس کا نفاذ، اس وقت ہم اور آپ یہاں جمع ہیں، ممکن ہے، اس وقت پارلیمنٹ کا کوئی اجلاس ہو رہا ہو، وہاں ایک قانون بن جائے، اور ہماری زندگی میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو، آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیویٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں، ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، آزاد درسگاہوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا، آپ جسے پرسنل لا کہتے ہیں، یعنی شادی، بیاہ اور ترکے وغیرہ کا قانون، اس سے ان کو کوئی علاقہ نہیں تھا، تعلیم میں کسی خاص عقیدے، کسی خاص فکر و مقصد پر ان کو اصرار نہ تھا، اب دنیا بدل چکی ہے، آپ کو سمجھنا چاہئے کہ آپ کس

جگہ بیٹھے ہیں، زمانہ کے انقلاب نے آپ کو اس جگہ پر اچانک لا کھڑا کیا ہے؟ آپ آج اس محدود ماحول میں بہت خوش ہیں، آج آپ کو ہر طرف نورانی شکلیں نظر آتی ہیں، آپ کے کانوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے سوا کوئی صدا نہیں پڑتی، یہ آپ کا دارالحدیث ہے، وہ دارالتفسیر، یہ مسجد کا روحانی ماحول ہے، اور یہ مدرسہ کی علمی فضا، لیکن کل جب آپ یہاں سے جائیں گے، اور کل سے میری مراد یہ نہیں کہ جب آپ فارغ التحصیل ہو کر جائیں گے، بلکہ جب آپ چھٹیوں میں اپنے گھر جائیں گے، تو وہاں آپ کو بہت کچھ دنیا بدلی ہوئی نظر آئیگی، میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی چھٹیوں تک اس ملک میں کیا تغیرات ہو جائیں گے، اگر آپ نے اپنے گرد وپیش کی دنیا کا جائزہ نہ لیا تو آپ اس دنیا میں خود بیگانہ بن جائیں گے۔

اندرونی خطرہ

بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے، جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں ''مدعی سست گواہ چست'' کی مصداق ہے، وہ اگر کوئی بات ادھ کٹی، اور دبی زبان سے کہتے ہیں تو یہ اس کو ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے لئے تیار ہیں وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہاں کی مشترک تہذیب میں ضم ہو جانا چاہئے اور تمام امتیازات یہاں تک کہ عربی، اسلامی ناموں سے بھی چینی مسلمانوں کی طرح دست بردار ہو جانا چاہئے، وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو ہر اس چیز سے دست بردار ہونا پڑے گا، وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو ہر اس چیز سے دست بردار ہو جانا چاہئے، وہ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہم کو ہندوستان میں رہنا ہے تو اس چیز سے دست بردار ہونا پڑے گا، جس میں ''من وتو'' کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور جو مسجد وکلیسا میں امتیاز کرتی ہے، اس وقت جو ذہن ہندوستان کی قیادت کر رہا ہے، وہ ہر اس چیز سے بھڑکتا ہے،

جو کسی قسم کا امتیاز، اور تشخص پیدا کرتی ہے۔

تعین ووضاحت اسلام کا امتیاز

لیکن ہمارے دین کے حدود معین ہیں، ہمارے دین کے اس ''اکال الامم'' سرزمین میں اپنی جداگانہ شکل وصورت کے ساتھ باقی رہنے کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس میں آریائی مذاہب کی طرح اطلاقیت، یا تعینات سے گریز، اور رقت وسیالیت نہیں ہے، جس نے ہمہ اوست کے عقیدہ، یا وحدۃ ادیان کے فلسفہ کو جنم دیا، ہمارے یہاں کفر وایمان، شرک وتوحید، ضلالت وہدایت، اور حلال وحرام کے درمیان واضح طریقہ پر خط کھینچا ہوا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ق لَا انْفِصَامَ لَهَا (سورہ البقرہ : ۲۵۶)

''تو جو شخص سرکش سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی ہے، جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے''

وحدت ادیان نہیں، وحدت حق

وہ وحدتِ ادیان کا نہیں، بلکہ وحدت حق کا قائل ہے، یعنی سب دین ایک نہیں، بلکہ حق ایک ہے، وہ صاف اعلان کرتا ہے:۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۔

(سورۂ یونس : ۳۲)

''اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا ہے، تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔''

اس کا ایک واضح اور معین نظام عقائد ہے، اس کی ایک مستقل تہذیب

ہے، مکمل قانون، اور نظامِ معاشرت ہے، اس کے لئے اس کے صحیفہ میں صاف اعلان موجود ہے کہ:-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (سورۂ مائدہ : ۳)

"آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔"

یہاں نہ کوئی اپنے آپ کو دھوکا دے سکتا ہے، نہ دوسرے کو، یہاں دن کی روشنی ہے، جس میں سپید وسیاہ صاف نظر آتے ہیں۔

دو حقیقت بیں آنکھیں

عزیزو! مولانا محمد قاسم صاحب بانئ دارالعلوم، اور مولانا محمد علی صاحب مونگیری بانئ ندوۃ العلماء کو کس چیز نے تڑپایا؟ ایک کو یہاں، اور دوسرے کو وہاں، میں ان دونوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتا، میں ان کو ایک ہی چہرۂ زیبا کی دو آنکھوں کی طرح سمجھتا ہوں، دونوں روشن دونوں پاکباز، اور حقیقت بیں، ایک ہی نور باطن اور ایک ہی فراستِ ایمانی دونوں میں کام کر رہی تھی، دونوں ہی "اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله" کا مصداق تھے، دونوں تعلیمی مرکزوں میں نصاب ایک وسیلہ تھا، مقصد نہیں، اس کے اختلافات بنیادی حیثیت نہیں رکھتے، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور ان کے رفقاء کی تحریریں پڑھیے، ان کی نگاہ ان جزئیات سے بہت بلند تھی، اگر کوئی یہ سمجھے کہ انھوں نے عربی ادب کو غالب کرنے کے لئے یا تاریخ اسلام اور علوم عصریہ کو جگہ دینے کے لئے ندوۃ العلماء کی تحریک شروع کی تھی، تو اس سے بڑھ کر کوئی حق تلفی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتی، دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے فتنے کا مقابلہ کیا، ایک نے یہاں قلعہ تعمیر کیا، دوسرے نے وہاں، دونوں نے اپنے اپنے زمانہ کے چیلنج

کو قبول کیا، اور بدلے ہوئے زمانہ کے مطابق دین کے محافظ، حق کے داعی اور شریعت کے ترجمان پیدا کرنے کی کوشش کی، خدا ان دونوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب سے سرفراز فرمائے اور ان کے تمام رفقاء اور معاونین کو جزائے خیر دے، اور ہمیں ان کے صحیح مقاصد کے سمجھنے، اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اصلاح وتجدید کی تاریخ میں افراد کا مقام اور کام

میرے عزیزو! اسلام میں تجدید واصلاح کی پوری تاریخ، افراد کی اولوالعزمی کی تاریخ ہے، کہنے کو یہ ملی اور اجتماعی تاریخ ہے، اور بیشک ہے، لیکن عملاً یہ از اول تا آخر افراد کی صلاحیتوں، ان کے عزم وہمت کی نمود ہے، جب کبھی اسلام کے لئے موت وحیات کی کوئی کشمکش پیش آئی، جب کسی طرف سے دین اسلام کو للکارا گیا تو کوئی فرد کامل، کوئی صاحبِ عزم ہستی سامنے آگئی، ایسے موقع پر نہ کوئی کونسل بیٹھتی تھی، نہ کوئی مشورہ ہوتا تھا، کوئی صاحب یقین سامنے آجاتا تھا، اور حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیتا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، اور سیدنا حسن بصریؒ سے لے کر خاندان ولی اللٰہی اور ان دینی مرکزوں کے بانیوں، اور موجودہ دینی دعوتوں اور کوششوں کے علمبرداروں تک سب کا معاملہ یہی ہے کہ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کا کارنامہ

اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق بالکل صحیح کہا تھا کہ ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

انہیں کی کوششیں تھیں کہ ہندوستان کا رشتہ دین حجازی، اور محمد عربی صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے کٹنے نہیں پایا، اور وہ تہذیبی لحاظ سے برہمنیت، اور فکری واعتقادی لحاظ سے ویدانت کے آغوش میں جانے کے بجائے اسلام وشریعت محمدیؐ کی تحویل اور امانت میں رہا، انہیں کا مخفی ہاتھ تھا، جس نے اکبر کے تخت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب جیسے غیور اور فقیہ بادشاہ کو بٹھایا، پھر اس ملک میں تجدید واحیاء دین کا جو کچھ کام ہوا، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کا کارنامہ ہے، کیا دیوبند یا سہارن پور، کیا دہلی، کیا لکھنؤ ہم سب انہیں کے خوان نعمت کے ریزہ چیں ہیں، دار العلوم، مظاہر علوم، اور ندوہ اور کتاب وسنت کی تعلیم کی سب درسگاہیں[1] اسی ایک چراغ سے روشن کئے ہوئے ہیں، ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اخلاف نامدار، اور ان کے تلامذۂ باکمال پر ختم ہوتا ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

دیوبند کے طلبہ کی ذمہ داری

آپ اس مدرسہ میں تعلیم پا رہے ہیں، اس مدرسہ کا آپ سے مطالبہ ہے کہ آپ اِس مسلمان، پاکستان کے مسلمان، ملایا کے مسلمان اور افغانستان کے پٹھان کا بھی ہے، یہ حق کوئی نہیں چھین سکتا۔

ایک ہاشمی قریشی کے مقابلہ میں جس نے اپنی بدقسمتی سے حضرت ابراہیمؑ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا رشتہ کاٹ دیا ہو وہ برہمن زادہ ہزار ہا درجہ افضل ہے، جس نے اپنا روحانی، ایمانی، اخلاقی، عقلی اور تہذیبی رشتہ سیدنا ابراہیم اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم کرلیا۔

(۱) مثلاً جماعت اہل حدیث کے مدراس، جو بنارس، دربھنگہ، مئو وغیرہ میں قائم ہیں۔

کیا خوب کہا سنوسی نے ایک روز شریف مکہ سے
تو نام ونسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اگر ایک ہندوستانی کا دل حجازی ہے، تو اس ہاشمی سے ہزار درجہ اچھا ہے جو اپنے خاندان اور نسب پر، یا جاہلیتِ عرب پر فخر کرتا ہے، جو ابوجہل اور ابولہب کی اولاد ہونے پر فخر کرتا ہے، اور ملّتِ ابراہیمؑ کی تہذیب اور خصوصیات سے اس کو کوئی دل چسپی نہیں ہے۔

اسی بناء پر علامہ اقبال نے جو ایک نومسلم خاندان کے چشم و چراغ تھے، ایک سیدزادہ کو خطاب کرتے ہوئے دین وشریعت کی پیروی کی اس طرح تلقین کی۔

میں اصل کا خاص سومناتی
آباء میرے لاتی ومناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد   میری کفِ خاک برہمن زاد
دیں مسلک زندگی کی تقویم   دیں سر محمدؐ و براہیم
دل در سخن محمدیؐ بند
اے پور علیؓ زبو علی چند؟

فانی رشتے

دنیا کے سب رشتے فانی ہیں، یہ تمام مادی رشتے باقی رہنے والے نہیں، نہ ہاشمی رہے گا نہ عربی، نہ ہندوستانی رہے گا نہ ملائی، نہ انڈونیشی رہے گا نہ جاوی، بس اللہ کا نام باقی رہے گا، اور اللہ کے لئے خلوص باقی رہے گا، نام ونسب کے اختلاف، اور خاندانوں کی کمتری اور برتری سب فانی اور ہیچ ہیں، اللہ تعالیٰ کو دین عزیز ہے، اخلاص اور للّٰہیت عزیز ہے، ابراہیمیت ومحمدیت عزیز ہے، اور اس کے باقی رہنے کا اللہ نے فیصلہ کیا ہے

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خر گاہی ہو یا اعرابی والا گہر

ہمارے دو فیصلے

ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت بدل نہیں سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری یا بے چارگی پر مبنی نہیں، ہم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، اور اپنی پوری مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت، اور دستور و آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم اپنی خصوصیات، اپنے عقائد و شعائر، اپنی زبان و تہذیب، اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو عزیز ہیں، اس ملک میں رہیں، اس لئے کہ اس طرح رہنے سے یہ وطن، وطن نہیں، بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی عزتوں، اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا خمیر ضرور اس ملک کی خاک سے تیار ہوا ہے، اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے، لیکن ہماری تہذیب ابراہیمی ہے، اور مسلمان جس ملک میں بھی رہے گا، اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی ہوگی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و

ترقی میں شریک، اوراس کی دستور سازی میں دخیل ہیں، اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے، اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلے۔

زندگی اور موت اسلام پر

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام وایمان پر قائم رہنے کی کوشش کریں، اسی پر زندگی گذاریں، اور جب موت آئے تو اسی دین و ملت پر آئے:-

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُم مُّسْلِمُوْنَ۔ (سورہ آل عمران:۱۰۲)

"تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"

اسی کی وصیت ابراہیم ویعقوب علیہم السلام نے اپنی اولاد کو کی:-

وَوَصّٰی بِهَا اِبْرَاهِمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوْبُ ط يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُم مُّسْلِمُوْنَ ،

(سورہ البقرہ : ۱۳۲)

"اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی تھی، اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو کی، انہوں نے کہا تھا کہ میرے بچو! اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے، لہذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔"

شریعت اسلامی نے ایک مسلمان کے لئے پیدائش سے لے کر موت تک اس کے انتظامات کئے ہیں، اور ایسا ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں مسلمان اس حقیقت کو فراموش نہ کرنے پائے، اس کو ہر وقت یاد رہے کہ اس کا تعلق

اس دین وملت سے ہے، جس کے داعی ابراہیم ومحمد علیہما السلام تھے، جس کی بنیاد توحید پر ہے، اور وہ ایک الگ ''اُمت'' ہیں، مسلمان بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے، اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے، اس کا اسلامی نام رکھا جاتا ہے، ناموں میں ان ناموں کو ترجیح دی گئی ہے، جن میں عبدیت وحمد کا اظہار ہے، اس سے ابراہیمی سنتیں ادا کرائی جاتی ہیں، اور جب وہ مرتا ہے تو سب اسکے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنے لئے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں:

"اللهم من احييته منا فاحيه على الاسلام و من
توفيته منا فتوفه على الايمان"

''اے اللہ ہم میں سے تو جس کو زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ
رکھیو، اور جس کو تو موت دے تو اس کو ایمان کے ساتھ دنیا سے
اٹھائیو''

یہاں تک کہ قبر میں اتارتے ہوئے آخری ٹھکانے پر پہنچاتے ہوئے بھی یہی الفاظ زبان پر ہوتے ہیں:-

"بسم الله و على ملة رسول الله"

اللہ کے نام اور رسول اللہ کے دین وملت پر

اس سب کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے کہ ملت ابراہیمی اور اُمت محمدی کے فرد، اور ایک مخصوص شریعت اور آئین ومسلک زندگی کے پیرو، اور خدا کے موحد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین ومسلک کی وفاداری میں گذرے، اور ہمیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجودہ نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن رہیں، اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراط مستقیم پر چلیں۔

ملّتِ ابراہیمی اور دین محمدی کی اس دعوت کو آج صراحت اور تعین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہ اس تہذیب کی دعوت ہے، جس کی بنا ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی ہے، اور تکمیل و تجدید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اجتماع و اخلاق میں اس کے کچھ معین اور خاص اصول ہیں، یہ فرد کی حریت اور فلاح کی ضامن ہے، چند معین عقائد، معین اصولوں اور معین کرداروں نے اس کو وجود بخشا ہے، یہ ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشترکہ دعوت اور میراث ہے، اور اس کے سوا کوئی تیسری چیز خدا کو قبول نہیں۔

نازک امانت

آج مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کا بھی امتحان ہے، اور ذہانت کا بھی، قوتِ فیصلہ کا بھی امتحان ہے اور زندگی کی صلاحیتوں کا بھی، ہم کو ثابت کرنا ہے کہ ہم ایمان کے ساتھ زندہ رہنے کے اہل ہیں یا نہیں، ہم جہاں رہیں اس ملک کی خصوصیات اپنے اندر خوشی سے پیدا کریں، وہاں کی زبانیں سیکھیں، اور بچوں کو پڑھائیں، اپنا حصۂ رسدی حاصل کریں، ملک کے نظم و نسق (ایڈمنسٹریشن) (Administration) میں اپنے شایانِ شان حصہ لیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ داعی بھی رہیں، مومن بھی رہیں، توحید کا اعلان بھی کریں، اور پیغام پہنچانے والے بھی بنیں، خدا کے یہاں ہم سے سوال ہوگا کہ اللہ نے ہم کو سیکڑوں برس اس ملک میں باقی رکھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ اور محمد رسول اللہ ص کی دعوت، اور آپ کا دین کیوں ہمارے اندر محدود رہا، اس کو پھیلنا اور وسیع ہونا چاہئے تھا۔

قوم موسیٰ کی تقلید سے بچیے!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کا ایک عبرت

انگیز واقعہ بیان کیا ہے، جس میں ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے، اس کو خود قرآن مجید کی زبان سے سنئے:-

وَجَاوَزْنَا بِبَنِیٓ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰٓی اَصْنَامٍ لَّھُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ ط قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ۔ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰھًا وَّھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۔

(سورہ الاعراف : ۱۳۸ تا ۱۴۰)

"بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گذار دیا، پھر وہ چلے اور راستہ میں ایک ایسی قوم پر ان کا گذر ہوا جو اپنے چند بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی، کہنے لگے "اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں" موسیٰ نے کہا "تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو، یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں، وہ تو برباد ہونے والا ہے، اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے، پھر موسیٰ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں" حالانکہ وہ اللہ ہی ہے، جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ بنی اسرائیل کو اپنی صحیح معرفت عطا فرمائی اور توحید کی اس دولت سے نوازا جس سے بڑی کوئی دولت نہیں، ان کے اندر ایمان پیدا کیا، وہ یہ سمجھے کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کوئی پرستش اور بندگی کے لائق نہیں، اور اس کے سوا اس دنیا میں کسی کی حکومت نہیں، لیکن وہ ایسے ناقدردان اور

نادان تھے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایک میلہ دیکھا کہ جس میں خدا کے سوا اور ہستیوں کو لوگ پوج رہے تھے، اس منظر کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا کہ اگر ہمارے لئے بھی ایسی ہی معبود تجویز کردیئے جاتے جن کے سامنے ہم اپنے ذوقِ عبودیت کا اظہار کرتے تو کیسی رونق اور بہار ہوتی، انھوں نے کہا:۔

یَا مُوْسَی اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ

(سورہ الاعراف: ۱۳۸)

''اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود بنادے جیسے ان لوگوں کے لئے معبود ہیں۔''

اے موسیٰ ہمارے لئے ایسے ہی کوئی ظاہری اور مجسم شکل میں معبود تجویز کر دیجئے، جیسا کہ ان کے پاس ہے، اپنے وقت کا موحدِ اعظم بولا ''اِنَّـكُـمْ قَـوْمٌ تَـجْـهَـلُـوْنَ'' تم پرلے درجہ کے نادان ہو، تمہاری عقل پر پتھر پڑے ہیں، تمہیں نظر نہیں آتا؟ ''اِنَّ هٰـؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'' جو یہ کر رہے ہیں وہ خاک میں مل جانے والا ہے، وہ کچھ کام آنے والا نہیں، اس کے بعد انھوں نے ذرا سمجھا کر کہا:۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ

(سورہ الاعراف: ۱۴۰)

''پھر موسیٰ نے کہا: کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمہارے لئے تلاش کروں؟ حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔''

اللہ کے بندو! خدا تمہارے حال پر رحم کرے، خدا تمہیں عقل اور سمجھ دے، ''اَغَيْـرَ اللّٰهِ اَبْـغِـيْـكُـمْ اِلٰـهًـا'' میں خدا کو چھوڑ کر تمہارے لئے اور کوئی خدا لاؤں؟

"وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ" حالانکہ اس نے تم کو تمام دنیا پر (اسی عقیدۂ توحید کی بناء پر) فضیلت دی ہے، اور تم کہتے ہو کہ اس فضیلت دینے والے، احسان کرنے والے خدا کو چھوڑ کر جس نے فرعون کی غلامی سے تم کو نجات دی، میں کوئی عاجز اور بے اختیار تمہارے سامنے لے آؤں۔

دائمی جدوجہد

ایک خصوصیت خاندان ابراہیمی کی یہ ہے کہ جہاں رہے گا، حق کے لئے سینہ سپر رہے گا، توحید کی صدا بلند کرتا رہے گا، اللہ کے راستہ کی طرف سب کو بلاتا رہے گا، یہ سعادت قیامت تک کے لئے ملت ابراہیمؑ کے لئے مقرر اور مقدر ہو چکی ہے، جس نے اللہ کے نام کا جھنڈا بلند کیا، دنیا کے کسی گوشہ اور کسی حصہ میں آپ اگر سراغ لگائیں گے اور تحقیق کریں گے تو سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا رشتہ ملتا ہوگا، دنیا میں بار بار جنگیں ہوئیں، ماضی قریب میں دو عالمگیر جنگیں ہو چکی ہیں، اور وہ دنیا پر سخت تباہی لائیں لیکن ان میں سے کوئی خاندان ابراہیمی کی جنگ نہیں تھی، اس جنگ میں خاندانِ ابراہیمی کی کوئی شاخ فریق نہیں تھی، یہ پیٹ کے لئے تھی، یہ بازاروں کے لئے تھی، مارکیٹ حاصل کرنے کے لئے تھی، حکومت اور اقتدار کے لئے تھی، یہ ہوا و ہوس کی جنگ تھی، اس لئے کہ یہ ملت ابراہیمی کی طرف سے نہیں لڑی گئی تھی۔

آج ساری دنیا میں جس کو دیکھیں گے کہ وہ اللہ کے نام کی رٹ لگاتا ہے، خود بھی لیتا ہے، دوسروں کو بھی تلقین کرتا ہے، اگر تحقیق کریں گے تو وہ ابراہیمی و محمدی نکلے گا اس کا تعلق دور سے یا قریب سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکلے گا، یا ان کی صلبی اولاد میں ہے، یا ان کے داعیوں اور مُنادیوں کے ذریعہ وہ ان کے معنوی خاندان میں داخل ہو چکا ہے، قیامت تک کے

لئے توحید کا اعلان، قیامت تک کے لئے ایمان کی دعوت، قیامت تک کے لئے خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی دعوت، قیامت تک کے لئے دینی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ نے خاندانِ ابراہیمی کے سُپرد کردیا ہے، ہر جگہ، ہر زمانہ میں، خاندانِ ابراہیمی کا کوئی سر پھرا ملّاح موجوں سے ٹکراتا رہے گا، دھارے کے خلاف کشتی کو چلاتا رہے گا، بازو شل ہوجاتے ہیں، پتوار جواب دے جاتے ہیں، موجیں گستاخیاں کرتی ہیں، مگر خاندانِ ابراہیمی کا ملّاح ہے کہ ؂

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ [

"عرصہ دراز سے صورت اسلام معرکہ آرا ہے اور شکست پر شکست کھا رہی ہے اور حقیقت اسلام مفت میں بدنام اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو رہی ہے، دنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم اسلام کو شکست دے رہے ہیں، اس کو خبر نہیں کہ حقیقت اسلام تو مدت سے میدان میں آئی ہی نہیں، اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی صرف صورت ہے نہ کہ اسلام کی حقیقت۔ دنیا میں بھی فتح ونصرت تائید واعانت کے وعدے حقیقت ایمان ہی کے ساتھ مشروط ہیں، قرآن صاف فرماتا ہے: ولاتھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ (سست وغمگین نہ ہو، تم ہی سربلند ہو اگر تم (حقیقۃ) صاحب ایمان ہو۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں خطاب مسلمانوں ہی کو ہے لیکن پھر بھی شرط لگائی ہے کہ اگر تم میں حقیقت ایمان پائی جاتی ہے تو پھر تمہاری سربلندی میں شک نہیں۔ پس اس وقت سب سے بڑا کام اور امت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کے عموم اور سواد اعظم کو صورت سے حقیقت کی طرف سفر کرنے کی دعوت دی جائے، صورت اسلام میں روح اسلام اور حقیقت اسلام پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اس وقت کی سب سے بڑی احتیاج یہی ہے اسی سے اس کے سب حالات اور اس کے نتیجہ میں دنیا کے حالات بدلیں گے، دنیا کے حالات اور اس امت کے حالات اس حقیقت کے تابع ہیں، یہ امت حضرت مسیح (علیہ السلام) کے الفاظ میں زمین کا نمک ہے دیگ کا مزا نمک کے تابع ہے اور نمک کا مزا اس کی نمکینی پر موقوف ہے، اگر نمک کی نمکینی ختم ہو جائے تو وہ نمک کس کام کا؟ اور پھر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے والی چیز کہاں سے آئے گی؟ آج ساری زندگی بے کیف اور بے روح ہے اس لئے کہ اس امت کی بڑی تعداد حقیقت سے عاری اور روح سے خالی ہے، پھر زندگی میں روح اور حقیقت کہاں سے آئے گی؟"

کل مسلمان اور مکمل اسلام

الحمد للّٰہ رب العالمین ،والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم الیٰ یوم الدین ۔ اما بعد!

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ط اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ہ

(سورۃ البقرۃ ۔۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔''

اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکْماً لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ہ (سورۃ المائدہ ۔۵۰)

تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ یقین رکھنے

والے ہیں ان کے یہاں اللہ سے بہتر اور کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔

حضرات! میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی دو آیتیں پڑھی ہیں، بہت سے تعلیم یافتہ حضرات کو اور خاص طور سے جو قرآن مجید سے تعلق رکھتے ہیں، وہ شاید سوچتے ہوں کہ ان آیتوں کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور اس مقصد سے اس کا کیا تعلق ہے، لیکن یہ دو آیتیں زندگی کے لئے بلکہ پوری کائنات کے لئے اور زندگی کی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اور خاص طور سے امت اسلامیہ کے لئے یہ دو آیتیں مستقل ایک درس گاہ ہیں اور مستقل ایک دعوت فکر ہیں۔

اسلام اور جاہلیت کا فرق

حضرات! سارا مسئلہ اسلام اور جاہلیت کے فرق کا ہے اب میں معذرت کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں ہمارے بہت سے پڑھے لکھے بھائی بھی ''اسلام و جاہلیت'' کے فرق کو بھول چکے ہیں، چونکہ جاہلیت ان کے نزدیک ختم ہو چکی ہے، زیادہ تر ''جاہلیت عربیہ'' ان کے ذہن میں ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ جاہلیت اور اسلام کی کوئی کشمکش اب نہیں ہے، اور اسلام و جاہلیت کے فرق کو سوچنا اور اس کا جائزہ لینا گویا ایک طرح سے تضیع اوقات ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملت میں جو بھی کمزوریاں اور خرابیاں ہیں وہ سب اس فرق کو فراموش کر دینے کا نتیجہ ہے جو اسلام اور جاہلیت کے درمیان ہے، پہلی جو آیت پڑھی وہ سورہ بقرہ کی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝

(سورۃ البقرۃ۔۲۰۸)

اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

اے ایمان والو! تم ''سلم'' میں داخل ہو جاؤ اور ''سلم'' کا ترجمہ میں نے مستند اور معتبر تراجم میں دیکھا حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولوی فتح محمد صاحب جالندھریؒ تک سب میں ''سلم'' کا ترجمہ اسلام سے کیا گیا ہے، شاہ صاحبؒ کے ترجمہ میں ''مسلمانی'' سے کیا گیا ہے، یعنی اے ایمان والو! مسلمانی اور اسلام میں داخل ہو جاؤ'' وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ'' اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اسلام بالکل ایک امتیازی شان رکھتا ہے

پہلی بات یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے کی ضرورت ہے، میں معذرت کے ساتھ یہ بات عرض کروں گا، بہت سے حضرات کے ذہن میں جنہوں نے تقابلی مطالعہ نہیں کیا ہے، اور مذاہب کی تاریخ پر ان کی نظر نہیں ہے، ان کے ذہن میں شاید یہ بات مستحضر اور تازہ نہیں ہوگی کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے دنیا کا، جو ایک اصول وعقیدہ اور مسلک زندگی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، ورنہ جتنے مذاہب ہیں وہ سب (مذاہب کے بانی نہیں کہتا اور نہ کوئی مذہب کا بانی ہوتا ہے) مذاہب کے داعیان اول کے نام پر یا ملکوں کے نام پر، یا طبقوں اور نسلوں کے نام پر وہ مذاہب ہیں، مثال کے طور پر (مجھے معاف کیا جائے) یہودی مذہب ہے، اس کی نسبت یہودا کی طرف ہے جو خاندان نبوت کے ایک فرد تھے، عیسائی، اس کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے، پھر مجوسی، وہ پارسی کہلاتے ہیں، فارس (ایران) ایک ملک ہے، کوئی عقیدہ یا

کوئی طرز زندگی یا دعوت الٰہی نہیں ہے، ہندویت، ہند ایک ملک ہے اور وہ اس کی طرف منسوب ہے، برہمنیت، الگ طبقہ اور ایک خاص نسل کی طرف منسوب ہے، بدھ مت گوتم بدھ کے نام سے موسوم ومشہور ہے، ایسے ہی جینی مذہب۔

واحد مذہب جو ایک مسلک زندگی، عقیدہ اور نبوت کی طرف منسوب ہے، وحی الٰہی اور اللہ کی براہ راست رہنمائی اور اس کے دیئے ہوئے احکام اور شریعت کی طرف منسوب ہے، وہ اسلام ہے تو اسلام کا پورا دار ومدار عقیدہ پر ہے، شریعت پر ہے، اور وہ بالکل ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔

سو فی صدی اسلام

اب اس کے بعد سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

يَآ يُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ كَآفَّةً الآیۃ۔

اے ایمان والوں! اسلام اور مسلمانی میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس میں یہ بات لحاظ کرنے کی ہے کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ سو فی صدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہئے، مسلمان بھی سو فی صدی ہوں، اور اسلام بھی سو فی صدی ہو، نہ مسلمانوں میں کوئی تحفظ یا ریزرویشن (Reservation) ہے، نہ اسلام میں کوئی تحفظ، استثناء یا ریزرویشن ہے، یہ ایک نکتہ ہے جس کو آپ ساتھ لے کر جائیں اور اس کی اشاعت کریں، خدا کا مطالبہ اور قرآن مجید کی صریح آیت ہے کہ سو فی صدی مسلمانوں کو سو فی صدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے اور مذاہب کی طرح نہیں کہ عقائد لے لئے اور سب کچھ چھوڑ دیا، یا عبادت لے لئے اور اس کے زندگی کے قانون اور زندگی کے طرز حیات اور طرز معاشرت سے اور باہمی حقوق اور فرائض سے اور شرعی قانون پر چلنے سے تعلق نہیں ہے، ہر مذہب نے ایک ایک حصہ لے لیا

ہے، کسی نے دو لیا ہے کسی نے تین، یہاں مطالبہ یہ کیا جارہا ہے کہ سو فی صدی مسلمانوں کو سو فی صدی اسلام میں داخل ہو جانا چاہئے، مسلمانوں میں تحفظ اور ریزرویشن نہیں ہے کہ مسلمان پچاس فی صدی کے پابند ہیں اور قائل ہیں، اور عامل ہیں، اور پچاس فی صدی سے مستثنیٰ ہیں یا ۷۵ فی صدی رکھ لیجئے، یہاں تو مطالبہ ہے کہ سو فی صدی اسلام ہونا چاہئے، ایک فی صدی بھی خارج نہیں ہونا چاہئے، کسی قسم کے استثناء یا رعایت یا کسی قسم کا خصوصی معاملہ نہیں کیا گیا ہے، ہم کو ملت اور اپنا جائزہ لینے کا ایک رہنما اصول دیا گیا ہے، بلکہ پیمائش کا آلہ دیا گیا ہے، پہلا مطالبہ اللہ کا یہ ہے اور قرآن مجید کا صریح حکم یہ ہے کہ سو فی صدی مسلمانوں کو سو فی صدی اسلام میں داخل ہونا چاہئے نہ تو یہ کہ پڑھا لکھا طبقہ مستثنیٰ ہے اور نہ شریف النسب اور عالی نسب لوگ مستثنیٰ ہیں، یہاں تک کہ حاکم بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، کسی بڑے سے بڑے حاکم (جو تصور اسلام میں حاکم یا خلیفہ کا ہے) کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ وقت، کسی بڑے سے بڑے سربراہ مملکت اور کسی بڑے سے بڑے قانون ساز، کسی بڑے سے بڑے فاتح اعظم، کسی کے لئے بھی کوئی استثناء نہیں ہے کہ اس کو نماز پڑھنے کی فرصت نہیں اس کو نماز سے مستثنیٰ کیا جائے، فلاں کو حج سے مستثنیٰ کیا جائے، کسی کو ہرگز یہ اجازت نہیں کہ جس پر حج فرض ہے اور وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے وہ حج چھوڑے۔

اسی طریقہ سے "عائلی قانون" کہ سب مسلمان اس کے پابند ہیں، ترکہ اور میراث کے قانون کے سب مسلمان پابند ہیں، یہ بات چونکا دینے والی ہے، ایک تازیانہ ہے ہمارے لئے اس وقت ساری چیزیں اس کے ماتحت آجاتی ہیں، ہمارا یہ اصلاح معاشرہ کا اجلاس، اس کی تقریریں اور اس کی وضاحتیں، اس کے مشورے سارے کے سارے اس کے اندر آجاتے ہیں کہ "یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا

فِی السِّلْمِ کَآفَّةً " " اے ایمان والو! اسلام اور مسلمانی میں پورے پورے داخل ہو جاؤ" اس کا مطلب یہ ہے کہ سو فی صدی مسلمان اور سو فی صدی اسلام ہونا چاہئے اگر آپ آزادانہ مطالعہ کریں، منصفانہ مطالعہ کریں، اور تقابلی مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج مسلمانوں میں اس طرح کی تقسیم پائی جاتی ہے کہ اس دین کے قبول کرنے والوں میں بھی استثناء اور تحفظ ہے، ریز رویشن ہے، اور رعایتیں ہیں، اور اس دین میں بھی تقسیم ہے، اس طبقہ کے لئے دین کا فلاں حصہ مناسب ہے، اس طبقہ کے لئے مناسب نہیں، اس پر وہ عمل نہیں کر سکتا، تنہا یہ بات کافی ہے، اس آیت کی رو سے اس کی گنجائش ہی نہیں کہ عقائد ہم لیں گے، اور عبادات چھوڑیں گے، عقائد اور عبادات بھی لیں گے لیکن معاملات چھوڑیں گے، معاملات بھی لیں گے لیکن عائلی قانون کو چھوڑیں گے، اس میں کسی چیز کی اجازت نہیں، اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں اور اس کو اپنے ساتھ لے کر جائیں تو یہ عمر بھر کے لئے کافی ہے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ سو فی صدی اسلام میں داخل ہوں، اب آپ اپنا محاسبہ کر لیجئے اور کرتے رہئے کہ کیا آپ نے سو فی صدی اسلام کو قبول کیا، اور سو فی صدی آپ اسلام پر عمل کر رہے ہیں؟ کیا آپ کی معاشرت بھی اسلام کے مطابق ہے، آپ کا معاشرتی نظام ہے، آپ کے رواجات اور آپ کی رسوم اور آپ کا جو معاشرتی، اجتماعی، خانگی نظام ہے، تاریخ ہے، اور آپ کے خاندانوں میں جو رسمیں اور معمولات رائج ہیں، آپ صرف ان کا خیال رکھیں کہ آپ اس معیار پر اترتے ہیں، اور آپ اس کو پورا کرتے ہیں؟ آپ اس کے بعد احکام شریعت کو نظر انداز کر دیں گے جو معیاری و مثالی مسلمان تھے اور جو قیامت تک نمونہ رہیں گے، وہ ان احکام اور ہدایات کو کس طرح پورا کرتے تھے، ان تقریبات اور زندگی کے ان مواقع سے کس طرح سے گذرتے تھے؟

ضرورت ہے کہ صحابہ کرامؓ کی عائلی زندگی کا مطالعہ اور اس پر عمل کیا جائے

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کوئی خالص روحانی جماعت نہیں تھی، یہ بات نہیں تھی کہ ان کو صرف عقیدہ کی ضرورت تھی، آپ ان کا مطالعہ کریں، سیرت اور احادیث کی کتابوں میں مساجد کا حال پڑھیں، ان کی نمازوں کا حال پڑھیں، ان کی تہجد گذاری اور شب بیداری کو تو دیکھیں، لیکن ان کی تقریبات کو نہ دیکھیں، یہ بھی اس روح کے خلاف ہوگا جو روح ہمیں اس آیت سے ملتی ہے کہ " اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً "دین کو ہمیں پورے طور پر اپنے اندر جذب کرنا چاہئے اور اپنے کو دین کے تابع بنانا چاہئے، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، حیات مبارکہ اور صحابہ کرامؓ کے حالات اور سیرت کا مطالعہ بھی اسی وسیع نظر سے کرنا چاہئے۔

عرصہ سے یہ غلطی ہو رہی ہے، پورے عالم اسلام میں اور خاص طور پر ہمارے ملک میں کہ ہم صحابہ کرامؓ، اولیاء اکرام، علماء ربانیین، اور مصلحین ومجددین سب کے حالات میں صرف اس حصہ کو پڑھتے ہیں، جس کا تعلق عقیدہ سے ہے، عبادات سے ہے، ہم ان کی شادی بیاہ کی تقریبات کا مطالعہ نہیں کرتے کہ کس طرح انہوں نے انجام دیں، ہم ان کی عائلی زندگی کا خانگی زندگی کا، مطالعہ نہیں کرتے کہ وہ گھر میں کیسے رہتے تھے، اسی طرح نکاح وطلاق کے جو مسئلے ان کو یا ان کی اولاد کو پیش آتے تھے، وہ ان کو کس طرح حل کرتے تھے، جس طرح ان مسلمانوں کے بارے میں ایک تحفظ اور ریزرویشن ہے، ویسے ہی تاریخ کے بارے میں بھی الگ ریزرویشن ہے کہ ہم کتاب کے صرف ان ابواب کو کھولتے ہیں جس کا تعلق عبادات

سے ہے، ذکر واذکار سے ہے، یادالٰہی سے ہے، ان کے روحانی اثرات سے ہے، ان کی تبلیغ اور انفرادی کارناموں سے ہے،ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی شادیاں کیسے ہوتی تھیں، ان کا ترکہ کیسے تقسیم ہوتا تھا، جب طلاق کی ضرورت ہوتی تو وہ کس طرح طلاق دیتے تھے۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ

میں ایک واقعہ صحابہ کرامؓ کے صدہا واقعات میں سے بیان کرتا ہوں، وہ واقعہ آنکھ کھول دینے والا ،اور ایک طرح سے چونکا دینے والا ہے، بلکہ ایک طرح سے وہ ایک ذہنی زلزلہ پیدا کرتا ہے،آپ خیال فرمایئے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ مہاجر ہیں، اور اتنا ہی نہیں بلکہ عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، عبدالرحمٰن خیریت تو ہے، آج تمہارے کپڑوں پر خوشبو نظر آرہی ہے، فرمایا ہاں اللہ کے رسولؐ میں نے شادی کرلی ہے، حیرت کی بات یہ ہے (میں حدیث کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور جو مستند علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی تصدیق بالکل کافی ہے) یہ عرض کررہا ہوں، پہلے آپ اپنے ذہن کو متوجہ اور بیدار کیجئے، یہ ایک ہلا دینے والا واقعہ ہے، ایک زلزلہ لے آنے والا واقعہ ہے کہ اللہ کے رسول خاتم النبیین سید المرسلین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین مدینہ طیبہ کے اندر موجود ہیں، اور میں آپ کو اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر بتاتا ہوں، سیاحتوں کی بناء پر کہ جب کوئی برادری کہیں ترک وطن کرتی ہے تو عام طور پر ایک جگہ رہنا پسند کرتی ہے، مثلاً ہندوستان کے میمن اور خوجے جو بمبئی میں تجارت کرتے تھے، ان کو آپ تلاش کریں تو وہ سب آپ کو کراچی میں ملیں گے، اگر آپ ان کو تلاش کرنا چاہیں تو کراچی میں تلاش کرلیجئے، پڑھے لکھے لوگ ادیب شاعر اگر ملیں گے تو لاہور، اسلام آباد، اور

راولپنڈی میں ملیں گے، جو علمی مرکز ہیں، تو اس میں شہر نہیں بلکہ محلہ کی تخصیص کر کے کہتا ہوں کہ یہ مہاجرین جو مکہ معظمہ سے آئے تھے، وہ مدینہ طیبہ کے خاص حصہ اور علاقہ بلکہ ایک جوار میں سکونت پذیر ہوئے ہوں گے کچھ روایات ہوتی ہیں، کچھ عادتیں ہوتی ہیں، مستورات کا ملنا جلنا ہوتا ہے، اور کچھ پچھلے واقعات ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں مشترک ہوتی ہیں، اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ قریب ہی رہیں، تو یہ بھی یقینی بات ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مکانی فاصلہ کے لحاظ سے بھی زیادہ دور نہیں رہے ہوں گے، لیکن حیرت کی بات ہے، جس پر آدمی محو حیرت ہو جائے اور اس پر ایک سکتہ طاری ہو جائے کہ مدینہ طیبہ میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسا مہاجر اور جلیل القدر صحابی نکاح کرتا ہے، اور اللہ کے رسولؐ موجود ہیں، کم فاصلہ پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، کچھ نہیں تو برکت ہی کے لئے، آج حال یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ بھائی برکت کے لئے آجائیے، آپ کا قدم پہونچ جائے، یہ مولویوں سے کہا جاتا ہے، اور نیک دیندار لوگوں سے کہا جاتا ہے، آخر عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو یہ خیال کیوں نہیں ہوا کہ میں نکاح کر رہا ہوں اور اللہ کے رسولؐ یہاں اتنے قریب موجود ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زحمت نہ دوں، اس سے بڑھ کر ناشکری کیا ہو سکتی ہے، ناقدری کیا ہو سکتی ہے، بے ادبی کیا ہو سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ ان کی نظر میں ایسا تھا کہ ان کو ایک لفظ بھی معذرت کا کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ کہیں کہ یا رسول اللہ معاف فرمائیے، مجھے بالکل خیال نہیں رہا، یا فلاں بات مانع ہوئی، اور اسی طرح حیرت کی بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک لفظ شکایت کا نہیں فرمایا، حدیث کا دفتر موجود ہے، ہندوستان کے عظیم کتب خانوں میں یہاں کا کتب خانہ بھی ہے، میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ بتائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شکایت کی

ہو کہ عبدالرحمٰن تم ہمیں بھول گئے، بات کیا تھی عبدالرحمٰن کا تفقہ اوران کی فراست تھی، ان کی ذکاوت تھی، اوران کی حقیقت شناسی تھی کہ انھوں نے سوچا کہ جتنی دیر میں حضورؐ کو تکلیف دوں گا معلوم نہیں کتنے لوگ آئیں اور اسلام قبول کریں، اور سب سے بڑی دولت جو نجات کا باعث ہے وہ اس کو حاصل کریں، ہم اس کے بجائے کہ آپ کو زحمت دیں آپ کو تکلیف دیں، اور وہ لوگ چلے جائیں کہ ہم پھر کبھی آئیں گے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقام عالی پر تشریف رکھیں، اور لوگ آئیں، ہدایت پائیں، کلمہ پڑھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام لائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کے نزول کی کوئی ڈائری روز نامچہ ہوتا، وہ روز نامچہ اس طرح تو ہے کہ یہ سورہ کہاں نازل ہوئی، کتنا پہلے نازل ہوا اور کتنا بعد میں، اگر ایسا ہوتا کہ (وقت شماری کے ساتھ، آیت شماری کے ساتھ) فلاں وقت یہ آیت نازل ہوئی اور فلاں وقت یہ آیت نازل ہوئی، کوئی اگر روز نامچہ لکھنے والا ہوتا تو یقین دلاتا ہوں کہ جتنی دیر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے نکاح کی مجلس میں شرکت میں گذرتی، اس میں اتنی آیتیں نازل ہوئیں۔

اسلام میں کوئی ریزرویشن نہیں ہے

تو ایک بات یہ ہے کہ اس آیت کو اپنے ساتھ لے کر جایئے، دماغ پر نقش کر کے لے جایئے کہ مطالبہ صرف اتنا نہیں ہے کہ اسلام قبول کرو، اور اسلام میں داخل ہو جاؤ بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ اسلام میں سو فیصدی داخل ہو جاؤ، تم بھی سو فی صدی ہو، اور اسلام بھی سو فی صدی ہو، نہ اس میں ریزرویشن، نہ اس میں ریزرویشن، اور آج کیا ہے کہ جو لوگ اسلام کی دولت سے مشرف ہیں، انھوں نے بھی تقسیم کر رکھی ہے کہ وہ دین کا وہ شعبہ لیں گے، اور دین کا وہ شعبہ چھوڑیں گے، اس کے وہ مکلّف نہیں، وہ ان کی طاقت سے باہر ہے۔

''اصلاح معاشرہ'' کی دعوت کا ایک اجمالی پیغام اور زندگی کا ایک رہنما اصول (جو زندگی کے تمام سرد و گرم اور نشیب و فراز اور مختلف النوع مرحلوں پر حاوی ہے) وہ یہ ہے " يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً " اے وہ لوگوں جو ایمان لائے ہو، اسلام میں داخل ہو جاؤ، مسلمانی میں شامل ہو جاؤ'' کآفة'' کا تعلق دونوں سے ہے، داخل ہونے والوں سے بھی ہے، اور جس دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، اس سے بھی ہے، وہ بھی کآفة یہ بھی کآفة اس طرح نہیں کہ مسجد جائیں اور ایک قدم مسجد کے اندر رکھا، بس ہم مسجد میں داخل ہو گئے، یا دونوں قدم اندر رکھ دے اور اندر نہ جائے، یا اندر تو جائے لیکن نماز نہ پڑھے یہ نہیں " اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً " پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اور عامل بن جاؤ'' داخل'' بھی بنو اور'' عامل'' بھی بنو۔

اس کے بعد دوسری آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ط وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْن " کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں، میں حکم کے متعلق عرض کر دوں، عربی زبان سے ایک خصوصی تعلق رکھنے والے انسان کی حیثیت سے، اور عربی ذخیرہ کی چھان بین کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بھی'' حکم'' کا لفظ قرآن مجید میں بڑا وسیع اور بلیغ ہے، حکم کے معنی صرف قانونی فیصلہ کے نہیں'' ترجیح'' و'' اختیار'' کے بھی ہیں، کسی چیز کو ترجیح دینا اور کسی چیز کو اختیار کرنا یہ بھی حکم میں شامل ہے، حکم کا لفظ ان سب معانی پر حاوی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا جاہلیت کے فیصلہ کو، کیا جاہلیت کے انتخاب کو، کیا جاہلیت کے رجحان کو، کیا جاہلیت کے اصول کو وہ ترجیح دیتے ہیں؟ وہ چاہتے ہیں وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ'' اللہ تعالیٰ سے بہتر حکم دینے والا ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں کون ہے؟

جاہلیت کا مفہوم

دوسری بات یہ ہے کہ جاہلیت کے معنی بھی اب بہت فراموش ہو گئے ہیں، بہت گہرا مطالعہ کرنے والوں اور جن کو سیرت نبویؐ پر اللہ تعالیٰ کچھ لکھنے اور تالیف کرنے کی سعادت عطا فرماتا ہے، وہ اس سے بحث کرتے ہیں، اور اس کا حق ابھی بہت کم ادا ہوا ہے، جاہلیت کے دور کی وسعت کو بہت کم لیا گیا ہے، میں کہتا ہوں ایک سیرت نگار کی حیثیت سے، اور ایک ایسے خوش قسمت انسان کی حیثیت سے جس کو اللہ نے سیرت کے موضوع پر لکھنے کی توفیق دی کہ جاہلیت کے مفہوم سے بھی ہمارا ذہن بہت نا آشنا ہو گیا ہے، جاہلیت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف جاہلیت عربیہ مراد ہے، اور جاہلیت عربیہ سے مراد ہے بت پرستی کا دور، دختر کشی کا دور، شراب نوشی کا دور، اور رہزنی کا دور، ان کے سامنے صرف یہ آتا ہے، لیکن معاشرت، طرز معیشت، طرز زندگی، فیصلے کرنے کے معیار و اصول، اور رغبات اور نفرتیں، یہ چیزیں جاہلیت کے تصور کے ساتھ ذہن میں نہیں آتیں، حالانکہ جاہلیت ان سب پر مشتمل ہے، اگر جاہلیت کا ترجمہ اردو میں کیا جائے تو اس کا جو ترجمہ حاوی ہے، اور ان سب چیزوں کو اپنے ضمن میں لے لیتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد قوم کا وہ دور ہے جو نبوت کی روشنی اور ہدایت سے محروم رہا ہے، چاہے وہ یورپ ہو یا ساسانی مملکت ہو، چاہے وہ ہندوستان ہو، چاہے وہ عرب ہو، میں اس کا ایک دوسرا ترجمہ کرتا ہوں ''من مانی زندگی'' جاہلیت کیا ہے؟ من مانی زندگی گذارنا یہ روح ہے جاہلیت کی، جاہلیت کی اسپرٹ ہے، جو چیز اسلام کی مخالف اور متوازی ہے اور آسمان سے اللہ کے نازل کیے ہوئے ادیان سے، اور صحف سماوی سے، اور تعلیمات ربانی سے بے نیاز ہے، وہ یہ ہے کہ نبوت اور ہدایت آسمانی کی روشنی سے جو دور محروم ہو وہ جاہلیت ہے، اور اس میں پھر کیا ہوتا ہے، زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، من مانی زندگی، یعنی جو دل میں

آئے، جو ہماری سوسائٹی، ہمارا ماحول چاہتا ہے، اور جو معیار اس وقت مقرر ہو چکے ہیں، اور "حیثیت عرفی" کے اظہار کے جو اصول مقرر ہو گئے ہیں، ہم تو اس پر چلیں گے، یہ ہے من مانی زندگی، اور اس کو قرآن اور حدیث کی اصطلاح میں "جاہلیت" کہا گیا ہے، دیکھئے اگر آپ احادیث کا جائزہ لیں تو آپ کو کوئی جگہ ایسا معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز پر بھی جس کا تعلق عقیدہ سے نہیں تھا، جاہلیت کا اطلاق فرمایا، ایک صحابی ہیں (جن کا نام نہیں لوں گا) ان کا معاملہ اپنے ملازم کے ساتھ کوئی مساویانہ نہیں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انك امرؤ فيك جاهلية" تم ایک ایسے آدمی ہو تمہارے اندر جاہلیت کی بو ہے، اب عقائد تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، خادم کے ساتھ ایسا معاملہ رکھنا کہ یہ مالک ہے اور وہ مملوک ہے، اس کو جاہلیت کہا، اور پھر اس سے بڑھ کر "من تعزیٰ علیکم بعزاء الجاهلية" جو تمہارے سامنے جاہلیت کی دعوت دے، عصبیت جاہلیت کی طرف بلائے، اور جاہلیت کا نعرہ لگائے، اس کے ساتھ سخت کلامی کرو، میں اس کو علماء کے لئے چھوڑ دیتا ہوں، اس کا پورا ترجمہ نہیں کروں گا، سخت سے سخت بات اس کے سامنے کہو "ولا تکنوا" اور کنایہ و اشارہ سے بھی کام نہ لو، اس کو جاہلیت کیوں کہا؟ اس کا تعلق تو عقیدہ سے نہیں، اس کا تعلق تو عقیدۂ توحید سے نہیں، ایمان بالآخرۃ سے نہیں، ایمان بالرسول سے نہیں، تو معلوم ہوا کہ اسلام صرف اسی کا مطالبہ نہیں کرتا، اسلام صرف اسی کا نام نہیں ہے، کہ عقائد صحیح ہوں، مجھے معاف کیا جائے میں بغیر کسی تنقیص کے کہتا ہوں، اسلام صرف اس کا نام نہیں ہے کہ صرف عقائد صحیح ہوں، اور نمازوں کی پابندی اور عبادات اور اس کے علاوہ جو چیزیں عقائد اساسیہ میں آجاتی ہیں وہ اس کے دائرہ میں ہیں، لیکن ہم شادی کرنے میں آزاد ہیں، ہم پردہ کرنے نہ کرنے میں آزاد ہیں ہم مقدمات عدالتوں میں لے جانے میں آزاد ہیں،

ہم اپنے مال کی تقسیم میں آزاد ہیں، ہم ان سب چیزوں میں آزاد ہیں، اس لئے ہم سے ان سب چیزوں میں کوئی کچھ نہ پوچھے، اور ہمیں نہ ٹوکے، یہ دین کے دائرہ میں نہیں آتا، یہاں کا اصل پیغام جس کے لئے آپ کو زحمت دی گئی ہے، یہ ہے کہ آپ دین کا صحیح مفہوم سمجھ لیں، ایک ہے "اسلام" ایک ہے "جاہلیت" اب آپ یہ دیکھئے کہ جو زندگی گذر رہی ہے مسلمانوں کی وہ اسلام کے مطابق ہے؟ سو فی صدی اسلام کلی اتباع چاہتا ہے، جو آیت میں کہا گیا ہے " اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً "پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ، اس لئے اس کی ہرگز گنجائش نہیں کہ مسلمان دین کے بہت سے احکام کے پابند رہیں اور ان کا احترام واہتمام کرتے رہیں، مگر زندگی کے شعبوں میں اور رواجوں میں آزاد رہیں، مجھے معاف کیا جائے تحقیر مقصود نہیں، وضاحت مقصود ہے۔

صاحب! شادی بیاہ میں بھی دین کا نام لینا، اور اس میں بھی سنت و شریعت کا حوالہ دینا، اس کا بھی احتساب کرنا کہ یہ شادی اتنے دھوم دھام سے کیوں ہوئی؟ صاحب! اللہ نے دولت دی تھی اور ہمارے کنبہ کا ہمارے خاندان کا اور ہم جہاں رہتے ہیں، وہاں یہی دستور تھا، لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ کا عائلی قانون بھی وہی ہو جو قرآن مجید نے دیا ہے، اور شریعت نے اس کی تشریح کی ہے، اور علمائے اسلام اور فقہائے کرام نے (اللہ ان کو بہتر جزائے خیر عطا فرمائے) انہوں نے اس کے لئے اپنی راتوں کی نیندیں قربان کی ہیں، اور اپنی صحت کو خطرہ میں ڈالا ہے، اور ملت اسلامیہ کو مستغنی کر دیا ہے۔

شریعت کا مطالبہ اور ہماری بے اعتدالیاں

میرے بزرگو! دوستو اور عزیزو! یہ آیتیں ہیں، آپ ان کو اپنے ذہن میں لے کر جایئے، ایک تو مطالبہ ہے کہ اسلام میں داخل ہو کلی طور پر تم بھی کلی طور پر اور

تمہارا اسلام بھی کلی طور پر، یہ نہیں کہ عقائد سر آنکھوں پر، اللہ بچائے ذرہ برابر انحراف نہیں ہوگا، عبادات میں ذرہ برابر بھی ہم سے تساہل نہ ہوگا، لیکن صاحب یہ کہ شادی کس طرح ہو، اور نکاح وطلاق کے مسائل ہیں، اور تقسیم میراث کے مسائل ہیں، اور پھر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو خاندان میں پیش آتی ہیں، اس میں آپ ہم کو آزاد چھوڑ دیجئے بالکل اس کی مہلت نہیں یٰٓاَ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اور خُطُوٰتِ الشَّیْطٰن میں بھی بڑی بلاغت ہے، کہ اگر تم نے یہ نہیں کیا تو پھر اتباع خُطُوٰتِ الشَّیْطٰن ہوگا، یہاں پر اس لئے اس کا بھی ذکر کیا، اللہ صرف فرما دیتا " اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً " لیکن اس کا جو متوازی ہے وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰن ہے، آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خُطُوٰتِ الشَّیْطٰن ہے، یہ گھروں کو لٹا دینا، یہ جائدادوں کو قرق کر دینا یہ سودی قرض لینا، اور اس خوشی میں راتوں کو جاگنا صحت کو خراب کر لینا، یہ سب اس لئے ہے کہ نام ہو جائے اور شان ہو کہ فلاں صاحب کے یہاں بارات آئی تھی، اس میں دو سو موٹریں تھیں اور اتنی بڑی بارات تھی، اور اس سب کو (Five Star) ہوٹل میں ٹھہرایا گیا، میرے نام دعوت نامے آتے ہیں، اس میں لکھا ہوتا ہے کہ آپ (Five Star) ہوٹل میں ٹھہریں گے، یہ ساری چیزیں ''عرف'' میں داخل ہو گئی ہیں جو عربی کا بہت بلیغ لفظ ہے، جس کا ترجمہ ہے رسم ورواج اور اصول زندگی۔

ہمارے بمبئی کے ایک دوست نے ذکر کیا کہ ایک مجلس نکاح میں کھجور، چھوہارے تقسیم کرنے کے بجائے جو مسنون ہے، نوٹ تقسیم کئے گئے، سو سو روپے، پچاس پچاس روپئے، دس دس روپئے کا نوٹ، کتنے ہزار روپئے صرف اس نکاح میں صرف ہو گئے، کہاں سے اس کی اجازت ملی ہے۔

حضرات! ہمارا مقام ومنصب تو یہ تھا کہ ہمارے ہندوستان میں اتنے دن

سے رہنے سے ہندوستان کی قدیم قوم جوتھی، اس کے اندر ایک ہل چل پیدا ہو جاتی، غور وفکر کرنے کی زبردست تحریک پیدا ہوتی اور وہ اپنے پورے معاشرہ کا جائزہ لیتی، اور پھر وہ ان خصوصیات وفوائد کو جو مسلمانوں کے ان چیزوں سے بچنے سے حاصل ہوتے ہیں، دیکھ کر خود وہ ان رسوم کو چھوڑتے، معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے ایک معاشرتی انقلاب آ گیا، تہذیبی انقلاب ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ بجائے اس کے ہم ان کو دیتے، ہم نے ان سے لیا، ایک ایک چیز کی تاریخ بتائی جاسکتی ہے، اگر معاشرہ کی تاریخ پر کوئی کتاب لکھی گئی ہوتی تو آپ کو اس سے پتہ چل جاتا کہ فلاں رسم فلاں طبقہ سے لی گئی ہے، اور فلاں رسم فلاں زمانے سے رائج ہوئی ہے، سب کی تاریخ مل جاتی، آغاز کی تاریخ مل جاتی۔

آپ سے دو ہی مطالبہ

ہماری اس کانفرنس کی (مجھے معاف کیا جائے) یہ ایک امانت ہے یا عطیہ ہے، اور اس کا ایک نشان اور شعار ہے، جس کو آپ لے کر جائیں، یہ دو آیتیں ہیں ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَاتَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ'' جو لوگ عربی کا ذوق رکھتے ہیں، وہ محسوس کریں گے کہ ان الفاظ میں بھی کتنا زور اور بلاغت ہے، یہ کھلا اعجاز قرآنی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جلال الٰہی بھی شامل ہے، میں عربی کے طالب کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ بالکل الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے، اگر ایسا نہ کرو گے تو اللہ کے غضب سے ڈرو، اور اللہ کی طرف سے بے برکتی پر ڈرو، اور برے نتائج سے ڈرو یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ط اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝ اس سے اور صاف بات کیا کہی جاسکتی ہے۔

اور دوسری طرف فرمایا ''افحکم الجاھلیۃ یبغون'' کیا جاہلیت کے

رسم ورواج کو چاہتے ہیں، کیا جاہلیت کے ترجیح وانتخاب کو چاہتے ہیں، جاہلیت کے فیصلہ کو چاہتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ حکم کے معنی صرف فیصلہ کے نہیں، بلکہ ترجیح و اختیار کے بھی آتے ہیں، یعنی آدمی کسی چیز کو اختیار کرتا ہے جو قوت محرکہ ہوتی ہے، جو اس کی دلیل ہوتی ہے، وہ بھی اس کے اندر شامل ہوتی ہیں، کیا جاہلیت کا فیصلہ قبول کریں گے، جاہلیت نے جس چیز کو ترجیح دی ہے، اختیار کیا ہے، اس کو اختیار کریں گے، اس پر چلیں گے، یہ جائز نہیں۔

اب آپ حضرات یہاں سے عزم کر کے جائیں یہ ارادہ کر کے جائیں کہ ہمارے گھر میں یہ ہرگز نہ ہو سکے گا، آپ اپنے دل میں قسم کھالیں کہ اب خلاف شریعت رسوم یہاں گھر میں، ہمارے یہاں، ہمارے خاندان میں ادا نہیں کی جائیں گی، یہ ظلم نہیں ہوگا کہ جہیز کا زبردست مطالبہ کیا جائے خدا کی پناہ، خدا کی ذات کی حلیم ہے، ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ ایک بیاہی ہوئی لڑکی کو جو ابھی بیاہ کر آئی ہے، ارمانوں کے ساتھ آئی ہے اور بڑی امیدوں کے ساتھ اس کو رخصت کیا گیا ہے، اعزاز کے ساتھ اس کا استقبال کیا گیا ہے، صرف اس جرم میں کہ وہ دس ہزار روپئے نہیں لائی ہے اس کو مار ڈالا جاتا ہے، میں نے ایک اخبار میں پڑھا دہلی میں ایک دلہن آئی اور اس کے گھر والوں سے دس ہزار روپئے کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ نہیں لائی، اس کو جلا دیا گیا اور اس کا خاتمہ کر دیا گیا اگر اس پر زلزلہ آجائے اللہ محفوظ رکھے اور ان الفاظ کو نہ پکڑے، اس پر زلزلہ آئے، اس پر بجلی گرے اس پر کوئی دوسری قوم اگر حملہ کرے کوئی تعجب کی بات نہیں اللہ کو اپنی مخلوق عزیز ہے، اور ایسی عزیز ہے "انہ بکم رؤف رحیم" وہ تمھارے ساتھ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے، پھر اس کی پالی ہوئی، پھر مرضوں سے بچائی ہوئی اذیتوں سے بچائی ہوئی اور بڑے ناز ونعم کے ساتھ رکھی ہوئی ایک جان آپ کے یہاں آتی ہے، اور بڑے ارمانوں کے ساتھ آتی ہے، اور

آپ مانگ کر لاتے ہیں، خوشامد کر کے لاتے ہیں، دس ہزار کی وجہ سے، لعنت ہو ایسے دس ہزار روپئے پر، جس کی وجہ سے کسی انسان کی جان جائے، ڈرنا چاہئے اللہ کے غضب سے، ایک جان اللہ کو تمھارے کروڑوں روپئے اور تمھاری سلطنتوں سے زیادہ عزیز ہے، آدم علیہ السلام کو کس پیار و محبت کے ساتھ پیدا کیا گیا، ان کا فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا، اس آدم کی اولاد کے ساتھ آپ کا یہ معاملہ ہے۔

یہی میں فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں کہتا ہوں، کسی کمہار کے یہاں جا کر تم ایک گھڑا توڑ کر دیکھو، وہ تمہارا سر توڑ دے گا، اور اللہ کی مخلوق اتنی بھی قیمت نہیں رکھتی کہ تم انسانوں کے سر توڑو، انسانوں کی جان نکالو، ایک نہیں، پچاسوں، سیکڑوں، ہزاروں، یہ وہ چیزیں ہیں، جو ہماری مسرتوں کی تقریبات میں داخل ہوگئی ہیں، اور وہ چیزیں غضب الٰہی کو بلانے والی ہیں تو پھر کیسے ان مسرتوں کی تقریب میں برکت ہو، کیسے اللہ کی نصرت ان کے ساتھ شامل ہو، اور پھر نسل میں بھی وہ دین منتقل ہو، اور وہ خصوصیات منتقل ہوں۔

بس حضرات! اگر میں نے حدود سے تجاوز کیا اور میری زبان سے سخت لفظ نکلے تو میں اللہ سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، اور آپ سے بھی معافی چاہتا ہوں، مگر کوئی وقت ایسا ہوتا ہے اور اس کی مثالیں ہمیں رحمۃ للعالمین کی سیرت میں بھی ملی ہیں کہ کسی وقت ایسے سخت لفظ بھی بول دیئے جاتے ہیں، "من تعزی علیکم بعزاء الجاھلیة" اس کے معنی اگر آپ کسی عالم سے پوچھیں تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں جو تمھارے سامنے جاہلیت (خلاف اسلام) کا نعرہ لگائے اس کے کسی فعل یا رواج کی تحسین کرے تو تم سخت لفظ استعمال کرو اور ذرا بھی رعایت اشارہ و کنایہ سے کام نہ لو، کون کہہ رہا ہے، وہ رحمۃ للعالمین فرما رہے ہیں، اور جو سراپا رافت و رحمت ہیں وہ یہ کہہ رہے ہیں، مثال نہیں مل سکتی، اس سے آپ اندازہ کیجئے

کہ جاہلیت کو، جاہلی زندگی کو، جاہلیت کے معیاروں کو، جاہلی دعوتوں کو کس نظر سے خدا نے بھی دیکھا ہے، اور اس کے رسولؐ نے بھی دیکھا ہے، وہ چیزیں اپنے گھروں میں آئیں، ہماری معاشرت کے جزء بن جائیں، ہمارے واجبات وفرائض میں داخل ہو جائیں، جہیز اتنا لاؤ، شادی دھوم دھام سے ہوگی، نہیں مسجد میں جایئے اور کسی عالم سے نکاح پڑھوا لیجئے ہم نے تو نکاح دیکھے ہیں، عصر کی نماز ہوئی، کہہ دیا گیا کہ ایک نکاح ہوگا، قریب ترین عزیزوں میں بھی سب کو نہیں معلوم، اور وہیں کے ایک عالم کھڑے ہو گئے، انھوں نے خطبہ مسنونہ پڑھا ایجاب وقبول کرایا، اور چلے گئے، یہاں سے آپ عہد وارادہ اور عزم کر کے جائیں کہ اپنے گھر میں یہ نہ ہونے دیں گے، اور حتی الامکان آپ ان تقریبات میں باعث رونق اور باعث فخر نہیں بنیں گے، یہاں تو یہ ہوتا ہے، شرعی مجبوری کی بات الگ ہے، لیکن آپ ان عزیزوں اور خاندان والوں کو محسوس کرایئے، محلہ والوں کو آپ محسوس کرایئے کہ یہ خلاف شریعت ہے، یہ خلاف شریعت بھی ہے، اور خلاف عقل بھی ہے، اور خلاف مصلحت بھی ہے، یہاں سے ارادہ کر کے جائیں۔

ائمہ مساجد جو یہاں تشریف رکھتے ہیں یا معلمین اور علمائے کرام، مدرسین، ان سے کہوں گا کہ یہاں سے جانے کے بعد مسجدوں میں تقریریں کریں، اور اس پر وعظ کہیں، اور دوسرے جو جلسے ہوتے ہیں، ان میں بھی وعظ کہیں، اور پورے ہندوستان میں اصلاح معاشرہ اور اتباعِ رسول کی تحریک چلائیں اللہ مدد فرمائے گا، برکت دے گا اور آپ کو دین کے ایک اہم شعبہ کی تبلیغ اور اس کے احیاء کا جو اجر عظیم ہوگا وہ آپ کو عطا فرمائے گا۔ (۱)

❁ ❁ ❁

(۱) یہ مضمون حضرت مولانا مدظلہ العالی کی وہ افتتاحی تقریر ہے جو ۳۰ر جولائی ۱۹۹۴ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہونے والی دوروزہ اصلاحی معاشرہ کانفرنس میں کی گئی تھی۔

”مقاصد کی صحت، رجحان کی درستی اور انصاف و ہمدردی کے قلبی جذبات کا سرچشمہ ایک صحیح وطاقتور اخلاقی وروحانی مذہب ہی ہے جو انسان کے جسم کے ساتھ اس کے دل پر بھی حکومت کرے، جو اس کی خواہشات کو اپنے ضبط و نظم میں رکھے، جو اپنی روحانی طاقت سے، اس سے بنی نوع کے حق میں ایثار و قربانی کرا سکے، جو اس محدود و مختصر زندگی کے علاوہ کسی ایسی غیر فانی زندگی کو اس کی نگاہ میں اس طرح حقیقت بنا سکے کہ اس کے شوق میں آدمی اس زندگی میں اعتدال و احتیاط سے کام لے، جو اس کے سامنے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، دولت و عزت حاصل کرنے اور حیوانی تقاضوں کو انسانی عقل و ہنرمندی سے پورا کرنے کے علاوہ انسانیت اور زندگی کے کچھ اور معانی بتلا سکے اور انسان کی زندگی کے کچھ بلند مقاصد انسان کے سامنے لا سکے، ایسے ہی مذہب کی صحیح تعلیم اس خود غرضی اور کوتاہ نظری کو زائل کر سکتی ہے جس سے ہمارا موجودہ نظام معاشرت وسیاست داغ داغ ہو رہا ہے۔“

''لیکن زمانہ کے انقلابات اور مقتضیات سے مجھے خطرہ ہے کہ وہ کہیں اس امت کی بیداری کا سامان نہ بن جائیں اور وہ پھر سے دین محمدی کی طرف بازگشت نہ کرنے لگے'' دین محمدی'' اور شرع اسلامی کی ہمہ گیری اور کارسازی کا تمہیں اندازہ نہیں............ یہ ''آئین شریعت'' خاندانی نظام، مرد و زن کے حقوق کی حفاظت وصیانت اور صالح معاشرہ کی تعمیر کرتی ہے، یہ دین عزت و حرمت، امانت و عفت، مروت و شجاعت، کرم وسخاوت اور تقوی وطہارت کا دین ہے، یہ دنیا سے باطل کی ہر غلامی اور انسانوں کے ساتھ ہر نا انصافی کو مٹا کر رکھ دیتا ہے، اس میں شاہ و گدا، وزیر وفقیر اور اونچ و نیچ کا کوئی امتیاز نہیں، اس کا نظام زکوۃ مال کے بارے میں متوازن نظریہ رکھتا ہے، اور سرمایہ داروں کے مال کو بھی اللہ کی امانت اور غریبوں کا حق کہتا ہے، اور فکر و عمل کی دنیا میں اس نے اپنے اس نظریئے سے انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ زمین اللہ کی ہے، بادشاہوں اور سلاطین کی نہیں، اس لئے پوری کوشش ہونی چاہئے کہ یہ دین نگاہوں سے پوشیدہ رہے، اور اس کی خوبیاں چھپی رہیں۔''

دعوت فکر و عمل

مسلم پرسنل لا میں ترمیم کا مطالبہ اور اس کے اسباب

حضرات!

اس وقت ہندوستان میں رہ رہ کر مسلم پرسنل لا یعنی مسلمانوں کے عائلی قانون میں آئین سازی کے ذریعہ مداخلت کا مسئلہ اٹھتا رہتا ہے، اور ملک کے مختلف حصوں سے آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، غیر مسلموں کی طرف سے بھی (جن سے ہمیں کچھ زیادہ شکایت نہیں) مسلمانوں کی ترقی و تجدد پسند (Progressive) طبقہ کی طرف سے بھی۔

اس کے بہت سے اسباب بیان کئے جاسکتے ہیں، اور وہ صحیح ہوں گے، لیکن میں ایک مذہبی انسان ہونے کے ناتے نیز مذہب کے طالب علم اور قرآن وسیرت کا مطالعہ کرنے والے انسان کی حیثیت سے اس کا کچھ اور سبب سمجھتا ہوں، کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ:

''جب مجھ سے اپنے مالک، اپنے خدا کے معاملہ میں کوئی کو

تاہی ہوتی ہے، میرے رات کے معمولات میں فرق آتا ہے، جس وقت میں اٹھتا ہوں، جتنی رکعتیں پڑھتا ہوں، خدا کو جس طرح یاد کرتا ہوں، اس سے دعا کرتا ہوں، اس کے سامنے روتا دھوتا ہوں، اس میں جب کوئی کمی ہو جاتی ہے تو میں فوراً اس کا نتیجہ دیکھ لیتا ہوں! اس کا نتیجہ کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ میرے ملازمین میری بات اس خوش دلی کے ساتھ نہیں مانتے جس طرح پہلے مانا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب میں سواری پر بیٹھنے لگتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ گھوڑا اس طرح اپنی پیٹھ نہیں جھکاتا اور اس طرح مجھے قبول نہیں کرتا جیسے وہ ہمیشہ قبول کرتا رہا ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ میں نے اپنے مالک کے حق میں کوتاہی کی، تو یہ جن کو اللہ نے میرے اختیار میں دیا ہے مجھ سے سرتابی کر رہے ہیں، مجھے سبق دے رہے ہیں، میری چٹکی لے رہے ہیں کہ تم نے اپنے آقا کے معاملہ میں کوتاہی کی، تم تو ہمارے آقائے مجازی ہو، ہم تمہارے معاملہ میں کوتاہی نہیں، سرتابی کریں گے، کتابوں میں ان کے الفاظ بعینہٖ نقل کئے گئے ہیں، أعرف ذلك في خلق دابتي و خدمي (مجھے اپنی اس کوتاہی کی نحوست، اپنے جانوروں اور ملازمین کے طرزِ عمل میں نظر آجاتی ہے)۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ عظیم مجمع جس تعداد کی نمائندگی کرتا ہے، اس تعداد کو چھوڑ دیجئے، وہ ساڑھے سات کروڑ ہے کہ پندرہ کروڑ، میں صرف اس مجمع کو سامنے رکھتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ اس ملت کے افراد کتنی بڑی تعداد میں بھی ہوں، اور کس ذوق وشوق کے ساتھ اپنے علماء کی باتیں، خادمانِ دین کی باتیں سننے کے لئے جمع ہوں،

کسی کو خیال بھی نہیں آتا (جرأت کرنا تو الگ ہے) کہ ان کے پسندیدہ، ان کے برگزیدہ اوران کے مقدس قانون میں مداخلت کی جائے، کسی واقعہ کے کچھ اسباب ظاہری ہوتے ہیں، جن کو ظاہری آنکھیں دیکھتی ہیں، کچھ اسباب غیبی ہوتے ہیں جن کو قرآن مجید، سنت اللہ، اسوۂ رسولؐ وسیرت النبیؐ کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ جرأت بار بار اس لئے ہورہی ہے کہ ہم سے اللہ کے اس مقرر کئے ہوئے مقدس قانون کی پابندی میں اوراس پرعمل کرنے میں شدید کوتاہی ہورہی ہے، ہم اس قانون کو اپنے گھروں میں توڑرہے ہیں، اپنے خاندانوں میں توڑرہے ہیں، اللہ تعالی کہیں ہمیں اس کی یہ سزا نہ دے کہ وہ قانون پھر قانونی طور پر توڑا جائے، یہ خدا کے طریقے ہوتے ہیں، وہ کبھی براہ راست سزا دیتا ہے، کبھی اپنی مخلوقات اور اپنے بندوں کے ذریعہ سزا دلواتا ہے، یہ عناصر اربعہ، یہ بحر وبر، یہ خشکی وتری، یہ موسم اور طاقتیں جو اس کائنات میں کام کررہی ہیں، (وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) یہ سب خدائی لشکر ہیں، پہلے ہم اس قانون کی حرمت اوراس قانون کا احترام اپنے گھروں میں کریں، زوجین اپنے آپس میں کریں، میاں بیوی اپنے تعلقات اوران حقوق وفرائض میں کریں جو ان پر عائد ہوتے ہیں، ترکہ ومیراث کے قانون میں اس کا احترام کریں، اس کی پابندی کریں، نکاح وطلاق کے مسائل میں اس پرعمل کریں، پھر کسی کی مجال نہیں کہ دنیا میں وہ اس قانون کو چیلنج کرسکے، گردنیں جھک جائیں گی اور ساری دنیا سرافگندہ ہوجائے گی بلکہ اس کو شوق ہوگا کہ وہ آپ کے قانون پر چلے۔

لیکن جب ہم اس قانون کو اپنے گھر میں توڑیں گے تو پھر دوسروں سے توقع نہیں کرسکتے کہ وہ ہمارے قانون کا احترام کریں۔ آج آپ اپنا جائزہ لیجئے، دیانتدارانہ جائزہ لیجئے، اپنے خود آپ محتسب بنئے، اوراپنے لئے اپنے گھروں میں

عدالتیں قائم کیجئے، اپنے مقدمے خود دائر کیجئے، آپ ہی مدعی بنئے آپ ہی مدعاعلیہ بنئے، اور دیکھئے کہ کتنے خدائی قانون ہیں، کتنے قرآن مجید کے منصوصات اور قطعیات ہیں، جن میں دنیائے اسلام کے دو عالموں کے درمیان بھی اختلاف نہیں، ان کو آپ کس طریقہ سے نظرانداز کررہے ہیں، آپ نے اپنی بہنوں کو ان کے والدین کی میراث (ترکہ) سے ان کا حصہ دیا؟ آپ نے نکاح وطلاق کے حق کو اس طرح استعمال کیا جس طرح اللہ اور اس کا رسول چاہتا ہے؟ کیا مسلمان شوہر نے اپنی بیوی کے اور مسلمان بیوی نے اپنے اپنے شوہر کے حقوق ادا کیے؟ کیا آپ کو مسائل کا علم ہے؟ تفصیلی علم تو بڑی چیز ہے، یہ علماء کا کام ہے، لیکن کیا آپ کو موٹی موٹی باتیں بھی معلوم ہیں، یہ ہمارا طرز عمل اس قانون کے معاملہ میں ہے، اس کی ہماری نظر میں (معاذ اللہ) پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، ہم ایک ادنیٰ مفاد کے لئے ادنیٰ درجہ کے فائدہ اور راحت کے لئے اس قانون کو پامال کرتے ہیں، اس قانون کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو ہمیں دوسروں سے کیا شکوہ؟

ایمان وقرآن آپ سے کیا مطالبہ کرتا ہے

آج میں اس مجمع عظیم کو ایمانی زبان، قرآنی زبان میں خطاب کرتا ہوں، آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کررہا ہوں، آپ خود دیکھئے کہ آپ اس قانون کا کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم ورواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں؟ اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے، جہیز کا بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جاتا ہو، یہ چیز کہاں سے آئی؟ مکہ مدینہ حرمین شریفین سے آئی ہے، قرآن مجید کے راستے سے آئی، یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو اللہ بطور سزا کے آپ کی غیرت ملی کو، آپ کے وجود ملی کو بار بار نشانہ بناتا ہے۔

ایک ایسا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں انسانوں کے قلوب ہیں، وہ ہمیشہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے، اس کو اپنے گناہ کا نتیجہ سمجھتا ہے، قرآن شریف میں صاف صاف ہے:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ (سورۃ الشوریٰ: ۳۰)

''تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے، وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، (یہ بھی ایسی حالت میں ہے) کہ اللہ تعالیٰ بہت کچھ عفو و درگذر سے کام لیتا ہے۔''

ورنہ قرآن میں یہ بھی ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَاتَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝

(سورۃ فاطر : ۴۵)

''اگر اللہ تعالیٰ پکڑنے لگے انسانوں کو ان کے عملوں پر تو سطح زمین پر کوئی چلنے والی اور رینگنے والی چیز باقی نہ رہے، لیکن وہ ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیئے جاتا ہے، سو جب ان کا وقت آجائے گا (تو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا) خدا تو اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔''

ہماری شکایت بجا ہے

برادرانِ ملت! بہت کچھ معاف کردینے کے بعد اور درگزر کرنے کے بعد

بھی معصیت کا، قانون شکنی کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔تو ہم جس بات کی شکایت کرتے ہیں (اور بجا طور پر شکایت کرتے ہیں) میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، اور یہ بھی ایک ڈنکا ہی ہے، ببانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ (شرعی قانون میں قانون سازی کے ذریعہ مداخلت کی) جو شکایت کرتے ہیں، وہ شکایت بجا ہے، ہم شکایت کرتے رہیں گے، اور شکایت کرنا ہمارا حق ہے، ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر کا حق دیا گیا ہو، وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمنٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں، وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے، کوئی ملک جس کی جمہوریت پر بنیاد ہو، جو جمہوری ہو، اس کے بغیر نہیں چل سکتا، حقیقت پسند حکومتیں اس بات کا اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے ایوان قانون ساز میں ایک حزب مخالف رہے، ایک اپوزیشن پارٹی ہو، تاکہ اس کے ذریعہ حکومت کو اپنی خامیاں معلوم ہوتی رہیں، اور اس ملک کی آبادی کو زیادہ مطمئن کرنے اور مطمئن رکھنے کا موقعہ ملتا رہے، اس لئے ہم اپنی حکومت سے شکایت کریں گے اور سو بار کریں گے، اور اس کو اس پر فخر ہونا چاہئے کہ ہمارے ملک میں شکایت کرنے کا حق ہے، یہ حق سلب نہیں کیا گیا ہے، ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے، ہم اسی میں ملک کی فلاح سمجھتے ہیں، وہ ملک خطرہ میں ہے، جہاں زبان بندی کا قانون نافذ کیا جائے، جہاں کسی کو کراہنے اور آہ کرنے کی اجازت نہ ہو، اس لئے ہمارے اس ملک کا یہ افتخار، ہمارے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہنی چاہئے، ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں سے اور ارکان حکومت سے، انتظامیہ (Administration) اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

ہمیں آپ سے شکایت کا حق زیادہ ہے

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے شکایت کریں گے اور ان کا دامن پکڑیں گے، لیکن آپ کا گریبان بھی پکڑ لیں گے، اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہو گا، وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا، وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا، اور کہے گا کہ پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو، تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمھارے قانون کو چلائے، اس کا احترام کرے۔

یہاں سے عہد کر کے جایئے

میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، یہاں سے یہ عہد کر کے جایئے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کئے جاتے ہیں، ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلادی جاتی ہیں، ملک میں سیکڑوں واقعات پیش آتے ہیں، صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے(۱)، کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد وعورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہوسکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ کوئی ملک کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت ونصرت کا مستحق ہوسکتا ہے؟ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی،

---

(۱) روزنامہ قومی آواز دہلی ۱۰رجون ۱۹۸۴ء

میں نے دہلی کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ٥ (سورۃ الانفال : ۳۳)

''اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔''

رحمۃ للعالمین کا وجود موجود ہے، آج رحمۃ للعالمین ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن رحمۃ للعالمین کی امت موجود ہے، آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں، ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو، اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا، چہ جائیکہ آپ کے ہاتھوں ہو، عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر شادی کا پیام دیں گے، آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات کی تلاش کریں گے، بیٹے کے لئے پیام دیں گے لیکن جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے، لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا، ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کریں گے۔

ایسا ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے، نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے، بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے، طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے، مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن و مغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق ابغض المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے لیکن آخری

درجہ کی چیز ہے، بڑی مجبوری کی چیز ہے، جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے، یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے، جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، جتنا طعنہ دیتے ہیں، اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں۔(۱)

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ کس طرح برباد ہو رہا ہے، وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے، کوئی اس کو نہیں ٹوکتا، لیکن طلاق دینا معیوب ہے، اور اس میں ہزاروں دقتیں ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں، ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (۲)" ندوۃ العلماء لکھنؤ، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا مرکزی دفتر واقع مونگیر برابر لٹریچر شائع کرتا رہتا ہے، عربی میں تو پوچھنا ہی کیا، اس میں علامہ عباس محمود العقاد، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی عورتوں کے حقوق پر اور اسلام میں عورتوں کے درجہ پر ایسی معرکۃ الآرا کتابیں نکل چکی ہیں، جن کی مثال نہیں مل سکتی، اور اس کے علاوہ بھی انگریزی میں اور مغربی زبانوں میں کام ہوا ہے، کوئی شخص ہم سے آنکھیں ملا کر کہہ دے کہ اسلام کا عائلی قانون ظالمانہ ہے، ہم اس سے پوچھیں گے کہ اس نے کیا پڑھا ہے؟ اس نے کتنی کتابیں پڑھی

(۱) مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے، اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے، پھر بھی تھوڑی سے بے اعتدالی ضرور ہے۔

(۲) ACADEMY OF HSLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS NADWATU-ULAMA- LUCKNOW

ہیں؟ کتنا وقت صرف کیا ہے، محمڈن لا کے مطالعہ میں؟ ہم اس کا امتحان لیں گے، ہم اس کو بغیر امتحان لئے نہ چھوڑیں گے، ہم پوچھیں گے کہ تم طلاق کو کیا جانتے ہو؟ تم ترکہ سے متعلق کتنا جانتے ہو؟ اس لئے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جو چاہا وہ منھ سے نکال دیا، یہ پریس کا زمانہ ہے، یہ ابلاغ عامہ کے ذرائع کا زمانہ ہے دنیا میں کوئی آدمی کہیں الگ تھلگ نہیں رہتا ہے، ساری دنیا گھر آنگن بنی ہوئی ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہو رہا ہے، امریکہ میں کیا ہو رہا ہے، اب علماء بھی ایسے نہیں رہے کہ آپ ان سے کہئے کہ آپ جانتے نہیں زمانہ کدھر جا رہا ہے، آج علماء بیسیوں جدید تعلیم یافتہ حضرات سے زیادہ جانتے ہیں کہ زمانہ کدھر جا رہا ہے، معترضین آئیں ہم سے باتیں کریں، اپنا عائلی قانون سامنے رکھیں، اور یورپ وامریکہ کا ترقی یافتہ سے زیادہ ترقی یافتہ قانون سامنے رکھیں، اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ آپ جس سے چاہیں کہہ دیں کہ آپ جانتے نہیں ہیں اگر کوئی کہے گا، تو ہم اس کا امتحان لیں گے کہ آپ کو کہنے کا حق ہے کہ نہیں، آپ (Qualifide) ہیں کہ نہیں، اس کے بعد پھر ہم آپ کی بات توجہ سے سنیں گے۔

ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں

تو بھائیو! ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں، ہم یہاں نہیں بلکہ واشنگٹن میں، پیرس میں، لندن میں، نیویارک میں، آپ کہیں سیمینار منعقد کریں، ۱۹۵۱ء میں پیرس میں وہاں کی جامعات (Universities) اور فضلاء و ماہرین قانون کے زیر اہتمام فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا گیا، اس میں مشرق وسطیٰ کے فاضل ترین علماء و ماہرین قانون اور پروفیسر صاحبان بھی مدعو کئے گئے، وہاں کے بڑے بڑے جیورسٹ، بڑے بڑے قانون دانوں نے اور اعلیٰ درجہ کے پروفیسروں نے برملا کہا کہ اسلامی فقہ ہمارے قانون سے زندگی کے بہت سے شعبوں میں ابھی بہت آگے ہیں، انہوں نے

کہا کہ فلاں چیز میں حنفی قانون تک ابھی ہم نہیں پہنچے، اور فلاں شعبہ میں حنبلی فقہ کو ہم نہیں پہونچے، معاملات میں، بیوع میں، ملکیت کے معاملہ میں، شہادت کے مسائل میں فلاں فقہ تک ہم ابھی تک نہیں پہونچ سکے، ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد کے زمانہ میں (جب علی گڑھ میں M.A.O. کالج قائم ہوا تھا) سمجھا جاتا تھا کہ دین کی نمائندگی کرنے والے دنیا سے بے خبر ہیں، اب سب پردے اٹھ چکے ہیں، اب سب کو سب کا کچا چٹھا معلوم ہے، ہمارے اسی مجمع میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو ایک بار نہیں، پانچ پانچ بار اور دس دس بار یورپ جا چکے ہوں گے، ہم احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں ہم فخر کرتے ہیں، اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسے اعلیٰ درجہ کے قانون سے نوازا ہے۔

حضرات! اسی لہجہ میں اور اسی خود اعتمادی کے ساتھ ہم اپنے غیر مسلم فاضل بھائیوں سے بات کریں گے، لیکن ہم آپ سے دوسرے لہجہ میں بات کریں گے، آپ ہمارے بھائی ہیں، آپ کا ہم پر حق ہے، ہمارا آپ پر حق ہے، آج آپ نے ہمارے پیچھے نماز پڑھی ہے تو آپ ہماری بات بھی سنئے اور غور کیجئے کہ آپ اپنے گھروں میں، اپنی عائلی زندگی میں اس قانون پر کتنا عمل کرتے ہیں، آپ اس قانون کو توڑیں اور دوسروں سے کہیں کہ وہ جوڑیں، یہ انصاف کی بات نہیں، ان سے ہم نہیں کہیں گے کہ ہمارے مسلمان توڑتے ہیں، یہ ہم آپ سے کہیں گے، حقیقت حقیقت ہے، صداقت صداقت ہے، ضرورت ضرورت ہے۔

تاریخ کا ایک مثالی واقعہ، قابل توجہ، قابل عمل

میرے بھائیو! آپ مجھے معاف کریں، میرے آپ کے صوبہ سے بہت قریبی تعلقات ہیں، میرے بزرگوں نے آپ کے خطہ کا دورہ کیا ہے، یہاں انھوں نے اپنا پسینہ بہایا ہے، یہ وہ کلکتہ شہر ہے جب حضرت سید احمد شہیدؒ کا قافلہ یہاں

آیا(۱) تو یہاں کے شراب کے ٹھیکیداروں نے سرکار انگریزی کو جس کا کلکتہ کیپٹل اور سیاسی مرکز تھا، درخواستیں گزاریں کہ جب سے یہ قافلہ آیا ہے اس وقت سے ایک آدمی بھول کر بھی ہمارے شراب خانوں میں نہیں آیا، ہم ٹیکس نہیں ادا کر سکتے، حکومت نے اس سلسلہ میں تحقیقات کیں، معلوم ہوا کہ واقعی جب سے شمالی ہند کی طرف سے یہ قافلہ آیا ہے اس وقت سے لوگوں نے شرابیں چھوڑ دی ہیں، ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے توبہ کر لی ہے، اوران شراب خانوں کی بکری بند ہو گئی ہے، تو کہا گیا کہ اچھا اس وقت ادا نہ کرو، لیکن قافلہ کے جانے کے بعد ہم پھر دیکھیں گے کہ اگراس کے بعد بھی مسلمان شراب نہیں لیتے، نہیں پیتے تو ہم معاف کر دیں گے، ورنہ تمہیں دینا پڑے گا، سید صاحب اوران کے ہمراہیوں کو معلوم ہوا کہ بہت سے لوگوں نے بغیر نکاح کے عورتوں کو اپنے گھروں میں بٹھا رکھا ہے تو ایک مستقل کام یہ تھا کہ نکاح پڑھائے جاتے تھے، اور توبہ کرائی جاتی تھی، اور ازدواجی تعلقات شرعی طریقہ پر قائم ہوتے تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سی جگہ نکاحی عورتوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، جس کے دل میں جتنا آتا ہے، عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیتا ہے، شرعی پردہ کا رواج بھی بہت کم ہے یہ کمزوریاں مختلف علاقوں میں تھیں، ہمارے مصلحین، شریعت کے نمائندے اس کے خلاف صف آراء ہوئے، اور کوششیں کیں (۲)، آج پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ ہم اس بات کا مطالبہ کریں گے کہ تمام غیر شرعی رسوم، جاہلیت کی تمام رسمیں اور خاص طور پر یہ کہ ہم نے بجائے اپنے برادران وطن کو اسلام کی نعمت اور اس کا تحفہ دینے کے ہم نے ان کی جو کمزوریاں ان

(۱) ۱۲۳۶ھ۔۱۸۲۱ء کا واقعہ ہے، قافلہ میں جو دریائے گنگا کے راستہ سے درمیانی شہروں اور قصبات میں تبلیغ و دعوت کا کام کرتا ہوا، تین مہینے سے زائد مدت میں کلکتہ پہنچا تھا، سات سو کے قریب آدمی تھے، جو کلکتہ سے حج کے لئے روانہ ہونے آئے تھے، تین مہینے اس مبارک قافلہ کا قیام کلکتہ میں رہا۔

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" جلد اول صفحہ ۳۱۵-۳۲۰

سے لی ہیں، ان کمزوریوں کو واپس کریں، ان سے کہیں کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے، آپ کے یہاں بیوائیں کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں، آپ کے یہاں نکاح ثانی نہیں ہے، آپ کے یہاں ترکہ نہیں ہے، آپ کے یہاں عورت کو ملکیت کے حقوق حاصل نہیں ہیں، اور آپ ہم سے کہتے ہیں کہ تمھارا قانون ظالمانہ ہے۔ تم اپنے قانون کی اصلاح کرو۔

حضرات! میری تقریر بہت لمبی ہوگئی، لیکن میں آپ کو داد اور شاباشی دیتا ہوں کہ آج پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ نماز کے بعد مجمع پھر آ گیا، اور اسی طریقہ سے بیٹھا، یہ ایک تاریخی ریکارڈ ہے، میں آپ کی بنگال کے مسلمانوں کی، کلکتہ کے مسلمانوں کی تعریف کرتا ہوں، کہ آپ پھر نماز پڑھ کر ایسے آ گئے، جیسے آپ گئے ہی نہیں تھے، اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبہ کو اور آپ کے اس دین کے شوق کو قائم رکھے، لیکن مبارک ہوگا یہ جلسہ، تاریخ ساز ہوگا یہ جلسہ، اور ساری محنتیں وصول ہیں آنے والوں کی، بلانے والوں کی، اور خرچ کرنے والوں کی، اگر آپ یہ طے کر لیں کہ خلاف شرع رسمیں اب ہمارے گھر میں نہیں رہیں گی، اور ہم شریعت کے قوانین پر چلیں گے، تو پھر دیکھئے گا کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ دلوں میں انقلاب پیدا کر دے گا، آپ کے قانون میں مداخلت کی کوئی آواز نہیں اٹھے گی، لیکن جب تک کمزوری خود ہمارے یہاں ہے، آواز اٹھتی رہے گی، اس آواز کے اٹھنے کا جواز نہیں، میں صاف کہتا ہوں، ہم اگر کچھ بھی کریں جب بھی کسی جمہوری ملک میں اس کا جواز نہیں کہ ہمارے بنیادی اور مذہبی حقوق پر دست درازی کی جائے، لیکن آپ کو خود اپنی اصلاح پہلے کرنی چاہئے، اصلاح گھر سے شروع ہوتی ہے، میں ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العلمين

''جو قوم خود فیصلہ نہیں کر سکتی، دنیا کی ساری تدبیریں، حکمت و سائنس بلکہ طاقتور سلطنتیں بھی اس قوم کی مدد نہیں کر سکتیں، جن قوموں نے اپنے ضمیر کے ساتھ اپنے عقیدے، اور اپنے ایمان کے ساتھ، ان اصولوں کے ساتھ جو ان کو جان سے زیادہ عزیز تھے باقی رکھنے کا فیصلہ نہیں کیا، ان کا نام حرف غلط کی طرح لوح جہاں سے مٹا دیا گیا، دنیا جس کو تاریخ کہتی ہے، یہ سلطنتوں کی تاریخ نہیں ہے، تہذیبوں کی تاریخ نہیں ہے، علم و دانش کی ترقی و فروغ کی تاریخ نہیں ہے، ذہانتوں کی تاریخ نہیں ہے، ایک جملہ میں یہ انسانی فیصلوں کی تاریخ ہے، فیصلوں نے سلطنتیں قائم کی ہیں اور مٹا دی ہیں، فیصلوں نے تہذیبیں پیدا کی ہیں اور تہذیبوں کا گلا گھونٹ دیا ہے، فیصلوں نے قوم کو دنیا کے ایک سرے سے اٹھا کر دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا ہے، اور عزم و فیصلہ کی غیر موجودگی نے جیتی جاگتی دوڑتی، بھاگتی، زندہ اور توانا قوم کو بے جان مجسموں کی طرح باقی رکھا اور مردوں کی طرح دفن کر دیا۔

نشاں یہی ہے زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی انکی — معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں
خودی کے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال — کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے
ورائے عقل ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

اقبالؔ

موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے

راہ عمل

ملک میں مسلمانوں کا ایمانی، جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی وجود خطرہ میں

اس وقت پورا عالم اسلام خاص طور پر ہمارا ملک ہندوستان (جو صدیوں تک اسلامی اقتدار، عزت وشرف اور اسلامی علوم وفنون کا مرکز رہا ہے، اور جہاں ایسی زبردست اصلاحی تحریکیں، مصلحین اور علمائے ربانیین پیدا ہوئے، جن کی دعوت واثرات عالم اسلام کے دور دراز ملکوں تک پہنچے) ایک ایسے آزمائشی دور سے گزر رہا ہے جس کی نظیر گذشتہ تاریخ میں صدیوں تک نہیں ملتی، اس دور آزمائش میں مسلمانوں کا صرف ملی تشخص، دین کی دعوت وتبلیغ کے مواقع وامکانات اور ملک و معاشرہ کو صحیح راستہ پر لگانے اور اس کائنات کے خالق ومالک کی صحیح معرفت اور عبادت اور دین صحیح کی طرف رہنمائی کی صلاحیت اور استطاعت تو بڑی چیز ہے (کم سے کم اس ملک ہندوستان میں) ان کی زندگی کا تسلسل، جسمانی وجود، عزت وآبرو مساجد ومدارس، اور صدیوں کا دینی وعلمی اثاثہ اور قیمتی سرمایہ بھی خطرہ میں پڑ گیا ہے،

وہ نہ صرف دور دراز قصبات اور دیہاتوں میں بلکہ بڑے بڑے مرکزی شہروں میں بھی جہاں وہ بڑی تعداد میں بستے ہیں، اور ممتاز صلاحیتوں، ذہنی امتیازات اور مہارتوں کے مالک ہیں، کچھ عرصہ سے خوف و ہراس کی زندگی گزار رہے ہیں اور کہیں کہیں ان کا نقشہ بعینہ وہ ہو گیا ہے جس کی تصویر قرآن مجید نے اپنے بلیغ و معجزانہ الفاظ میں اس طرح کھینچی ہے۔

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ (سورہ توبہ : ۱۱۸)

''زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں۔''

اس صورت حال کی اگر کوئی مثال پچھلی تاریخ میں مل سکتی ہے تو وہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں تاتاریوں کا ترکستان، ایران اور عراق پر حملہ ہے، جس نے شہر کے شہر بے چراغ اور تودہ خاک بنا دیئے تھے اور عالم اسلام کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ لیکن وہ ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کے ساتھ کوئی دعوت، تہذیب، فلسفہ، مذہبی نفرت و تعصب اور جسمانی و معنوی نسل کشی (Cultural Genocide) کا منصوبہ یا ارادہ نہ تھا، اور نہ وہ کسی متوازی تہذیب و فلسفہ کے حامل تھے، اس وقت خوش نصیبی سے وہ اہل دل، صاحب روحانیت، دین کے مخلص اور صاحب تاثیر داعی و مبلغ بھی موجود تھے جن کے اثر و صحبت سے پوری کی پوری تاتاری قوم جو (لاکھوں کی تعداد میں تھی) اسلام کی حلقہ بگوش ہی نہیں، دین حق کی حامی و محافظ اور علمبردار بن گئی اور اس نے متعدد وسیع و زبردست اسلامی سلطنتیں قائم کیں مشہور مورخ پروفیسر (T.W.Arnold) اپنی کتاب ''دعوت اسلام'' (Preaching of Islam) میں لکھتا ہے:

"لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے پھر
اٹھا اور واعظین اسلام نے انہیں وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانو ں
پر کوئی ظلم اٹھا نہ رکھا تھا مسلمان کرلیا" (۱)۔

آج کی صورت حال خاص طور پر جن ملکوں میں مسلمان عددی اقلیت میں ہیں اور ماضی میں وہ حکومت واقتدار کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں، دوسرے اسلامی ممالک سے مختلف اور زیادہ نازک ہے۔ یہاں ان کی تاریخ (ایک علمی اور سیاسی سازش کے تحت) اس طرح مرتب اور پیش کی گئی ہے کہ وہ اکثریت میں بغض ونفرت اور انتقامی جذبہ پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، پھر بعض اوقات ان ملکوں کی سیاسی قیادتوں یا وقتی پیش آمدہ مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی ونمائندگی کرنے والی تنظیموں اور جماعتوں نے غیر معتدل جذباتیت، ناعاقبت اندیشی اور نام ونمود حاصل کرنے کے شوق میں ہنگامہ خیزی سے کام لینے کی غلطی کی، وہاں مسلمان شدید مذہبی منافرت اور تعصب، تہذیبی و ثقافتی محاذ آرائی (Confrontation) کا شکار ہوئے، پھر نصاب تعلیم، صحافت (Press) اور ابلاغ عامہ (Public Media) کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ نسل کو اولاً تہذیبی وثقافتی ارتداد، ثانیاً (خاکم بدہن) ایمانی واعتقادی ارتداد کا شکار بنانے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، یہ حالات یقیناً نہ صرف ایمانی و مذہبی غیرت اور پختہ دینی شعور رکھنے والوں کے لئے بلکہ حالات پر سطحی نظر رکھنے والے عام مسلمانوں کے لئے بھی جو گرد و پیش کے حالات کو دیکھتا اخبارات پڑھتا، اور خبریں سنتا ہے سخت تشویش انگیز ہیں، وہ کبھی مایوس اور بعض اوقات حالات کے سامنے سپر انداز ہوجانے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔

---

(۱) T.W.ARNOLD, HE PREACHING OF HSLAM (LONDON,1935, P.227

رہے ہیں اور ہیں، فرعون میری گھات میں ابتک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

لیکن اس خدائے واحد پر ایمان رکھنے والے مسلمان کے لئے جس کے ہاتھ میں اس کارخانہ عالم کی باگ ڈور ہے، اپنے دین کا محافظ، حق کا حامی، مظلوم کی مدد کرنے والا، پامال اور خستہ حال کو اٹھانے والا اور سرکش و متکبر کو نیچا دکھانے والا ہے اور جس کی شان ہے کہ "ألا له الخلق و الامر" (دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے) کوئی انقلاب اور تغیر حال ناممکن نہیں، اس خدائے واحد کے بارے میں مسلمان شہادت دیتا ہے کہ:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیءٍ قَدِيْرٌ ہ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ہ (سورہ آل عمران : ۲۶،۲۷)

"کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے اور بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے

بے جان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے۔"

ایک ایسے ہی موقع پر جب ایک مفتوح و مغلوب قوم کے غالب آنے اور ایک فاتح اور غالب ملک کے مغلوب ہونے کے بارہ میں نہ کوئی امید تھی نہ کوئی پیشین گوئی کی جرأت کرسکتا تھا قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا ہے:۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ (۱)

"پہلے بھی اور پیچھے بھی خدا ہی کا حکم ہے اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے خدا کی مدد سے وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ غالب اور مہربان ہے۔"

(سورہ روم: ۴-۵) ساتویں صدی مسیحی کے آغاز میں ساسانی مملکت ایران کے بازنطینی سلطنت روم و مصر اور مشرقی یورپ پر مکمل غلبہ پانے کے بعد اس کی پسپائی اور شکست اور رومیوں کے غلبے کی طرف اشارہ ہے ۵ بعثت نبوی اور ۶۱۶ء میں رومۃ الکبری کی عین اس حالت نزع میں قرآن نے پیشین گوئی کی کہ رومی نو سال کے اندر غالب ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا، یورپین مورخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBION) لکھتا ہے:

"محمدؐ نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے، جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال سلطنتِ روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کررہے تھے۔"

(DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) تاریخ زوال روما، ج ۳ ص ۳۰۳، مطبوعہ ۱۸۹۰ء

موجودہ خطرات اور چیلنجوں کا واحد حل

قرآن وحدیث اور اسوۂ صحابہ پر عمل

لیکن اس تبدیلیٔ حال اور اس خطرہ سے بچنے کے لئے جواب مشاہدہ اور تجربہ کی شکل میں آگیا ہے کچھ خدائی قانون، اس کے بھیجے ہوئے آخری پیغمبر انسانیت کی تعلیمات اور خود اس کا اسوہ اور سنت اور اس کے تربیت یافتہ اصحاب کاملین کا نمونہ وعمل ہے، پیش نظر مقالہ میں قرآن وحدیث سیرت نبوی اور اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں چند شرائط وہدایات کو پیش کیا گیا ہے۔

توبہ وانابت الی اللہ

(۱) اس وقت دنیا کے تمام مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض اور ضروری کام رجوع الی اللہ، انابت، توبہ و استغفار اور دعا وابتہال (گریہ وزاری) ہے۔

قرآن مجید کی صریح آیت ہے:-

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ ۝ (سورہ بقرہ : ۱۵۳)

''اے ایمان والوں مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا:-

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ط (سورہ نمل : ۶۲)

''بھلا کون بے قرار کی التجا کو قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کر

تا ہے اور کون (اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے۔"

دوسری جگہ فرمایا گیا:-

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْآ اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحاً ط عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (سورہ تحریم : ۸)

"اے ایمان والو! اللہ کے آگے سچی توبہ کرو، عجب کیا ہے کہ تمہارا پروردگار (اس سے) تمہارے گناہ تم سے دور کردے۔"

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ ذرا بھی کوئی پریشانی کی بات پیش آتی تو فوراً نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور دعا میں مشغول ہو جاتے حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں:-

كان رسول الله صلى الله عليه واله وسلم اذا حزبه أمر صلىٰ (روایت ابوداؤد)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو جب کوئی پریشانی کی بات پیش آتی تو آپ نماز شروع کردیتے۔"

حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے:-

كان النبي صلى الله عليه واله وسلم اذا كان ليلة ريح شديدة كان مفزعه الى المسجد حتى تسكن الريح واذا حدث في السماء حدث من خسوف شمس او قمر كان مفزعه الى الصلاة حتى ينجلي۔ (الطبراني في الكبير)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب

تیز ہوا والی رات ہوتی تو آپ کی پناہ گاہ مسجد ہوتی، آپ وہاں
اس وقت تک تشریف رکھتے کہ ہوا ٹھہر جاتی اگر آسمان میں سورج
یا چاند کو گہن پڑتا تو نماز ہی کی طرف آپ کا رجوع ہوتا اور آپ
اس وقت تک مشغول رہتے کہ گہن ختم ہو جاتا۔"

اس بنا پر اس وقت دعا و مناجات، تلاوت قرآن پاک، خاص طور پر ان آیات اور سورتوں کی تلاوت کا اہتمام کیا جانا چاہئے، جن میں امن وامان اور فتح ونصرت کا مضمون آیا ہے مثلاً "الم تر کیف، لایلاف قریش" اور آیت کریمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" کا ورد۔

گناہوں سے اجتناب اور حقوق کی ادئیگی

(۲) دوسری شرط اور ضروری اور فوری قدم یہ ہے کہ مصیبتوں سے توبہ کی جائے گناہوں سے اجتناب اور احتراز برتا جائے، حقوق کی ادائیگی ہو، اس سلسلہ میں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م ۱۰۱ھ) کے اس ایک فرمان کا حوالہ دینے پر اکتفا کی جاتی ہے، جو انھوں نے اپنی افواج کے ایک قائد کو بھیجا۔

وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ کے بندہ امیر المومنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور ابن غالب کے نام جب کہ امیر المومنین نے ان کو اہل حرب سے اور ان اہل صلح سے جو مقابل میں آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المومنین نے ان کو یہ حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان، مؤثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے

ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمن سے جنگ کرتے ہیں اوران کے گناہوں کی وجہ سے ان پر غالب آجاتے ہیں، اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہوجائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں، جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں"۔(۱)

غیر مسلموں میں اسلامی دعوت

(۳) غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کی کوشش کریں اور ایسے کسی موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیں، ہمارے پاس سب سے بڑی طاقت وہ فطری، معقول، پرکشش اور دل و دماغ کو تسخیر کرنے والا دین، قرآن مجید کا اعجازی صحیفہ اور نبی آخر الزماں کی دلکش اور دل آویز سیرت اور اسلام کی قابل فہم اور قابل عمل اور عقل سلیم کو متاثر کرنے والی تعلیمات ہیں، جو اگر کھلے دماغ اور صاف ذہن سے پڑھی جائیں تو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں، اور انہیں نے دنیا کے وسیع ترین رقبہ اور متمدن اور ذہین قوموں کو اپنا عاشق اور اپنے اوپر کار بند بنالیا اور ملک کے ملک (جو اپنی صد ہا سالہ تہذیبیں فلسفے اور حکومتیں رکھتے تھے) ان کے حلقہ بگوش اور ان کے داعی و مبلغ بن گئے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اس فرض کی ادائیگی میں اور اپنی اس ذمہ داری کے احساس وشعور میں بڑی کوتاہی کی، اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی اکثریت اسلام کی ان روزمرہ کی خصوصیات، نشانیوں اور اذان و نماز (جو

---

(۱) سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن عبدالحکیم، ترجمہ ماخوذ" از تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اول ص ۴۵، ۴۶

شہروں دیہاتوں اور محلوں میں پنج وقتہ ہوتی ہے) کے بارہ میں بعض اوقات ایسے سوالات کرتے ہیں کہ بجائے ان پر ہنسی آنے کے اپنی کوتاہی پر رونا آنا چاہیئے، وہ ان کے مفہوم و مطلب سے اتنے ناواقف ہیں جن کا قیاس میں آنا مشکل ہے، ان کے سلسلہ میں ایسے تجربے کثرت سے سفر کرنے والوں اور غیر مسلموں سے میل جول رکھنے والوں کو دن رات پیش آئے ہیں، (۱) اس مقصد کے لئے اردو، انگریزی اور ہندی میں اسلام کے تعارف میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ (۲)

بقائے باہم اور انسانی بنیادوں پر اتحاد و تعاون

(۴) اس سب کے ساتھ اس ملک میں جس میں صدہا سال سے مسلمان رہتے چلے آئے ہیں اور بظاہر ان کو اسی ملک میں رہنا ہے بقائے باہم (Coexistence) انسانی اور شہری بنیادوں پر اتحاد و تعاون اور انسانی جان اور عزت و آبرو کے تحفظ اور انسان کے احترام اور اس سے محبت کی تبلیغ اور تلقین ضروری ہے، جو اس ملک کی فضا کو مستقل طور پر معتدل اور پرسکون بلکہ پرراحت اور باعزت رکھنے کی ضامن ہے، اور جس کے بغیر اس ملک کے (جس کے لئے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا مرکز اور دیس ہونا مقدر ہو چکا ہے) ترقی اور نیک نامی الگ رہی، امن و امان اور سکون و اطمینان

---

(۱) راقم نے اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں'' اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس پر اظہار تعجب و شکوہ۔ اس مقصد کے لئے اردو، انگریزی اور ہندی میں اسلام کے تعارف میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔

(۲) مثال کے طور پر ''اسلام کیا ہے'' (از مولانا منظور نعمانی) ''ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں'' (از راقم ''رحمتِ عالم'' اور ''رسول وحدت'') (از مولانا سید سلیمان ندوی) ''محسن عالم صلی اللہ علیہ وسلم (از راقم) ان سب کے ہندی، انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں۔ ''رحمۃ للعالمین'' (از قاضی محمد سلیمان منصور پوری) "INTRODUCTION TO ISLAM" (از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدر آبادی مقیم پیرس) ان کے علاوہ دوسری مفید کتابیں اور رسائل ہیں۔

کے ساتھ باقی رہنا بھی مشکل ہے، یہ تحریک "پیام انسانیت" کے نام سے کئی سال پہلے شروع کی گئی اور ہندوستان کے تقریباً تمام مرکزی شہروں میں اس کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں خاصی تعداد میں غیر مسلم دانشور، فضلاء، سیاسی کارکن اور رہنما بھی شریک ہوئے، اس کے تعارف اور اس کی ضرورت کی تشریح اور اس کے پیغام پر خاص لٹریچر اردو، ہندی اور انگریزی میں تیار ہو چکا ہے اور اہل شوق کو آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتا ہے۔(۱)

صبر و تحمل اور ایثار

(۵) ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں (خاص طور پر جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور وہاں خطرات اور آزمائشوں کا امکان ہے) صلح پسندی، صبر و تحمل بلکہ ایثار و فیاضی کے ساتھ، عزم و ہمت، صبر و ثبات، شجاعت و دلیری کی صفت، راہ خدا میں مصائب برداشت کرنے اور اس پر اللہ کے اجر و ثواب کی طمع اور جنت اور لقائے رب کا شوق اور شہادت فی سبیل اللہ کے فضائل کا استحضار بھی موجود و زندہ رہنا چاہئے، اس کے لئے ان کو صحابہ کرام کے حالات اور داعیان اسلام کے کارناموں کا مطالعہ اور ان کا سننا سنانا جاری رکھنا چاہئے، جنھوں نے راہ خدا میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور قربانیاں دیں، اور اس کو افضل اعمال اور قرب خداوندی و حصول جنت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا۔

کچھ عرصہ پہلے پڑھے لکھے اور دیندار گھرانوں میں واقدی کی "فتوح الشام" کا منظوم اردو ترجمہ "صمصام الاسلام (۱)" گھروں اور مجلسوں میں پڑھا جاتا تھا،

---

(۱) دفتر "پیام انسانیت" پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء لکھنؤ سے یہ رسائل اور مضامین مل سکتے ہیں۔

(۲) یہ منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی تصنیف ہے، جو تیرہویں صدی ہجری کے عظیم مجاہد و مصلح حضرت احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دو مرتبہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اور اس کا بڑا اثر پڑتا تھا، اب بھی ''حکایات صحابہ'' از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ ''شاہنامہ اسلام'' از حفیظ جالندھری، راقم سطور کی کتاب ''جب ایمان کی بہار آئی'' سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، ان کے مسجدوں، مجلسوں اور گھروں میں پڑھنے کا رواج ڈالنا چاہئے۔

نئی نسل کو دینی تعلیم کی ذمہ داری

(۶) بڑی ضروری اور آخری بات یہ ہے کہ اس وقت ہر گھر کے ذمہ داروں، بچوں کے والدین اور موجودہ نسل کے لوگوں کو اپنے بچوں اور اپنی آئندہ نسل کو دین کی ضروریات سے، اسلامی عقائد، دینی فرائض اور اسلامی اخلاق سے واقف کرانے اور بنیادی تعلیم دینے کی ذمہ داری خود قبول کرنا ہے اور ان پر لازم ہے کہ اس کو اپنا ایسا ہی انسانی و اسلامی فرض سمجھیں جیسا کہ بچوں کی خوراک وغذا و لباس و پوشاک، صحت اور بیماری کے علاج کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور اس کا انتظام کرتے ہیں، بلکہ حقیقت میں دین کی ضرورت، عقائد کی تعلیم، اور صحیح اسلامی عقیدہ کی حفاظت اور تقویت کا کام ان جسمانی و طبعی ضروریات کی تکمیل اور ان کے انتظام سے بھی زیادہ ضروری ہے، اور اس سے غفلت ان انسانی و جسمانی ضروریات کی تکمیل سے غفلت برتنے اور اس کے بارہ میں سہل انگاری سے کام لینے سے زیادہ خطرناک اور برے دائمی نتائج کا سبب ہے اس لئے کہ دینی تعلیم و تربیت اور صحیح اسلامی عقائد کا معاملہ ایک لافانی و ابدی زندگی (حیات بعد الموت) کے انجام اور اچھے برے نتائج سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ صاف صاف ارشاد فرماتا ہے:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی، ضرورت ہے کہ پھر اس کی طباعت واشاعت ہو اور وہ گھروں اور مجلسوں میں پڑھ کر سنائی جائے۔

يَآ يُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡا اَنۡفُسَكُمۡ وَ اَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا

(سورہ تحریم : ٢)

"اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے۔"

اور صحیح حدیث میں آتا ہے کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (٢) تم میں سے ہر ایک ایک حاکم اور زبردست اور زیر فرمان لوگوں کے ذمہ دار کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر ایک سے اس کی اپنی اس رعیت (زیر اثر لوگوں) کے بارہ میں سوال کیا جائے گا، اس لئے گھر گھر، محلّہ محلّہ، مسجد مسجد اور مکتب مکتب اور مدرسہ مدرسہ بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہونا چاہئے اور ہر عاقل و بالغ مسلمان اور عیال دار آدمی کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہئے۔

انسانی فضائل اور اسلامی خدمات میں خواتین کا حصہ
دینی تعلیم وتربیت اور اسلامی تہذیب ومعاشرت کے بقاوتسلسل میں

خواتین کی ذمہ داری

خطبۂ صدارت

(یہ خطبہ جامعہ نورالاسلام نسواں لکھنؤ کے تقسیم اسناد کے موقع پر دیا گیا تھا)

منعقدہ ۱۵/۱۶/اپریل ۱۹۹۲ء

''یہ دو میدان ہیں، ایک نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا ابتدائی کام، اور اس کے قلب و ذہن پر اسلام کا نقش قائم کرنا اور اس کو عمیق و مستحکم بنانا، دوسرے اسلامی تہذیب و معاشرت کی حفاظت اور نئی نسل کو غیر اسلامی تہذیب و معاشرت کے اثرات سے بچانا ہے۔

ہماری زبان و محاورہ میں جب یہ بتانا ہوتا ہے کہ فلاں عادت، یا یقین، یا خوبی یا کمزوری، دل و دماغ میں پیوست ہوگئی ہے، اور اب وہ نکالی نہیں جاسکتی، تو کہا جاتا ہے کہ ''یہ چیز گھٹی میں پڑی ہوئی ہے'' اور ظاہر ہے کہ یہ گھٹی ماں اور گھر کی شفیق اور مربی بیبیوں کے ذریعہ ہی بچوں کو ابتدائے شعور میں گھر ہی میں دی جاسکتی ہے، ماہرین تعلیم و تربیت اور علمائے نفسیات نے اس حقیقت پر بہت زور دیا ہے کہ بچہ کے ذہن کی سادہ تختی پر جو ابتدائی نقوش پڑ جاتے ہیں، وہ کبھی نہیں مٹتے، خواہ ان کو مٹا ہوا سمجھ لیا جائے، لیکن درحقیقت وہ مٹتے نہیں، دب جاتے ہیں، اور وقت پر ابھرتے ہیں، اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد ماؤں اور بچہ کی تربیت کرنے والیوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، جو اس سادہ تختی پر آسانی کے ساتھ اچھے سے اچھے نقش بنا سکتی ہیں، اور جن کو کوئی طاقت اور کوئی تعلیم و تربیت آسانی کے ساتھ مٹا نہیں سکتی۔''

اور خواتین کی ذمہ داری

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصّٰئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ٥

(سورۃ الاحزاب : ۳۵)

جو لوگ خدا کے آگے (سر اطاعت خم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور مومن مرد اور مومن عورتیں، اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں، اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، اور خیرات

[redacted]

کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزے رکھنے
والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور پاک دامن مرد اور پاک
دامن عورتیں، اور خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت
سے یاد کرنے والی، عورتیں کچھ شک نہیں کہ ان کے لئے خدا نے
بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں دو اہم محاذ کا ذکر کیا ہے، لیکن ہر مرتبہ وہ تذکیر وتانیث کے الگ الگ صیغوں میں مردوں اور عورتوں کا ذکر فرماتا ہے، اور ان کی ایک ایک صفت کا ذکر کرتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو اپنی بندیوں سے کتنی محبت ہے، اور ان کے لئے ہر عمدہ صفت اور کمال میں ترقی و امتیاز حاصل کرنے کا کتنا امکان اور وسیع میدان ہے، اس سے اسکا بھی اشارہ ملتا ہے (اور مذاہب واخلاقیات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس کی تصدیق کریں گے) کہ بہت سے قدیم مذاہب اور نظامہائے اخلاق میں طبقۂ نسواں کو بہت سے اخلاقی فرائض اور کمالات سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ اس کے لئے عیب نہ تھا، اعمال کی یہ طویل فہرست اس لئے بیان کی تاکہ معلوم ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جس طرح اپنے بندوں پر شفقت کرتا ہے، اسی طرح اپنی بندیوں پر شفقت کرتا ہے، اس کی صفت ربوبیت اور اس کی صفت رحمت مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے عام اور ان پر سایہ فگن ہے، اس کا پورا امکان تھا کہ ایمان ویقین، عبادت واطاعت، صداقت وخلوص، صبر وایثار، خوف وخشیت، صدقہ و خیرات اور پاک بازی اور پاک دامنی کے میدان میں پوری اجارہ داری مردوں کی ہو جائے، اس لئے کہ یہ اوصاف وخصوصیات، بلکہ کمالات وامتیازات، بڑی ہمت و عزم اور قربانی وایثار کے طالب ہیں، اور مذاہب واخلاق اور علم وتمدن کی تاریخ میں زیادہ تر بلکہ تمام تر مردوں ہی کے نام آتے ہیں، پھر عورتوں کی بہت سی ایسی صنفی ذمہ

داریاں اور فرائض ہیں جن سے مرد آزاد ہیں، مثلاً خانہ داری کی ذمہ داریاں، اولاد کی پرورش، ان کی غذا اور پوشاک، ان کی دیکھ بھال اور تیمارداری۔

کم سے کم ولایت کے سلسلہ میں بالکل امکان تھا کہ ہم صدہا بلکہ ہزاروں اولیاء اللہ سے واقف ہوتے، اور اس سلسلہ میں ایک خاتون کا نام بھی نہ سنا ہوتا، لیکن اس نورانی فہرست میں بھی حضرت رابعہ بصریہ کا نام درخشاں اور تاباں نظر آتا ہے، اور ان کا نام اب بھی زندہ ہے، کتنی بچیوں کا نام تبرکاً یہی رکھا جاتا ہے، سوانح اور سیر کی تاریخوں اور تصوف وسلوک کی کتابوں میں ان کی عبادت ولایت وکرامات، اور مقبولیت وعظمت کے واقعات درج ہیں، اسی طرح صدہا مقبولین بارگاہ الٰہی، اور پیشوایان طریقت وسلوک کی روحانی تربیت وترقی میں ان کی ماؤں کا بنیادی حصہ ہے، اور انہوں نے خود اس کا اظہار واعتراف کیا ہے، ان سب کا نام لینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، نمونہ کے طور پر ہم عالم اسلام کے سب سے مشہور ومقبول بزرگ پیران پیر سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا اور ہندوستان کے مشہور ومقبول بزرگ محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا نام لیتے ہیں، ان کے تذکرے، حالات وسوانح کی کتابیں پڑھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی ماؤں کی تربیت اور اپنے بچپن میں اپنے گھر کی فضا اور ماحول کا کتنی اہمیت اور ممنونیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، اور اس کے احسان منداور شکر گزار نظر آتے ہیں۔

علمی کمالات اور علم کی خدمت واشاعت کے سلسلہ میں مجھے افسوس ہے کہ فضلائے امت کی تو سیکڑوں تاریخیں ہیں، لیکن فاضلات امت کی تاریخ بہت کم لکھی گئی ہے، لیکن پھر بھی تذکرہ نویسوں نے خواتین کو بالکل نظر انداز نہیں کیا، دینی علوم وادبی کمالات کے سلسلہ میں ان کے نام آتے ہیں، علمی ذوق وشوق اور شغف کی کامیابی اور علمی جدوجہد کی یہاں صرف ایک ایسی روشن مثال پیش کی جاتی ہے، جس

سے اچھے خاصے واقف آدمی پر بھی ایک عالم تحیر چھا جاتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کے بعد اسلام کے پورے کتب خانہ اور اس کے پورے علمی ذخیرہ میں کس کتاب کا درجہ ہے؟ یہ صحیح بخاری ہے جس کو "اصح کتاب بعد کتاب اللہ" کا لقب دیا گیا ہے۔ وہ ہر مدرسہ اور دار العلوم کے لئے معیار فضیلت ہے، ختم بخاری کی تقریب بڑے سے بڑے دار العلوم کے لئے قابل فخر اور قابل شکر تقریب ہوتی ہے، اور اس جامعہ میں بھی اس کے ختم کی تقریب منائی گئی ہے، آپ کے علم میں ہے کہ وہ بخاری شریف ہندوستان میں اکثر علمی مرکزوں میں کس کی روایت سے پہنچی ہے، اور فضلائے مدارس کو اس کی سند دی جاتی ہے؟ یہ ایک فاضلہ خاتون کریمہ کی روایت ہے، ایک معتبر تذکرہ کی کتاب میں ان کا تعارف ان الفاظ میں آیا ہے:-

کریمة بنت احمد بن محمد المروذية محدثة كانت تروی صحيح البخاری، قال ابن الاثير انتهى اليها علو الاسناد للصحيح، عاشت تقريبا مأة سنة أصلها من مرو الروذ ووفاتها بمكة، ويقال لها ام الكرام، وبنت الكرام۔ (الأعلام للزركلی جلد ٦)

"کریمہ دختر احمد بن محمد مرو الروذ کی رہنے والی محدث خاتون ہیں، جو صحیح بخاری کی خاص راویہ ہیں، مؤرخ ابن الاثیر کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کی سب سے اونچی سند انہیں کے ذریعہ سے ہے، تقریبا سو سال کی عمر پائی، مرو الروذ کی رہنے والی تھیں، انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا، ام الکرام اور بنت الکرام کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں۔"

اب ادب کے میدان کو لیجئے ولادة بنت المستکفی ، اندلس (اسپین) کے حکام میں سے ایک سر برآوردہ شخصیت کی صاحبزادی تھیں، ان کا ادبی ذوق، سخن فہمی، اور بالغ نظری مسلّم اور ان کا نام اس سلسلہ میں تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں روشن ہے، ان کا ادبی اور شعری دربار ایسا منعقد ہوتا تھا، جیسے بادشاہوں کے دربار منعقد ہوتے تھے، بڑے بڑے ادباء ان کے پاس استفادہ کے لئے آتے تھے۔(۱)

جہاں تک ہمت و عزیمت، ایثار و قربانی، اور جذبۂ جہاد کا تعلق ہے اس کی ایک مثال دینی کافی ہے، جس کی نظیر اسلام ہی نہیں، دنیا کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، حضرت خنساءؓ عربی زبان کی مسلّم اور مستند اور غیر فانی شہرت کی مالک شاعرہ ہیں، ان کے دو بھائیوں کا انتقال ہو گیا تھا، ان کے لئے انھوں نے ایسے دل دوز مرثیے کہے کہ ان کی نظیر عربی مرثیوں ہی میں نہیں، دنیا کی دوسری زبانوں کے مرثیوں کے ذخیرہ میں بھی ملنا مشکل ہے، یہ واقعہ ان کے اسلام لانے سے پہلے کا ہے، یہی حضرت خنساء رضی اللہ عنہا جب اسلام لائیں تو اسلام نے ان کی نفسیات میں عظیم انقلاب برپا کر دیا، جس اللہ کی بندی نے اپنے بھائیوں پر رونا اپنا شعار و معمول بنالیا تھا، اور ان کی شاعری اسی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی، سب کو معلوم ہے (خاص طور پر ہماری بہنوں اور محترم خواتین کو) کہ بھائی اور بیٹے میں کیا فرق ہوتا ہے، بھائی سے ہزار محبت ہو، بیٹا لختِ جگر اور نورِ نظر ہوتا ہے، اور جان سے زیادہ پیارا، انہیں خنساءؓ نے جہاد کے ایک موقع پر اپنے بیٹوں کو بلایا، ایک ایک کو رخصت کیا اور کہا، بیٹا! میں نے اسی دن کے لئے تم کو دودھ پلایا تھا، اللہ کے راستہ میں جاؤ اور ہم کو سرخ رو کرو، اس کے بعد ایک ایک کی شہادت کی خبر سنتی رہیں، جب آخری بیٹے کی شہادت کی خبر سنی تو ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔

(۱) الأعلام للزرکلی جلد ۹ ص ۱۳۵-۱۳۶

الحمد لله الذی اکرمنی بشهادتهم

(کتب رجال وتاریخ)

''اس خدا کا شکر ہے جس نے ان کی شہادت کی عزت ونسبت سے مجھے سرفراز فرمایا۔''

ان اوصاف اور کمالات کے علاوہ دو ایسے میدان ہیں، جن میں خواتین کو سبقت حاصل ہے، اور وہ ان میدانوں میں جو کارنامہ انجام دے سکتی، اور اس کے ذریعہ سے امت اسلامیہ کا صرف نسلی تسلسل ہی نہیں اعتقادی، اخلاقی، ذہنی اور تہذیبی تسلسل کے قائم رہنے میں بنیادی کردار ادا کر سکتی ہیں، وہ انہیں کا حصہ ہے اور ہر دور میں ان کے نہ صرف تعاون بلکہ اس کی ذمہ داری قبول کرنے اور اس کو سرانجام دینے کے بغیر یہ معنوی تسلسل (جو اس امت کی اصل قیمت اور اس کی ضرورت وافادیت کا ثبوت ہے) قائم نہیں رہ سکتا۔

یہ دو میدان ہیں، ایک نئی نسل کی دینی تعلیم وتربیت کا ابتدائی کام، اور اس کے قلب وذہن پر اسلام کا نقش قائم کرنا اور اس کو عمیق ومستحکم بنانا، دوسرے اسلامی تہذیب ومعاشرت کی حفاظت اور نئی نسل کو غیر اسلامی تہذیب ومعاشرت کے اثرات سے بچانا ہے۔

ہماری زبان ومحاورہ میں جب یہ بتانا ہوتا ہے کہ فلاں عادت، یا یقین، یا خوبی یا کمزوری، دل ودماغ میں پیوست ہوگئی ہے، اور اب وہ نکالی نہیں جا سکتی، تو کہا جاتا ہے کہ ''یہ چیز گھٹی میں پڑی ہوئی ہے'' اور ظاہر ہے کہ یہ گھٹی ماں اور گھر کی شفیق اور مربی بیبیوں کے ذریعہ ہی بچوں کو ابتدائے شعور میں گھر ہی میں دی جا سکتی ہے، ماہرین تعلیم وتربیت اور علمائے نفسیات نے اس حقیقت پر بہت زور دیا ہے کہ بچہ کے ذہن کی سادہ تختی پر جو ابتدائی نقوش پڑ جاتے ہیں، وہ کبھی نہیں مٹتے، اور خواہ ان کو

مٹا ہوا سمجھ لیا جائے، لیکن درحقیقت وہ مٹتے نہیں، دب جاتے ہیں، اور وقت پر ابھرتے ہیں، اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد ماؤں اور بچہ کی تربیت کرنے والیوں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، جو اس سادہ تختی پر آسانی کے ساتھ اچھے سے اچھے نقش بنا سکتی ہیں، اور جن کو کوئی طاقت اور کوئی تعلیم و تربیت آسانی کے ساتھ مٹا نہیں سکتی۔

ماؤں اور پرورش کرنے والی خواتین اور گھر کی ان بیبیوں کا جو رشتہ میں بزرگ اور گھر کے ماحول میں اثر انداز اور قابل احترام ہوتی ہیں، اتنا ہی فرض اور ذمہ داری نہیں کہ وہ بچوں کو اللہ اور رسول کا نام سکھا دیں، کلمہ یاد کرا دیں، اور جب وقت آئے تو نماز پڑھنا سکھا دیں، یہاں تک کہ قرآن شریف پڑھنا بھی ان کو آجائے، اور اردو پڑھنے کے قابل بھی ہو جائیں، ہندی زبان اور رسم الخط کی اس فرماں روائی کے دور میں جب لاکھوں مسلمان بچے اور بچیاں اردو کی ایک سطر پڑھنے اور اپنا نام تک لکھنے کے قابل نہیں ہوتیں، بلکہ اپنا نام زبانی بھی لینے اور بتانے کی ان میں صلاحیت نہیں ہوتی، جس کی درجنوں مثالیں، انٹرویو کی مجلسوں، اسکولوں میں داخلے اور ملازمت کی درخواست دینے کے موقع پر سامنے آچکی ہیں، جو زیادہ تر گھروں کے اندر اردو لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہونے اور اسلامی تاریخ، انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرامؓ، ازوج مطہراتؓ، اہل بیتؓ، اور پیشوایان اسلام کے ناموں تک سے واقف کرانے کے کام سے غفلت اور سستی کا نتیجہ ہے۔

اس ضروری کام کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان بچوں کو کفر و شرک سے نفرت، توحید سے محبت، اس پر فخر، اسلامی نسبت اور مسلمان ہونے اور کہلانے پر مسرت و عزت کا احساس، دین کی حمیت و غیرت، خدا کی نافرمانی، اور خدا کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق، اور شیدائیت کی حد تک محبت، گناہوں سے نفرت اور گھن، دنیاوی ترقی ہی کو زندگی کا مقصد اور کامیابی اور عروج کی دلیل سمجھنے سے

حفاظت، راست بازی، اور راست گوئی کی عادت، خدمت وایثار کا شوق، خدمت خلق اور وطن دوستی کا جذبہ پیدا کرنا بھی ان کی ذمہ داری اور انہیں کے کرنے کا کام ہے، اور اگر یہ کام بچپن میں اور گھروں کے اندر نہیں ہوا، تو دنیا کی بڑی سے بڑی دانش گاہ، اور سرکاری یا عالمی پیمانہ پر کوئی تربیت گاہ نہیں کرسکتی، اور اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

یہ بھی صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ جب تک مسلمان بچوں کو بت پرستی اور کفر و شرک سے خواہ وہ کسی بیرونی وملکی دیومالا (Mythology) اور نصاب تعلیم (Text Books) کے ذریعہ سے ہو، یا ریڈیو، ٹی، وی یا لکچروں کے ذریعہ سے ہو یا خود مسلمانوں کے دین سے ناواقفیت اور دنیادار اور پیشہ ور گروہوں کے اثر سے ہو، اس طرح نفرت اور گھن نہ پیدا ہو، جیسی گندی اور بدبودار چیزوں سے ہوتی ہے، تو ان کے ایمان کی حفاظت نہیں ہوسکتی، اور ان کے صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، یہ تربیت، محبت ونفرت جو طبیعت کا خاصہ اور حواس خمسہ کے ساتھ ایک نیا حاسہ بن جائے، مسلمان گھرانوں کی میراث، اور مسلمان نسلوں کے اعتقادی ومعنوی تسلسل کا راز رہا ہے، اور جب تک یہ کام گھروں میں اور ماؤں اور گھر کی بڑی بہنوں اور بزرگ خواتین کے ذریعہ انجام نہیں پائے گا، بڑے سے بڑے پراثر مواعظ، مؤثر سے مؤثر دینی کتابیں اور مدارس دینیہ عربیہ کے لائق ترین اساتذہ کے ذریعہ بھی اس میں کامیابی حاصل ہونی مشکل ہے۔

دوسرا میدان جس میں خواتین کو امتیاز اور قیادت ورہنمائی کا شرف حاصل ہے، وہ اسلام کے تہذیبی ومعاشرتی امتیاز کا باقی رکھنا، اس کا تسلسل و دوام اور غیر اسلامی تہذیبوں اور طرز معاشرت سے حفاظت کا مسئلہ ہے، اس کے لئے قدرے تفصیل اور قدیم اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

اسلام کو بالکل ابتداء ہی میں ایک ایسے انوکھے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا، جس سے تاریخ میں شاید کسی مذہب کو اس درجہ میں واسطہ نہیں پڑا، جزیرۃ العرب سے نکلنے والے عرب مسلمانوں کو دو ایسے ترقی یافتہ تمدنوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے بڑھ کر کسی دوسرے تمدن کا تجربہ، انسانی وتہذیبی تاریخ میں عرصہ سے نہیں کیا گیا تھا، یہ دو تمدن رومی و ایرانی تمدن تھے، جو تہذیب، آرٹ، انسانی زندگی کو سنوارنے اور اس کو منظّم کرنے، راحت وآسائش کے سامان کی فراہمی اور فراوانی میں کئی منزلیں طے کر چکے تھے، اور ترقی کے آخری درجہ تک پہنچ گئے تھے، یہ تمدن اپنی تراش خراش میں بڑی رعنائی رکھتے تھے، اور بڑے دل فریب تھے، آلات و وسائل، راحت ودلچسپی کے سامان، زندگی گذارنے کے بلند معیار، خانہ داری کے ترقی یافتہ طور وطریق اور لباس، خوراک، اور گھروں کی زینت وآرائش کے آلات و وسائل سے ان کا تمدن مالا مال تھا۔

اس کے برخلاف عرب اپنے ابتدائی دور میں یا صحیح الفاظ میں تہذیبی طفولیت کے دور میں تھے، درحقیقت یہ تجربہ جس سے ابتدائی مسلمانوں کو گذرنا پڑا، بڑا نازک تجربہ تھا، اسلام یقیناً آسمانی تعلیمات، عقائد اور اخلاق عالیہ، اور آداب حسنہ سے آراستہ تھا، لیکن تہذیب ومعاشرہ کی قیادت کی باگ ڈور اس وقت رومیوں اور ایرانیوں کے ہاتھ میں تھی، اس لئے اس کا امکان تھا، اور سارے قرائن بتا رہے تھے کہ یہ عرب اور مسلمان جنھوں نے ایک تنگ وتاریک ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں اور جن کے پاس بہت محدود وسائل تھے، جن کی زمین دولت کے سرچشموں سے خالی ہے، ان کی زندگی خیموں اور خام ونیم خام مکانات میں گذری ہے، اور ایک طرح سے ''خانہ بدوشانہ'' زندگی کہی جاسکتی ہے، تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ جب پہلی مرتبہ عرب مجاہدین ومبلغین نے (ایرانی فتوحات کے زمانہ میں) کھانے

میں چپاتیاں دیکھیں تو سمجھے کہ یہ ہاتھ پونچھنے کے لئے دستی رمال ہیں، کھانے کے بعد ہاتھ پونچھنے کے لئے جب انہوں نے ان باریک چپاتیوں کو اٹھایا تو معلوم ہوا کہ یہ تو روٹی ہے، اسی طرح جب ان کو پہلی مرتبہ کافور سے سابقہ پڑا تو وہ سمجھے کہ یہ نمک ہے، اور بعض اوقات انھوں نے اس کو آٹے کے ساتھ گوندھ دیا۔(۱)

غرض یہ کہ جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو ان بادیہ نشینوں کو ایک ایسے ترقی یافتہ اور دل کش تمدن سے سابقہ پڑا جس کو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے اس کا پورا امکان ہی نہیں، بلکہ اس کے سب قرائن موجود تھے کہ وہ اس تمدن پر دیوانہ وار اور پروانہ وار گرتے، اور اس کی ہر خو کو اختیار کرتے اور اس پر فخر کرتے، ان کے تمدن و معاشرت، روزمرہ کی زندگی، اور خوراک و پوشاک کا معیار اتنا اونچا ہو جاتا کہ اس کے حصول کے لئے ان کو حدود شریعت ہی نہیں، اپنے عرف و رواج کے حدود سے بھی تجاوز کرنا پڑتا، وہ اس سب کو ایک فیشن، ترقی پسندی، بلکہ بیداری اور حقیقت پسندی کی علامت کے طور پر اختیار کرتے اور اس سے وہ سب خرابیاں پیدا ہوتیں، جو مادہ پرست، دنیادار، اور تمدن و ترقی کی وبا زدہ اقوام و ممالک میں پیدا ہوتی رہی ہیں، اور تاریخ میں اس کی صدہا مثالیں ملتی ہیں، اس کے تصور کے لئے ان مشرقی ممالک و اقوام کا نقشہ اور ان کا طرز عمل دیکھ لینا کافی ہے، جو مغربی تمدن و ترقی کی نقالی کا شکار ہوئیں، اور ان کی خوشہ چیں بن گئیں، اور انھوں نے دینی تعلیمات و احکام، حدود شریعت اور اپنی قدیم تہذیبی روایات سے یکسر آنکھیں بند کر لیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس مشکل پر مردوں اور عورتوں کے باہمی تعاون سے قابو پایا، اس میں بہت بڑا دخل مسلمان خواتین کے ایمان و یقین، قناعت و ایثار، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے، اور صحابیات و گذشتہ صاحب ایمان و صلاح

مستورات کا نمونہ سامنے رکھنے کا نتیجہ تھا، مرد رومی وایرانی تمدن کی نقالی اور اس کے ترقی یافتہ طور وطریق، طرز معاشرت، اور زیب و زینت کے آلات ووسائل کے اختیار کرنے سے کتنے ہی روکنے کی کوشش کرتے، اور کتنی ہی مؤثر اور بلیغ تقریریں کی جاتیں اسلامی معاشرہ (Society) رومی وایرانی تمدن اور طرز معاشرت اور اس کی نقالی سے بچ نہیں سکتا تھا، علماء وواعظین، حکام وسلاطین، اخلاقی احتساب کرنے والے ذمہ دار، فوجی کمانڈر اور افسران بھی اسلامی معاشرہ، اسلامی شخصیت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے، ان خواتین کا اسلامی تشخص کی حفاظت ہی نہیں، بلکہ اسلامی وجود کے بقا میں بھی بڑا حصہ ہے۔

اب بھی اگر کوئی طاقت مغربی تہذیب کی نقالی اور یہی نہیں بلکہ نئی ابھرنے والی، اور تیزی سے پھیلنے والی ہندو تہذیب کے مسلم معاشرہ میں رائج اور مقبول ہونے سے بچا سکتی ہے، جو (ایک خاص دیومالائی نظام رکھنے اور اسلامی بنیادی عقائد سے متصادم ہونے کی بنا پر) زیادہ خطرناک ہے، تو وہ ہماری ان بہنوں اور مسلمان خواتین کی صحیح دینی تعلیم، ایمانی و دینی تربیت، اور اسلامی اخلاق وسیرت کو دوسرے قوموں کے اخلاق وسیرت پر ترجیح دینے ہی سے ممکن ہے۔

یہ حقیقت طبقۂ نسواں میں دینی تعلیم واسلامی تربیت کے انتظام کے ضرورت کی ایک اہم وجہ ومحرک ہے، ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مدارس نسواں اور جامعۃ الصالحات، یا جامعہ نور الاسلام کے ناموں سے جو زنانہ دینی مدارس اور جامعات قائم ہو رہے ہیں، وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک مؤثر، دانش مندانہ اور تعمیری قدم ہے، جس سے تہذیبی ارتداد (اور اس سے بڑھ کر نئی نسل کے اعتقادی انقلاب سے) مسلمانوں کی نئی نسل کو بچایا جا سکتا ہے، اور اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے، اور اگر اس مخلصانہ اور دانش مندانہ کوشش کا

سلسلہ جاری رہا تو اللہ تعالی کی طرف سے نصرت غیبی کی امید بھی کی جاسکتی ہے۔
وصدق اللہ العظیم۔

اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ

(سورۃ محمد : ۷)

"(اے مسلمانوں) اگر تم اللہ کے دین کی نصرت کرو گے، تو اللہ تمہاری نصرت (مدد) فرمائے گا، اور تمہارے قدموں کو جمادے گا۔"

مسلم پرسنل لا بورڈ تاریخ کے آئینے میں

- مارچ ۱۹۷۲ء دار العلوم دیوبند :
مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے سلسلے میں پہلی میٹنگ۔
- ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء ممبئی :
مسلم پرسنل لا بورڈ کا باضابطہ پہلا اجلاس۔
- ۷/۸/اپریل ۱۹۷۳ء حیدرآباد :
مسلم پرسنل لا بورڈ کے دوسرے اجلاس میں بورڈ کی باضابطہ تشکیل، اور مولانا محمد قاری طیب صاحب و مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب بالترتیب پہلے صدر و جنرل سکریٹری منتخب۔
مسلم مطلقہ کے لئے تاحیات یا تا نکاح ثانی سابق شوہر سے نفقہ سے متعلق نیا ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء سے متعلق بورڈ کے وفد نے محترمہ اندرا گاندھی سے ملاقات کی جس سے اس آئین میں کچھ ترمیم کی گئی۔
- جون ۱۹۷۵ء :

مرکزی حکومت کے ذریعہ ایمرجنسی کا نفاذ اور جبری نسبندی مہم۔

- ۱۷/۱۸/اپریل دہلی :

جبری نسبندی کے خلاف بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس۔

- ۱۵/۱۶/اکتوبر ۱۹۷۲ء رانچی :

بورڈ کا تیسرا اجلاس، قاری محمد طیب صاحب دوسری میعاد کے صدر منتخب۔

- ۲۳/مئی ۱۹۷۲ء :

ایوان بالا میں متبنیٰ بل پیش۔

- دسمبر ۱۹۷۲ء تا جولائی ۱۹۷۸ء :

بورڈ کا متبنیٰ بل کے خلاف ملک گیر ایجی ٹیشن

- ۱۹/جولائی ۱۹۷۸ء :

مرکزی حکومت کے برسر اقتدار جنتا پارٹی کے ذریعہ بل کی واپسی۔

- ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء :

- بورڈ کے پہلے صدر قاری محمد طیب صاحب کا انتقال۔

- ۲۸/دسمبر ۱۹۸۳ء چنئی :

- بورڈ کے سالانہ اجلاس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دوسرے صدر منتخب۔

- اکتوبر ۱۹۷۸ء :

الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بینچ نے مساجد و مقابر کو حکومت کے ذریعہ ایکوائر کرنے کا ایک متنازعہ فیصلہ دیا۔

- دسمبر ۱۹۷۸ء :

بورڈ کے جنرل سکریٹری نے اس فیصلہ کے خلاف گشتی مراسلہ کے ذریعہ

مسلمانوں کو اس فیصلہ سے آگاہ اور اس کے خلاف حکومت کو ٹیلی گرام بھیجنے کی اپیل کی، اور متعدد مرتبہ وزیر اعظم سے ملاقاتیں کیں۔

- جنوری ۱۹۸۰ء :

اس احتجاج کے نتیجہ میں جناب رام نریش یادو اور بھیروں سنگھ شیخاوت بالترتیب اتر پردیش و راجستھان کے وزراء اعلیٰ نے جواب دیا کہ اس نوٹس کی اصلاح کی جارہی ہے اور حکومت کا کوئی بھی ارادہ مسجد کو ایکوائر کرنے کا نہیں ہے۔

- ۱۹۸۰ء :

مرکزی حکومت کے وزیر قانون جناب پی شیو شنکر کے ذریعہ متبنیٰ بل دوبارہ ایوان میں پیش کیا گیا لیکن بورڈ کی زبردست مہم کی وجہ سے مجوزہ بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

- اپریل ۱۹۸۰ء :

مرکزی حکومت کے وزیر اوقاف کی آمدنی پر ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی گئی جس کے خلاف جنرل سکریٹری بورڈ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اور جناب یوسف نجم الدین صاحب نے وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور وزیر اعظم نے بروقت کارروائی کرتے ہوئے وزیر مالیات جناب آر وینکٹ رمن سے فون پر رابطہ کیا اور بالآخر وزیر مالیات جناب نارائن دت تیواری کے ذریعہ مسئلہ حل ہوا۔

- ۱۹۸۴ء :

مرکزی حکومت نے ایوان بالا میں ایک بل پیش کیا تھا جس کی رو سے وقف بورڈ کی جمہوری حیثیت ختم ہو جاتی چنانچہ اس کے خلاف فوری طور پر

بورڈ کے ایک وفد نے وزیر قانون جگن ناتھ کوشل سے ملاقات کی، انہوں نے وفد کو یقین دہانی کرائی، باوجود اس کے تین دن کے بعد وہ بل منظور کرالیا گیا۔

- اس بل کے خلاف بورڈ نے صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور بورڈ کی اپیل پر ہزاروں ٹیلی گرام بھجوائے گئے باوجود اس کے صدر جمہوریہ نے بھی اس بل پر دستخط کر دیا لیکن بورڈ کی نمائندگی پر اس کے کئے دفعات کا نفاذ روک لیا گیا۔

- ۲۳/جولائی ۱۹۸۵ء:

سپریم کورٹ نے شاہ بانو مقدمہ کا فیصلہ دیا جو شریعت اسلامی کے خلاف تھا۔

- ۳/جولائی ۱۹۸۵ء:

بورڈ کا ایک وفد وزیر اعظم سے ملا۔

- ۲/فروری ۱۹۸۶ء:

صدر بورڈ مولانا علی میاں ندوی نے وزیر اعظم سے ملاقات کی۔

- ۱۷/فروری ۱۹۸۶ء:

صدر بورڈ مولانا علی میاں ندوی اور جنرل سکریٹری مولانا منت اللہ رحمانی دونوں نے ایک ساتھ اس بل کے سلسلے میں وزیر اعظم سے ملاقات کی۔

- ۱۹/اور ۲۳/اپریل ۱۹۸۶ء:

اسی سلسلہ میں پھر دونوں ذمہ داروں نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور شرعی موقف واضح کیا۔

- ۶/مئی ۱۹۸۶ء:

ایوان نے قانون حقوق مسلم مطلقہ ۱۹۸۶ء پاس کیا، جو بورڈ کی بہت بڑی

کامیابی تھی۔

- **۱۹۸۶ء :**

بابری مسجد کا تالا غلط طریقہ پر کھلوا کر بتوں کی عام پوجا شروع کی گئی۔

- **۳ر دسمبر ۱۹۹۰ء :**

دہلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں بابری مسجد کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی۔

- **نومبر ۱۹۹۱ء :**

مونگیر میں جنرل سکریٹری بورڈ سید مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کا انتقال۔

- **۱۹۹۱ء :**

دہلی میں مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری دوم منتخب ہوئے۔

- **۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء :**

تاریخی بابری مسجد کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا۔

- **۹، ۱۰ر جنوری ۱۹۹۳ء :**

دہلی میں عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں ارکان عاملہ نے اس کی مذمت کی اور اس کے بعد سے ہی بابری مسجد کی بازیابی کے لئے قانونی کارروائی شروع کی جو اب تک چل رہی ہے۔

- **۱۹۹۴ء-۱۹۹۵ء :**

نئے قانون وقت کے سلسلہ میں بورڈ کی جانب سے حکومت سے نمائندگی اور وقف ایکٹ بابت ۱۹۹۵ء کی تدوین۔

- **۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء :**

رائے بریلی صدر بورڈ مولانا علی میاں ندوی کا انتقال۔

- ۲۳/اپریل ۲۰۰۰ء :
ندوۃ العلماء لکھنو مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب تیسرے صدر منتخب۔

- ۴/اپریل ۲۰۰۲ء :
اپولو ہاسپٹل دہلی میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا انتقال۔

- ۲۲/جون ۲۰۰۲ء :
حیدرآباد، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی چوتھے صدر منتخب۔

اغراض ومقاصد

آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ

ہندوستان میں ''مسلم پرسنل لا'' کے تحفظ اور شریعت ایکٹ کے نفاذ کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے موثر تدابیر اختیار کرنا۔ بالواسطہ، بلاواسطہ یا متوازی قانون سازی جس سے قانون شریعت میں مداخلت ہوتی ہو، عام ازیں کہ وہ قوانین پارلیمنٹ یا ریاستی مجلس قانون ساز میں وضع کئے جاچکے ہوں یا آئندہ وضع کئے جانے والے ہوں یا اس طرح کے عدالتی فیصلے جو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا ذریعہ بنتے ہوں انہیں ختم کرانے یا مسلمانوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی جدوجہد کرنا۔

مسلمانوں کو عائلی ومعاشرتی زندگی کے بارے میں شرعی احکام وآداب، حقوق وفرائض اور اختیارات وحدود سے واقف کرانا اور ان سلسلہ میں ضروری لٹریچر کی اشاعت کرنا۔

شریعت اسلامی کے عائلی قوانین کی اشاعت اور مسلمانوں پر ان کے نفاذ کے لئے ہمہ گیر خاکہ تیار کرنا۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی تحریک کے لئے بوقت ضرورت ''مجلس عمل'' بنانا جس کے ذریعہ بورڈ کے فیصلہ درآمد کرنے کی خاطر پورے ملک میں جدو جہد منظم کی جاسکے۔

علماء اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک مستقل کمیٹی کے ذریعہ مرکزی یا ریاستی حکومتوں یا دوسرے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ذریعہ نافذ کردہ قوانین اور گشتی احکام (Circulars) یا ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں پیش کئے جانے والے مسودات قانون (بل) کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیتے رہنا کہ ان کا مسلم پرسنل لا پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مسلمانوں کے تمام فقہی مسلکوں اور فرقوں کے مابین خیر سگالی، اخوت اور باہمی اشتراک وتعاون کے جذبات کی نشو ونما کرنا، اور ''مسلم پرسنل لا'' کی بقا و تحفظ کے مشترکہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے درمیان رابطہ اور اتحاد و اتفاق کو پروان چڑھانا۔

ہندوستان میں نافذ ''محمڈن لا'' کا شریعت اسلامی کی روشنی میں جائزہ لینا اور نئے مسائل کے پیش نظر مسلمانوں کے مختلف فقہی مسالک کے تحقیقی مطالعہ کا اہتمام کرنا اور شریعت اسلامی کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے کتاب وسنت کی اساس پر ماہرین شریعت اور فقہ اسلامی کی رہنمائی میں پیش آمدہ مسائل کا مناسب حل تلاش کرنا۔

بورڈ کے مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے وفود کو ترتیب دینا، Study Teams تشکیل دینا، سیمینار، سمپوزیم، خطابات، اجتماعات، دوروں اور کانفرنسوں کا انتظام کرنا، نیز ضروری لٹریچر کی اشاعت اور بوقت ضرورت اخبارات و رسائل اور خبر ناموں وغیرہ کا اجراء اور اغراض و مقاصد کے لئے دیگر ضروری امور انجام دینا۔